

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرف کا پہلا مہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر ۱۹۸۱ء



کہنی سننی
ہمارے نام

حیمہ بانو

نادرہ خاتون

۱۲

۱۳

اس درد کا کوئی نام نہیں

اللہ معافی

شبِ نیمِ گلابِ اجلے موسم

محبت آشنا

وہم

ننتے چہراغ

نابید نذر

طاہرہ حبیب

بانو اختر شہزاد

افسر سلطانہ

عطیہ پروین

کنول راہی

۱۱۷

۱۳۳

۱۳۸

۱۴۵

۱۵۴

۱۶۱

آپ سے کیا پرسدہ

رونے گانے اور چاند پر جانے کا

نیا سلسلہ

مجھے رسک آنے کی ہے

امت النبوت

انٹرویو

نثار زہیری اور راشدہ زہیری
سے ملاقات

سائرہ محمد

۱۸

۲۱

سچی کہانیاں

سمندر اور ساحل

بہی عسروچ

میں کبھی نہ بھولونگی

دیتے ہیں دھوکہ

ساجدہ حبیب وائی

۱۷۴

۲۰۱

حمیتہ بانو نے جاوید پریس سے چھپوا کر شائع کیا

ناول

حیمہ بانو

والدہ افضال علی

۱۶۳

۱۶۶

فُشیاں
گوڈر کالال

افسانے

شکیلہ رفیق

ابن غنزل

اختر جمال

رہیہ فرحت

پروین اسفندی

ساجدہ حبیب

اقبال بانو

۵۸

۳۵

۶۷

۷۳

۸۰

۹۸

۱۱۱

جب سپنے ٹوٹے

راہ گزرتے رہے

صد مہ یک جنبش لب

دشترت نے خواب کے رنگ

شامِ ہجر کی مٹیوں

ٹھنڈی آنکھیں

پھول کا زہر



نوا تین کی ڈائری

۲۱۰

امت العصور

میری ڈائری سے

میری بیاض سے

۲۱۳

بقیس پوٹ

آپ کی بیاض انتخاب

نوا تین کی محفل

۲۱۴

پرنس نام

آپ کے سوال

خاتون کا دسترخوان

۲۱۶

بقیس پوٹ

پکوان

گھریلو علاج

۲۲۰

ادارہ

موسم کھل و ران کے فائدے

نفسیتا

۲۲۲

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں
اور عدنان کے شورے

بیوٹی بکس

۲۲۵

قیصر لودی

بیوٹی بکس کے شورے

شہناز فیض

جہنیر

۲۰۲

نظمیں غزلیں

۲۰۳

کشور مابینہ

ناگزیر

۲۰۳

زہرا نگاہ

یہ ادا سی یہ پھیلتے سائے

۲۰۳

فاطمہ حسن

چھپا ہوا میرا ہر اضطراب

۲۰۳

شائستہ ظفر

آؤ نا آج ہم بھی

رنگارنگ ٹیبل

۲۰۵

ہفتہ نمود

ایک رنگارنگ سلسلہ





ہجرت آپ کی خدمت میں قومی کے شمارے کے ساتھ حاضر ہیں۔ اکتوبر کا شمارہ "افسانہ نمبر" تھا۔ جسے پہنوں نے بے حد پسند کیا۔ بہت سی کہنوں نے ہمیں کہیں خطوط لکھے۔ آپ کے خطوط پڑھ کر ہمیں بے حد مسرت ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ آپ لوگ صرف تفریق نہ لکھنا کریں اور اپنی رائے تفصیلاً عیاں کریں کہ آپ کو کونسی چیز زیادہ پسند آئی اور کونسی چیز پسند نہیں ہے۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کا اپنا پرچہ ہے آپ اس کے لئے تجویز اور شورے بھیجیں ہم آپ کے شعروں کی روشنی میں اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے، کرتے رہیں گے انشاء اللہ۔

ناول

ناول "فریال" کی انگریزی جو قسط دی جا رہی ہے ناول نے اس ماہ ایک نیا دیریا بنے آپ لکھیں کہ آپ کو ناول کیسے لگ رہا ہے۔ مختصر ماہ نیا ناول شروع کیا تھا بہت کم کہنوں نے اسے متعلق لکھا ہے ناول کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیں۔

انٹرویو

خواتین ڈائجسٹ میں انٹرویو کے سلسلے میں ہمیں یوم ریڈیو نے تجویز پیش کی ہے کہ جس شخصیت کا انٹرویو لینا ہو پہنوں کو ایک ماہ پہلے بتادیں اور ان سے کہیں کہ جو سوال کرنا چاہیں کریں گوڈمیر کے شمارے میں جس شخصیت کا انٹرویو کرنا ہے ان کا نام دے رہے ہیں۔ یہ ہیں مشہور شاعر، ادیب اور صوفی شفیق عقیل صاحب

جو پہنچ ان سے سوال کرنا چاہیں، میں ۱۲ مئی تک بمبھادیوں اور آپ لوگ بتائیں کہ آپ کو یہ تبدیلی کیسی لگی؟

گرن کتاب مکرانے

مکرانے آج کل ہمارے ہاں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس کے خوبصورت ڈیزائنوں سے طرح طرح کی آرائشی اور کامد چوبیزیں بنائی جا رہی ہیں ہماری بہت سی بہنیں اس کے بنانے کے طریقے سے واقف نہیں ہیں پہنوں کو گھر بیٹھے مکرانے دکھانے کے لئے گرن کے قومی کے شمارے کیساتھ "گرن کتاب"

"مکرانے" مفت دی جا رہی ہے۔

گرن کا شمارہ آج ہی شریں ہیں تاکہ اس خوبصورت اور کامد کتاب سے محروم نہ رہ جائیں۔

حمیدہ بانو



شہناز بیٹ۔ کراچی

بھی واضح ہے۔ سواری کی تشبیہ دوں اس میں بھی تمثیل ہے۔ ستارہ بھی کہہ نہیں سکتی اس کی جگہ بھی دھنکی ہے۔ یہ ستارہ صدیوں تک ہمارے دلوں کو اپنی خوبصورتی کا احساس دلاتا رہے گا۔ بیادیں اور سوز و غم کی تصویریں۔ رنگ رنگی انڈورناتوں اور پھولوں کی دلچسپ ترتیب اور تحریروں کے ٹکڑے انداز غالباً کسی رسالے کی زینت نہیں بنے۔ اس دفتر تمام کے تمام انسانے خوب سے خوب تر تھے۔ مگر بشری رحمن کا دور بہارنگ، ریگانہ زیدی کا، دھواں کہاں سے اٹھتا ہے۔ ہنار خان کا، آری جانکی کرن، ذکیہ بلگرامی کا، کم گشتہ خواجوں کی پریسیاں، "نیکہ رفیق" کی شکست کا رنگ، "نئے ہماری پڑھیں لڑکیاں" ویتھریڈ کی ایوارڈ اسٹے نام کو فلیس، حمیدہ یالو کا، قریب ایجا جبار ہے اور والدہ انصاف علی کا، گوڈر کالال، "ناول نادر و نایاب" ہی نکلا ہے حد پسند آیا۔ اہل انشاء کا کام سنے ہم کو کتنا کر دیا۔ بڑی چینی تحریروں کی والدہ مزہ آگیا۔

مہوش ناز باوانی۔ کراچی

پیاری نادرہ آپ! آداب! اس ماہ کا ہفتامہ یعنی اکتوبر کا اشعار نمبر بڑھ کر بہت ہی اچھا لگا خاص کر ناولٹ، آسمان سے آیا فرشتہ، جس کی مصنفہ خدرا بانو عرشی نے اس ناولٹ میں جو کردار لکھے اور چمنہ کا پیش کیا۔ دونوں کردار اس ناولٹ کی جان تھے۔ اس کے بعد مجھے کو جو ناول اور ان کے پسند آئے اس کے لئے الفاظ نہیں۔ عرق ہر جگہ میں آتا ہی تا فریبہ کہ ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے کو بھی جاتا ہے اس ماہ کی ایک اور خاص بات جو ہے وہ والدہ انصاف علی کا ناول، "گوڈر کالال" واقعی ایک نادر و نایاب ناول ہے بلکہ مقصد ہی اور اصلاحی بھی ہے۔

یامین نقوی۔ فیصل آباد

نادرہ آپ! نگاہیں عقیدت! سچا توین کا بکٹ کا تازہ شمارہ پڑھا۔ بیشک کی طرح خوبصورت اور دلکش سوز و غم بہت پسند آیا تمام ہی اس نے عمدہ تھے۔ ہاں البتہ جس انسانے نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ بشری رحمن کا، بہارنگ، ویتھا۔ اس انسانے کی جتنی بھی تحریروں کی جانے کم ہے۔ مگر بال، نہایت دلچسپ

سوٹ نادرہ آپ! آداب! ماہ اکتوبر کا نوآئین ڈائجسٹ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام انسانے خوبصورت تھے۔ رضیہ بیچ احمد کا انٹرویو بہت پسند کیا۔ ناول، فریال، پڑھ کر اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ انساؤں میں بیگارنگ، اجالوں کی بارات، بہاروں کی دستک، دور دنیا میں نیلے حد پسند آئے۔

راشدہ انتظار۔ اسلام آباد

ڈیئر نادرہ آپ! آداب! بہت عرصے سے خواب میں اس خوبصورت رسالے کی قاری ہوں۔ پہلے بھی ٹی خط لکھے۔ لیکن شاید ملے نہ ہوں۔ اس مرتبہ کاؤنا نہ پڑھ دیکھتے ہی جی باک ایک مرتبہ پھر کوشش کی جائے اشعار کے کلام تو اس رسالے کی جان ہیں۔ حمیدہ یالو کا ناول، فریال، بہت خوب جابا ہے۔ گوڈر کالال، کی پہلی قسط پڑھی ابھی مجھے کہا نہیں جاسکتا۔ ناولٹ، آسمان سے فرشتہ آیا، بہت ہی اچھی تحریروں جس کے لئے خدرا بانو عرشی مبارک بادی لکھتی ہیں۔ انسانے سب ہی بہت خوب تھے۔ خاص کر بہارنگ، شکست کا رنگ، "بیچتے محلوں کا المیہ"، اجالوں کی بارات، بہت ہی بہترین تھے۔

ریسیہ سحر دشا۔ حیدرآباد

پیاری نادرہ آپ! سلام عقیدت! نوآئین ڈائجسٹ کا شمارہ پڑھا۔ آپ ہماری خواہشوں کا کتنا احترام کرتی ہیں۔ ناولٹ، آسمان سے آیا فرشتہ، بہت پسند کیا۔ انسانے بہاروں کی دستک، "شانے گونگے ہیں"، اجالوں کی بارات، "بے حد پسند آئے، قریال، "کی جوتی قسط کا انتظار ہے۔ خدا نوآئین ڈائجسٹ کو اور ترقی دے۔ آمین۔

رخصانہ شاہین۔ روپ، سلاہیوال

ڈیئر نادرہ! جی جان سلامت تاقیامت رہو۔ اس شمارے کی کیا تعریف کروں، چاندیوں، نہیں اس میں

ہوتا جا رہا ہے اس کی ہوتی قسط کا مدت سے انتظار ہے۔
 اس کے علاوہ رفیعہ فیض احمد اور فزوس حیدر سے مل کر بھی
 بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی دلکش و دلچسپ افسانوں کے
 ساتھ اچھا سادہ و قچھا نہیں کی اسی طرح۔

شکفته ناز - اسلام آباد

پیشاری نادرہ باجی، اسلام علیہ السلام
ماہ اکتوبر کا شمارہ طاہرہ نقوی کی انصوریہ کے ساتھ ملا پسند کیا۔
ابن الشاکر کا کام حسب نمونہ کی شاندار تھا۔ سمجھتے ہیں کہ کام کو قبول
رسلے کی جان تھا۔ رضیہ فیض احمد سے ملاقات ایچی رہی۔ وہ قابل
کی تیسری قسط اور نوڈر کلال، کی پہلی قسط بہت پسند آئی۔ عذرا کا انصوریہ
کا ناوٹ اچھا تھا۔ انہوں نے تمام ہی قابل توفیق تھے۔ سچی کہانیاں اچھی
بہترین تھیں۔ تمام مستقل سلسلے حسب نمونہ کی شاندار تھے۔ غرض مجموعی طور پر
اکتوبر کا شمارہ نمبر ایک اچھا اور منفرد پیش تھا۔

لغمانہ بٹ، نشانیہ بٹ - وزیر آباد

سوسٹنسی ماورہ پہنا آداب!
 اس بار تو ہمیں خوانین کا بیٹا حضرت کا بڑی ہی شہرت سے انتظار تھا۔
 اور صبح ہو نہیں ملا اور اذان دار اس سے نہجٹ گئیں اور جب اس وقت
 علمبرو ہو گیا تب اس کا ایک ایک لفظ اپنے ذہن میں سمجھ کر چلیں۔
 اب ہمیں یہ بھی نہیں آتا کہ اس کی تفریق کریں تو کون الفاظ میں کیونکہ اس
 بار خوانین کا بیٹا نہ صرف رنگ و سیلاب امڈ رہا ہے، بہر حال
 انسانوں میں ہمیں، بہاروں کی رنگ، شکست کارنگ، بیروانی اور
 آسمان سے آیا فرش، بہت پسند آئے۔ فردوس حیدر صاحب سے
 دھمکے ملنے کے وقت مل کر بہت مسرت ہوئی، مرثیہ فصیح احمد کا
 انشور و لو کو لکھا گیا۔ ابن الشارحی سے کالم پڑھ کر توبہ اختیار ہوئی
 یہ سبھی آسمانی ہے۔

سائبرویشخ۔ کراچی

روبینہ مریم شوروٹ

خواجهن ڈائجسٹ کا مسکرا افسانہ نمبر ملا، بعد کی خوشیوں
میں اضافہ ہو گیا۔ خواتین ڈائجسٹ آج کل کے تمام ماہناموں
میں پہلے نمبر پر ہے۔ بلکہ پچھلے افسانے ہماری دلچسپی کا باعث بن
فریال کی قسط اچھی رہی، نئی ناول بھی خوب لگی، منظر و انداز نے
ہوئے، نئی قسط کا شکر ہے انتظار رہے۔ افسانوں میں شرب
قریبی، بشری رحمن اور عازا بانو عثمی صاحبہ کی تحریروں متاثر
کر گئیں۔ باقی افسانے بھی اپنی اپنی جگہ پر بہترین ہے۔ میری دائری
میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ پرش صاحب اس باصر ف ایچ ہے
ہاں رنگارنگ پھول اپنی ہنس سے سب پرچھاگے، سچائی بھی
پسند آئی۔ فروغ جید صاحبہ سے ملاقات از حد اچھی لگی اور
انشاد کی تعریف کے لئے ہمارے پاس الفاظ نظر نہیں۔

پیارے نادارہ جو سیکو مجھ کو شوق!
 اکثر کرا افسانہ میں ملا۔ لبِ غمی غزلِ ریحانی نہ فیردی، بشری رحمان،
 سحر قریشی کے افسانے بہت پسند آئے اور عذرا بانو عمری کی کانٹا
 ہر سامان سے آفرشتہ، قاتلِ پسند، مگر تعریف سمجھنے کے لئے الفاظ
 تہیں ہیں، اتنا پیارا افسانہ کھچے پیرمی طرف سے عذرا بانو عمری کو مبارکباد
 خدا کرے یہ رسالہ اور ترقی کرے۔ آمین۔

انجم ریسہ۔ سواچی

سوٹ مارہ لہو لہو! رکاوٹ! اکوڑ کا شمارہ بڑھاپے پر حد خوشی ہوئی۔ سرورق بے حد زور و جرات تھا۔ انشاؤں کے کالم کا جواب نہیں۔ افسانوں میں۔ بہاروں کی دشت۔

• اتری جہد کی کرن • بھرگن • بیٹے لموں کا المیہ • احوالوں کی بارات • بہت پسند آئے۔ عذرا بوعنوشی کا ناولٹ، آسمان سے آیا فرشتہ • بہت خوب تھا، اور آپ نے جو ناولٹ شروع کیا ہے اس کے لئے مبارکباد قبول کریں۔ اور فریڈل بہت اچھا جا رہا ہے۔ باقی تمام مہسلوں کے لئے بھی مبارکباد قبول کریں۔



مسئلہ رُسنے گانے، اور چاند پر جبنے کا

موسیقی کا ذوق دے تو اللہ

اچھے ہمسایے بھی دے!

ہو کہ چاند کی گیند اس میں تیرنی نظر آئے۔ ہمارے پرانے شاعروں میں حضرت میر تقی میر نے رُسنے کے فن کے اسناد تھے ان کے کسی ہم عصر اور پڑوسی کا شعر ہے جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کا بے کسووتا رہے گا یہ صاحب نظام ہمسایہ تخلص کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ لیکن ایک بات صاف ہو گئی کہ رونے اور گانے میں سب سے بڑی مشترک چیز یہ ہے کہ دونوں فن ہمسایوں کی نیند بھرا کر کے لے کر مجرب اور آزمودہ ہیں۔

ایک صاحب کا خط لاہور کے ایک اخبار میں چھپا ہے کہ ”مکرمی تعلیم، مجھے کلاسیکی موسیقی کا اشتنا شوق ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن انسان کو گانے کے لئے ایسی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے جہاں شور و غل نہ ہو۔ دنیا کے جھگڑے، خون خرابے کو سول دور ہوں میری خواہش ہے کہ میں چاند پر چار ربوں، وہاں ایک میوزک اسکول ہو جس میں موسیقی کی اعلیٰ تعلیم دی جائے اور میں اپنے گیتوں میں اس طرح کھوجاؤں کہ مجھے دنیا و مافیہا کا کچھ علم نہ ہو۔ وغیرہ... خادم ایم والی نیاز می۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کہتے ہیں کہ رونا اور گانا کس کو نہیں آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ رونے کو ہمارے فنون لطیفہ میں وہ مقام ابھی تک نہیں ملا جو کسی وجہ سے گانے کو مل گیا ہے۔ حالانکہ رونا بھی سائنسی کی طرح علم دریاؤں ہے۔ کسی پرانے شاعر نے لکھا تھا۔ رونے پر بانہ لے جو عمری چشم تر کمر کیا ہے زمیں، فلک پہ ہو پانی کمر بلکہ بعض منہوں میں کمر کر کے بجائے قمر قمر بھی لکھا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آسمانی پر سیلاب آئے تو تان تو

ایم والی نیاز می صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ گانے کے لئے ریاض اور ریاض کے لئے تنہائی بڑی ضروری ہے۔ ایسے بر دبار اور شریف ہمسائے فی فیہ نہ کہاں ملتے ہیں کہ کوئی کھا کر کان پیٹ کر سو رہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہمیں بھی موسیقی سے شوق رہا ہے لیکن محض ہمسائے اچھے نہ ملنے کی وجہ سے اس کی تکمیل نہیں کر سکے۔ جوں ہی رات بچنے کے لگتی اور ہم مرے میں آکر کھرج میں کوئی تان پھیرتے یک لخت

کوئی نہ کوئی بد فوجی دروازہ سینے لگا کر تان سین صاحب
کچھ خدا کا خوف کرو۔ ہم نوکری پیشہ آدمی ہیں سوئے دو۔ یہ
موانع نہ ہوتے تو آج ہمارے نام کے ایک طرف خان صاحب
اور دوسری طرف آفتاب موسیقی وغیرہ لگا ہوتا۔ کراچی کے
مختلف محلوں میں ہمارے جلد صلہ مکان بدلنے اور آخر میں
بیرون شہر تار تھ ناظم آباد میں آکر آباد ہونے کی بڑی وجہ
یہی ہے۔

جھگڑا ہونے کے باعث عطار و پر قائم کروایا گیا ہے
دلحظ جاری ہیں
•۔ "تان سین میوزک اسکول عطار دوسے زمین پر چلا گیا
ہے جو اب بالکل سنان اور خالی ہے۔ آئیے اور
ریاض فرمائیے۔
پتہ یاد رکھیے۔ نزد بس اسٹاپ پیر کا کوئی کراچی دے
کرہ ارض"

رونے اور گانے کی تلقین بلکہ تاکید حضرت علامہ
اقبال نے کی ہے

بر آرزو چم درون سینہ داری
مردوسے، نالہ، آہ، فغانے

بھلا علامہ اقبال کوئی بات ارشاد فرمائیں اور تم تعجب
نہ کریں، لیکن اس ظالم سماج کا کیا کچھ کہ ان سب باتوں کو
شور و غوغا کا نام دے کر لوگوں پر طرح طرح کی پابندیاں
عائد کر رکھی ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ گراموفون مت بجاؤ۔
ریڈیو مت اد بجا کرو۔ دھول مت پیو۔ آدھی رات کو اٹھ کے
مت گاؤ وغیرہ۔ مودا بے ایسی ہی حالت میں تنگ آکر کہا
ہو گا کہ۔

بھاڑ کے کپڑے بیاباں میں نکل جاؤں گا

لیکن نہیں تو بیاباں میں امان نظر آتی ہے نہ ایم وائی نیازی
صاحب کے چاند پر۔ بیاباں میں جا کے گائیے گا تو قیس صاحب
اور ان کے بھائی پتہ ہاتھ جوڑیں گے کہ بھٹا معاف کرو اور
گانا ہی ہے تو زیادہ پگامت کاؤ۔ ابن انشادی کوئی غزل سناؤ۔
چاند پر بھی کچھ دنوں، تصانیفوں، تابروں، او گانداروں نے زمینیں
خریدتی شروع کر دی ہیں۔ وہاں ہمارا میوزک اسکول کے دن
چلے گا۔ جہاں جاہل گے آبادی کا سلسلہ بھی پہنچے گا۔ نت اس قسم
کے اشتہار نہیں پڑیں گے۔

•۔ "تان سین میوزک اسکول۔ اب چاند سے زہرہ پر
چلا گیا ہے۔ پتہ نوٹ فرمائیے۔ سٹریٹنگ روڈ۔ زہرہ۔
ڈاک خانہ خاص"

•۔ "تان سین میوزک اسکول بعض ناگزیر وجوہ سے زہرہ سے
مشتری پر منتقل ہو گیا ہے۔ ریاض کے شائقین وہاں منتظرین
لائیں۔ پرنسپل: ایم وائی نیازی، سچو باور، کالونی مشتری"

•۔ "تان سین میوزک اسکول۔ مشتری پر منتقل ہو گیا ہے۔

رونے میں ایک خوبی البتہ گانے سے زیادہ ہے۔ وہ
پیکر بے آواز یا کم سے کم آواز سے بھی رویا جاسکتا ہے جیسا کہ
خواہن اصرار اور گھر بیٹوں میں دیکھنے میں کرتی ہیں کہ اپنے ساتھ
روماں اور تو لیٹے جاتی ہیں۔ جوہی بیرون یعنی بی بی نیکی دین
فلک کچھ قمار کے چکر میں آتی انہوں نے ڈس ڈس رونا اور
ذیدے کو تھوڑا سا کو دیا جیسے گانے کی بھی ایک صورت ایسی نکل آتی ہے کچھ
دلہے اور بے آواز سے کی ترقیب میں آتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر
نہم کر تے ہیں کہ جوہی محفل سماج شروع ہوئی ہم نے آواز
کی گھٹ ڈی آئی گئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ
اچھے خاصے آدمی کی شکل گانے اور شعر پڑھنے میں کیسی ہو جاتی ہے۔

نیازی صاحب پتے گانے کے آدمی میں اس لئے انہیں
چاند سے ادھر کوئی جائے امان نظر نہیں آتی۔ کمرشل سروس کا
کچھ کا نام تو اس کے ساتھ اس قسم کی قیامت نہیں۔ سچ پوچھا
جائے تو موسیقی اور شاعری کے امکانات کی وسعت کا اب
اندازہ ہوتا ہے۔ دریا سچو باور تو ملہار گاتے اور میر وغالب
محبوب کی حکایات اور شکایات بیان کرتے کرتے مر گئے۔ آج
ٹیلی ویژن پر کوئی نرم و لطیف نغمہ چھڑتا ہے تو عادتاً آغیاں ہوتا
ہے کہ کسی ماہ چہرہ سے خطاب ہے۔ بھٹوڑی دیر میں معلوم ہو
جاتا ہے کہ ان کی جان تنہا اور مسخو دخیال تو فلاں صاحب کی ٹیکہ
ہے یا فلاں پوڈر ہے کہ بھاگ نہ اس کا پھینکو۔ اور بھی
کپڑے دھو لو، یا فلاں سکرٹ ہے یا فلاں سائیکل ہے یا فلاں
بناسپتی گھی کا ڈبہ ہے۔ ویسے یہ ٹھیک بھی ہے، عشق ایسی ہی
چیزوں سے کرنا چاہیے جو قابل حصول ہوں۔ دیکھو مبین
جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔

•۔ "تان سین میوزک اسکول۔ مشتری پر منتقل ہو گیا ہے۔

مجھ سے ملئے مجھے ریحانہ زیدی کہتے ہیں



- ۱۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں ۔
- ۱۳۔ یہ اشتیاق مجھے بہت پسند ہے ۔
- کل چودھویں کی رات تھی شب بھر باہر چاٹتا
- کچھ نہ کہا یہ چاند ہے کچھ نہ کہا چہرہ ترا
- ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی بپوچھا کئے
- ہم نہیں دئے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ ترا
- ۱۴۔ اظہار کے لیے افسانہ نگار کے کوئی دے
- منتخب کیا ۔
- شاعری کے جوائیم مطلق نہ تھے ۔
- ۱۵۔ ناول افسانے کا ایک کردار جس نے مجھے
- بہت متاثر کیا ۔
- ۱۶۔ THE MOTHER کی ماں کا کردار ۔
- ۱۷۔ وہ لمحوں میں مجھے اپنا آپ پیارا لگا ۔
- ابھی تک نہیں آیا ۔
- ۱۸۔ ایک سوال جو مجھ سے بار بار کیا جاتا ہے
- الست آپ کیسے لکھ لیتی ہیں ۔
- ۱۸۔ وہ لوگ جن سے پر مجھے رشک آتا ہے ۔
- جو انشاورجی کے ساتھی ہیں ۔
- ۱۹۔ اگر میں افسانہ نگار نہ ہوں تو
- تو سیاسی لیڈر ہوتی ۔
- ۲۰۔ میرے زندگی کے کاغذوں پر دئے ۔

- ۱۔ مجھے ریحانہ زیدی کہتے ہیں ۔
- ۲۔ میرا اصلی نام ریحانہ لغیم ہے ۔
- ۳۔ میں اس ملک کی ناول نگار افسانہ نگار
- ہوں ۔
- ۴۔ میرا پہلا افسانہ خواتین کے ایک پرچے
- میں چھپا ۔
- ۵۔ میرا پہلا ناول خواتین ڈائجسٹ میں چھپا ۔
- ۶۔ میرے دو نمائندہ تحریریں ۔
- بھلے مالش اور راہ طلب ۔
- ۷۔ اپنا ایک افسانہ جو مجھے بہت پسند ہے ۔
- راہ طلب ۔
- ۸۔ میرے شعر اکثر گنگنائے ہوئے ۔
- کیوں دیر گئے گھر آئے ہو
- سجی سے کرو گے بہانہ کیا
- ۹۔ میرا پسندیدہ شاعر
- انشاورجی ۔
- ۱۰۔ میرا پسندیدہ ادیب
- انشاورجی ۔
- ۱۱۔ میرا پسندیدہ مزاح نگار ۔
- انشاورجی ۔
- ۱۲۔ وہ کتاب جسے میں نے بار بار پڑھا ۔

ہرگز نہ ہوا دن غلبہ صورت لگتا ہے ۔

۲۱۔ میرا پسندیدہ پھول ۔
موتیا ۔

۲۲۔ میرا پسندیدہ رنگ ۔
ہلکا قرمزی رنگ ۔

۲۳۔ میرا پسندیدہ لباس ۔
سکرتا شوار ۔

۲۴۔ میری پسندیدہ ڈش ۔
ادھر کی دال اور چاول ۔

۲۵۔ کھانا جو میرے مزیدار پکاتے ہوتے ۔
میاں کو تو کچھ پسند نہیں آتا ہاں لوگ کہتے
ہیں کہ کچھ اسے بیگن اچھے پکاتی ہوں ۔

۲۶۔ طالب علم کے زمانے میں جسے مضروب
سے نفرت ہوتے ۔

ہسٹری ۔
۲۷۔ آئینہ دیکھتے ہوئے تو سوچتے ہوئے ۔
کل ... ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا ۔

۲۸۔ میری سب سے بڑی خواہش ۔
ادب کا فوٹل پرائز حاصل کروں ۔

۲۹۔ وہ خواہش جو صرت بنے گئے ۔
سیاسی رہنمائی کی خواہش ۔

۳۰۔ ایک خواہش جو غیر متوقع طور پر پوری
ہو گئی ۔

بڑی خواہش تھی انشاد جی سے ملنے کی ایک
دن جنگ بلڈنگ کی لفٹ میں حسب

سابق ٹھہری اپنے پیر کے انگوٹھوں کو دیکھ رہی
تھی جب لفٹ رکی اور ساتھ جو صاحب

باسرنگے وہ انشاد جی تھے تبس نہ کر لوئے ۔
”کیوں صاحب کیا سوئی تلاش کر رہی

تھیں ؟“

”میں نے کہا : ”ہاں لفظوں کی گودری سینٹی
ہے“

۳۱۔ جب تنہا ہوتے ہوئے تو خیال آتا ہے ۔
تنہا کب ہوتی ہوں جب حقیقی احساس مانے

نہیں ہوتے تب کرداروں کے خیالی پسیر

ذہن کے پلیٹ فارم پر بلا ٹکٹ دندناتے
پھرتے ہیں ۔

۳۲۔ زندگی کے وہ لمحات جب مات کھا
کر خوشیے غموں سے کئے ۔

ابھی تک اللہ نے سرخرو ہی رکھا، مات
ہنیں کھائی ۔

۳۳۔ وہ لمحہ جس نے زندگی سے قوس و
قزح کے سب رنگ بھر دیئے ۔

ہشت ادا کی باتیں نہیں پوچھتے ۔
۳۴۔ میری کمزوری ۔

پھول ادب کچے ۔
۳۵۔ میں بھولے جاتے ہوئے ۔

قزح دے کر ۔
۳۶۔ میں بے بس ہو جاتے ہوئے ۔

جب کوئی ادھار مانگے اور میں دے نہ
سکوں ۔

۳۷۔ وہ لوگ جنہیں میں دو منٹ سے زیادہ
برداشت نہیں کر سکتے ۔

دوغل اور مطلبی ۔
۳۸۔ وہ لوگ جس سے ملنے، باتیں کرنے

کو جیسے چاہتا ہے ۔
۳۹۔ وہ جو بھلا سے چلے گئے ۔

۴۰۔ ایک شخصیت جس نے میری زندگی
پر گہرے اثرات مرتب کئے ۔

انشاد جی ۔
۴۱۔ ایک احساس جس پر میرے پشیمانے

ہوتے ۔
میری پیاری کتیا جلی جو میرے کراچی جلنے

کے بعد گریٹ کی دہلیز پر سر رکھے نگہ مر
گئی ۔ مجھے ہر لمحہ یہ احساس کچھ کتاب کہ اگر اسے

بھی ساتھ لے جاتی تو شاید وہ لوں نہ مرنی ۔
۴۲۔ زندگی کے وہ دن جو میرے چاہتے

ہوئے لوٹ آئیے ۔
اچھے لوگوں کی صحبت میں گزارے ہوئے

دن ۔

EXTRA DENTONIC

انٹوں کو سفید و چمکدار
دانتوں کو صحت مند

اور سانس کو خوشگوار رکھنے کے علاوہ

سورٹوں سے خون آتا ہو
یاد انتوں میں کیسٹرا کا ہو
سودیم فلورائیڈ
کے ساتھ



طراظ
کیسٹرا
سورٹوں کا از مودہ پکوں کا پسندیدہ

سے بہتر پہلے سے عمدہ

۴۲۔ اگر دولت و شہرت و محبت میں سے انتخاب کرنے کو کہا جائے۔
محبت کا انتخاب کروں گی۔

۴۳۔ اگر جبراً رکھنے سے لوگ دیا جائے؟
پاگل خانے میں کمرہ الاٹ کروانا پڑے گا
مجھے غصہ آتا ہے۔

۴۴۔ جب نایم رات کو دیر سے گھر آتے ہیں۔
۴۵۔ اگر میری شادی نہ ہوئی ہو تو فوٹے
تو میں بڑی دہنگ سیاسی لیڈر بن چکی ہوتی۔

۴۶۔ لڑکیاں اچھے لگتے ہیں۔
جوفیشن نہ کرتی ہوں۔ ناخن ترشے ہوئے
ہوں نیل پالش نہ لگی ہو۔

۴۷۔ اگر دوبارہ زندہ کیے ملے تو کیا بننا پسند
کروں گے۔
گوریا چڑیا جو ہر طرف اڑتی پھرتی ہے۔

۴۸۔ میں خواب دیکھتی ہوں۔
کرمیں ایک ٹھنڈے میٹھے پانی سے بھرا ہوا
... بادل بن گئی ہوں جو بھولوں کے ساتھ

ساتھ کانٹوں پر بھی برس رہا ہے۔
۴۹۔ میرے افسانوں کے کتے لڑکے۔
ہر وہ لڑکی جس کی کوئی اچھائی یا برائی مجھے

اپنی طرف متوجہ کرے۔
۵۰۔ میری زندگی کے حسینے ترلحات۔
پھر وہی بات؟

۵۱۔ لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔
جو رات کی بات دوسروں سے کہنے کے بعد
تاکید کرتے ہیں "کسی سے کہنا مت"

۵۲۔ ایک بات جو میرے دوسروں سے تک پہنچانا
چاہتی ہوں۔
اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔





نثار زہیری اور راشدہ زہیری سے ملاقات

سائبر سحر



دستی ہیں۔
انٹرویو کے لئے جب میں نے زیر صاحب کو فون کیا
تو انھوں نے کہا۔
”آپ راشدہ سے بات کریں اور فوراً ہی اپنے گھر کا فون
نمبر دے دیا۔
راشدہ سے میں نے بات کی تو انھوں نے کہا۔
”بھئی آپ ہم دونوں کا ساتھ انٹرویو کریں ہم تو دینے
ہی جھگڑتے رہتے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”آپ فکر کریں۔ ہم آپ کو جھگڑنے
نہیں دیں گے۔“

راشدہ انٹرویو کے لئے بھی ہو گئیں۔ انھوں نے کہا
کہ آپ زیری صاحب سے وقت ملے کر لیں۔ اور جو وقت

چاہیں ان کو عموماً شوہروں سے بڑی شکایت ہوتی ہے
کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں، گھر پر ان پر
پوری توجہ نہیں دے پاتے۔
آج ہم آپ کی ملاقات جس جوتے سے کر رہے ہیں
ان میاں بیوی دونوں کا تعلق صحافت سے ہے اور صحافیوں
کا شمار مصروف ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا
کہ یہنوں کو ان کی ازدواجی زندگی کا رخ دکھایا جائے۔
یہ ہیں مشہور صحافی۔
نثار احمد زہیری اور راشدہ زہیری۔

نثار احمد زہیری صاحب ایک بڑے ہفت روزہ
کے ایڈیٹر ہیں اور راشدہ زہیری ایک مقامی روزنامے میں
کالم لکھتی ہیں اس کے علاوہ نفسیاتی مسائل کے جواب بھی

وہ دن مجھے بتادیں۔ کیونکہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ اور انھیں بھولنے کی عادت ہے اس لئے ان کے تمام آپائنٹ کال مجھے علم رہتا ہے اور میں یاد دہانی کرتی رہتی ہوں۔ تب میں نے زبیری صاحب سے ٹائم لیا اور دوسرے دن ان کے گھر جا پہنچی۔

گلشن اقبال کے ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر میں زبیری صاحب اور راشدہ زبیری میرے منتظر تھے میں نے ان سے لیٹ ہونے پر محذرت کی کیونکہ مجھے ان کا گھر ڈھونڈنے میں کافی دیر ہو چکی تھی۔

راشدہ نے انٹرویو کے لئے تصویریں بنوانے کا بطور خاص کوئی اہتمام نہیں کر رکھا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ

سادہ لباس میں ملبوس مہنی سکراتی خوش مزاج پرکشش راشدہ ایک گھر ملیسی معنی خا تون نظر آرہی تھیں کام میں ضرورت کے سبب ان کے بالوں کی ٹیٹس باہر نکل آئی تھیں۔ زبیری صاحب کو جلدی جانا تھا۔ اس لئے میں نے انٹرویو کا آغاز زبیری صاحب سے کیا۔

زبیری صاحب اور راشدہ زبیری کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں نے پہلے نفسیات میں ایم اے کیا پھر صحافت میں ایم اے کیا۔

میں نے زبیری صاحب سے سوال کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ دونوں میں یہ تیز مشترک ہے کہ آپ دونوں نے پہلے نفسیات میں اور پھر صحافت میں ایم اے کیا۔

وہ ہنس دینے لگی "جی ہاں ہم دونوں میں یہ بھی مشترک ہے کہ دونوں نے دونوں ہی مضامین میں کیا۔" آپ نے پہلے نفسیات میں ایم اے کیا پھر صحافت میں کیا تو جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بچپن سے ہی شوق تھا تو آپ کو بچپن سے صحافت کا شوق نہیں تھا؟

"نہیں کھنے وغیرہ کا سلسلہ تو بچپن سے تھا، شاعری افسانے وغیرہ لکھنے کا بہت شوق تھا۔ بلکہ پاکستان آنے سے پہلے دو قین ناول بھی لکھے تھے؟

"ادب سے صحافت میں کیسے آئے؟"

زبیری صاحب کہنے لگے۔

زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آدمی بہت مختصر عرصے کے ملازمت تلاش کرتا ہے اگر حالات ایسے ہوں جو اسے جیل و جہاز نہ دیا جائے، سائیکالوجی میں ایم اے

کرنے کے بعد میں بہت شدت سے ملازمت تلاش کر رہا تھا میرا ایک دوست نے مجھے مقامی روزنامے میں رکھوا دیا اس طرح میں صحافت کی لائن میں آ گیا۔

"تو آپ نے صحافت میں آنے کے بعد ایم اے کیا؟"

"جی ہاں جو کہ دفعہ تین کام رات میں ہوتا تھا اس لئے ہم صبح کا سیں اٹھنا شروع کرتے اور رات کو کام کرتے تھے۔ اس طرح جو ملازم میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد میں نے مقامی ہفت روزہ میں کام کرنا شروع کر دیا۔"

"اس میں آپ کیا لکھتے ہیں؟"

"اس میں زیادہ تر سیاست پر لکھتا ہوں"

"افسانے وغیرہ لکھنے چھوڑ دیئے؟"

"افسانے میں نے کافی لکھے ہیں وہ چھپے بھی ہیں۔ اصل میں ایسا تھا کہ ہماری ایک نشست ہوتی تھی۔ اس میں بعض اوقات افسانے پڑھنے کے لئے کوئی نہیں ہوتا تھا تو ٹیکہ پڑ کرنے کے لئے میں افسانے لکھ کر پڑھ دیتا تھا بعد میں وہ چھپ جاتا تھا۔ اب دراصل وقت نہیں ملتا کوئی چیلنج سامنے ہونا نکھاجائے۔"

"زبیری صاحب آپ سیاست پر لکھتے ہیں؟ آپ کے خیال میں سیاست میں صحافت کوئی کردار ادا کر سکتی ہے؟"

زبیری صاحب نے بے ساختہ کہا۔

"صاحب سیاست میں صحافت فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ اصل میں سیاست کا یہ ہے کہ اس میں جب تک یہ سامنے نہ آئے کہ سیاسی لوگ کیا سوچتے ہیں؟ ان کے نقطہ نظر کیا ہیں وہ کس طرح سے مختلف مسائل کو دیکھ کر سکتے ہیں یہ جب تک عام لوگوں تک نہ پہنچے ان کا دائرہ بڑھ نہیں سکتا ہے۔"

"ہماری صحافت نے تو اب تک کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے؟"

زبیری صاحب نے اعتراف کیا۔

"نہیں ہماری صحافت نے خرابی صحافت کا کردار ادا کیا ہے یہ آپ نہیں کہہ سکتیں کہ کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ ایک ایسا کردار ادا کیا ہے جس میں مثبت بہت کم ہے اور منفی بہت زیادہ، اور یہ صرف صحافت ہی میں نہیں بلکہ تقریباً ہر شعبے میں ہی ہوا ہے کچھ کام ہوا ہے اور کچھ کام بگاڑا گیا ہے۔"

"آپ کے خیال میں دوسرے شعبوں کی نسبت صحافت پر زیادہ فتنے و فساد کی عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ انھیں صرف عوام کو

صحیح پہلو دکھانا ہوتا ہے بلکہ رہنمائی بھی کرنی ہوتی ہے۔“
انھوں نے کہا۔

”نہیں صاحب یہ میں نہیں مان سکتا صحافی کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں صحافی کی بھی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی کہ ہر شہری کی ہوتی ہے۔“

”زیریں صاحب یہ بتائیے کہ آپ لوگ اپنی بات عوام تک پہنچانے میں آزاد ہیں؟“

”دیکھئے کچھ پابندیاں ہوتی ہیں لیکن میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جو بدترین حالات میں نہیں لکھی جاسکتی۔ ہر بات لکھی جاسکتی ہے بس یہ ہے کہ پیرائے اظہار ہونا چاہئے ایک تو ہوتی ہے کلباڑی چھاپ

صحافت کہ آپ نے جا کر سیدھے سیدھے ایک آدمی کے کلباڑی مار دی یہ کوئی صحافت نہیں ہے اور ہمارے ہاں کی صحافت کا تو یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں رانی چاہئے پر بت بنانے کے لئے انھیں رانی بھی نہیں چاہئے یعنی خود صحافیوں کا کردار کوئی اچھا کرار نہیں ہے۔“

زیریں صاحب بات کرتے ہوئے رُکے
”دیکھئے میں صاف صاف کہہ رہا ہوں آپ برائے مہربانی صاف صاف لکھئے گاسب لوگ ایسے نہیں ہیں لیکن صحافیوں کی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صحافی بننے کے اہل نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ صورت حال کو ایک پلانٹ کرتے ہیں۔“

کیونکہ میں صحافیوں کے ساتھ رہتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ بڑی افسوسناک بات ہے لیکن ہر حال ہمارے ہاں یہ خرابی ہے اور اس سے ہماری صحافت کا کپیکیشن بنتا ہے۔
”آپ نے کہا کہ بدترین حالات میں بھی اپنی بات کہی جاسکتی ہے۔ پیرائے اظہار ہونا چاہئے۔ پیرائے اظہار سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”پیرائے اظہار سے مراد مطلب یہ ہے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس میں بہت کچھ کہنے کی صورت نکال سکے ہیں۔“
”لیکن اگر بات اشارتاً یا ایسے انداز میں لکھی جائے کہ وہ نہ پہنچ سکے تو لکھنا بے مقصد نہیں ہوتا ہے؟“ میں نے

پوچھا۔
”دیکھیں دراصل یہ عام آدمی کے لئے تو ہوتی نہیں سلی مضامین میں بھی عام آدمی کے لئے نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں خزانہ کی کا اوسط پندرہ فیصد ہے اور اس میں بھی بیشکل ایک فیصد لوگ ایسے ہوں گے جو سیاسی مضامین پڑھتے

ہیں ان کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جوابات اشارتاً ہی عنی ہے وہ ان تک نہیں پہنچی ہے ضرور پہنچی گی۔

پیرائے اظہار سے نیکے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کھنا بھی ایک فن ہے۔ یہ نہیں کہ ایک آدمی نے لے کر کے میٹرک کر کے یا ایم لے کر کے آیا ہے اور وہ بہت اعلیٰ سطح کی سیاست کا مضمون پہلے دن سے لکھ سکتا ہے۔ یا چار پنج سال کے تجربے پر لکھ سکتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، کھنا بہت فنکاری کی بات ہے۔ جن ملکوں کی ہم مثال دے رہے ہیں ان میں بہت فنکاری کے ساتھ لکھا جاتا ہے مثلاً ٹائم میگزین، نیو یارک ٹائمز، لائونڈ ٹائمز کا اگر ہم حوالہ دیتے ہیں تو اس کو ہمارے ہاں کے لوگ تو پڑھ کر گزر جاتے ہیں غور سے نہیں پڑھیں تو دیکھیں کہ ان کے

ہاں کوئی بات بغیر گجائش رکھے نہیں کہی جاتی، ہمیشہ اس طرح کہی جاتی ہے کہ ہم اس طرح کہہ رہے ہیں لیکن یہ کسی دوسری طرح سے بھی ہو سکتا ہے وہ ہمیشہ PERHAPS (شاید) کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ شاید ہماری صحافت میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہمارے ہاں تو جو بالکل نیا آدمی ہوتا ہے اور جس کا بہت کم تجربہ ہوتا بہت کم تجربہ ہوتا ہے اور بہت کم تجربہ کر سکتا ہے۔ وہ پہلے دن اتنی فصل کن اور قطعی بات کر دیتا ہے کہ اس کے آگے کوئی گجائش نہیں ہوتی۔
زیریں صاحب نہایت سنجیدگی سے انداز میں بول رہے تھے وہ خاموش ہوئے تو میں نے سوال کیا۔

”ایک اور خرابی ہمارے ہاں یہ نہیں کہ کہاں نظرینے کے بجائے شخصیت کو ایک پلانٹ کیا جاتا ہے؟“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں ساری دنیا میں ایسا ہی ہے۔ ساری دنیا میں شخصیات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔“

میں نے ان کی بات سے اختلاف کیا۔
”لیکن ان کے ہاں مضبوط نظر بات ہیں پائیدار جمہوری ادارے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں ابھی تک بنیادی باتوں کا تعین نہیں ہو سکا۔ اس صورت حال میں یہ درست ہے۔“
زیریں صاحب سنجیدہ ہو گئے۔

”پاکستان کو بننے ہوئے صرف چونتیس سال ہوئے ہیں۔ چونتیس سال میں آپ یہ فیصلہ نہ کریں کہ کہاں شخصیات اور نظریات کی کیا صورت حال ہے مثلاً اگر امریکن جمہوریت سے پاکستان کا مقابلہ کریں تو امریکن جمہوریت بہت پرانی ہو چکی ہے



اس میں وقت لگتا ہے اب ٹائم میگزین جو ہمارے ہاں بہت بڑھا جاتا ہے اور بہت مشہور ہے اس کی عمر تقریباً سو سال سے زیادہ ہے ہمارے ہاں الیا کوئی میگزین نہیں ہے۔
 ”موجودہ حالات میں صحافی کی ذمے داریاں کیا ہیں؟“
 ”صاحب جو دنیا کی طے شدہ روایت ہے وہ دیکھ کر بیچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ لکھ دیکھنے یا کم لکھنے کی کوشش ضرور کیجئے ہمارا مان کر نہ بیٹھ جائیے کہ کہا گیا کہ رات نہیں دن ہے تو آپ بھی کہہ دیں کہ دن ہے میں پتھر پھوں گا کہ آپ پرانے اظہار سے ایسی صورت نکال سکتے ہیں کہ اپنی بات کہہ سکیں۔“

زیریں صاحب خاموش ہوئے تو میں نے گفتگو کا رخ سیاست سے ان کی ذات کی طرف موڑا۔

”زیریں صاحب یہ تبلیغی کہ آپ کی شادی آپ کی پسند سے ہوئی ہے یا والدین کی پسند سے؟“
 انھوں نے مسکرا کر کہا۔

جی بالکل میری پسند سے۔
 ”شادی سے پہلے آپ کے یا والدین کے طرف سے کسی مخالفت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟“

اور اس کی روایات بہت مستحکم ہو چکی ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پاکستان میں یہ حالات نہیں ہوں گے انشاء اللہ ضرور ہوں گے۔ آپ موجودہ صورت حال کا موازنہ اس وقت سے کریں جب ابراہام لنکن کو یہ سب اسٹیبلشمنٹ کے ہونے سے تیس تیس سال ہوئے تھے تو پاکستان کی صورت حال بہتر نظر آتی ہے۔ آج کے امریکہ سے پاکستان کا مقابلہ کرنا کہ یہاں جمہوریت نہیں ہے یا پاکستان نہیں وہ حالات نہیں یہ غلط بات ہوگی۔

”باہر ہم دیکھتے ہیں کہ صحافیوں کا کردار بہت اہم رہا ہے کیا پاکستان میں ایسی کوئی مثال ہے جس طرح انھوں نے ایک حقدار کو تار دیا؟“
 زیریں صاحب نے کہنے لگے

وہاں سے جو اخبار نکلتے ہیں اور وہاں آتے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جس کی عمر سو سال نہیں ہو چکی۔ پاکستان کے سب اخبار نو زائید ہیں ان کی روایات مستحکم ہونے میں بہر حال دیر لگے گی پھر یہ بھی ہے ہمارے مل جل جگ اٹنی بڑے اخبارات کی سرکوششیں بڑھے۔ تاکہ وہ ملتے جلتے اجازت مرزائیت کر سکیں کہ ان کا نمائندہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہو

نہیں بالکل نہیں! میں نے والدین سے کہا میں یہاں شادی کرنا چاہتا ہوں اور انھوں نے اجازت دیدی۔

”شادی سے پہلے آپ لوگ کہاں ملے تھے؟“
”ایسا تھا کہ ہمارا اخبار میں طلبہ کا صفحہ تھا۔ اس میں یہ کالم لکھتی تھیں۔“ فریاد کچھ تو ہو“ اس سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

”تو ملاقات کے کتنے عرصے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ شادی کر لینی چاہئے؟“
”ملاقات کے بہت عرصے تک نہیں کیا؟ زبیری صاحبہ کہتے ہوئے ہنس دیتے۔

”پہلے فیصلہ کس نے کیا؟“
”زبیری صاحب نے منہ کر کہا۔

”یہ آپ راستہ سے پوچھیں۔“
”آپ جتنا دیر پھر راستہ سے بھی پوچھ لیں گے۔“

”میرا خیال دونوں نے تقریباً ایک ساتھ فیصلہ کیا تھا۔“

”آپ کے لکھنے پر آپ کی بیگم کس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔؟“

”میرے لکھنے کے معاملے میں یہ بالکل اثر انداز نہیں ہوتیں، اس لئے کہ بیشتر چیزیں دفتر میں لکھتا ہوں۔

گھر پر تو صرف پڑھنے کا کام ہوتا ہے۔“

”آپ جو کام کرتے ہیں اس کے لئے ذہنی سکون کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیا آپ کی بیگم نے آپ کو ذہنی سکون دیا ہے؟“

”زبیری صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”جی ہاں! انھوں نے بہت زیادہ ذہنی سکون دیا ہے۔“

”یہ آپ نے سوال پوچھ لیا تو آپ کچھ دیر تا کر دوسرا تک بات پہنچ جائے۔ اصل میں شادی کے ہمارے بہت سے لوگوں نے بڑے عجیب مطلب نکال رکھے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اور اس کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ کنوینیشن ہو آپ تمام دنیا کی باتیں بیوی سے کر سکیں اور وہ آپ سے کر سکتی ہیں۔

آج کے دال کی بات کرتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی بات کرتے ہیں یا مگر کسی آرائش کی بات کرتے ہیں بلکہ جن طرح دونوں کے ساتھ بیٹھ کر آدمی دنیا زمانے کی تمام باتوں سے بات کرے۔

میں گپ کر سکتا ہوں، غور کر سکتا ہوں اور دونوں مل کر کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح بیوی سے بات کرنی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ راشدہ ہیں یہ بہت بڑی کوالٹی ہے کہ ہم لوگ بہت دیر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دو دو گھنٹے گزر جاتے ہیں باتوں میں۔“

”آپ دونوں سمجھتے ہیں آپ کی تخلیقات کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہوتا ہے؟“

”انہوں نے آج تک میری کسی چیز کی تعریف نہیں کی میں نے کبھی بھی کی ہے۔“ زبیری صاحب نے ہنس کر کہا۔

”تنقید کرتی ہیں؟“

”نہیں کبھی ایسا بھی نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چیزیں یہ پڑھتی ہی نہیں۔“

”راشدہ کمرے سے جلتے جاتے رک کر بولیں۔

”دراصل یہ جن ایک فیصلہ لوگوں کے لئے لکھتے ہیں جو جنس ہیں ان میں مجھے شامل نہیں کرتے۔“

”زبیری صاحب نے فوراً تردید کی۔

”نہیں میں نے ان لوگوں کو جنس نہیں کہا۔ میں نے کہا ہے کہ ریاستی چیزیں پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔“

”شادی کے بعد آپ میں کوئی تبدیلی آئی؟“

”صاحب یہ بڑا خیال آتا ہے کہ شادی بہت کم ہو گئی ہے پہلے یہ تھا کہ ہم جس وقت بھی چاہیں دفتر سے گھر آ سکتے تھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ یہ سوال کرنے والا ہوتا کہ ”بھئی اتنی دیر کیسے ہوئی؟“ کیوں اتنی دیر سے آئے ہو، کہاں غائب رہے ہو؟“ دوسرے یہ کہ رڈ سے داریاں بڑھ گئیں۔ پہلے یہ تھا کہ بالکل فری تھے جس وقت دل چاہا دفتر چلے گئے اور جا کر حوصلہ چاہا کیا کوئی پابندی نہیں تھی؟“

”زبیری صاحب رک کر کہنے لگے۔

”دراصل یہ بھی ہے جس وقت ہماری شادی نہیں ہوئی تھی اس وقت اتنا کام نہیں ہوتا تھا۔ اب دفتر میں میرا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ اسٹاف بڑھ گیا ہے۔ میری فیسے داریاں بھی بڑھ گئی ہیں اس کی وجہ سے مصروفیت بھی بڑھ گئی ہے۔“

”اچھا زبیری صاحب یہ بتائیے کہ آپ دونوں کے درمیان جھگڑے ہوتے ہیں؟“

”جی ہاں! بالکل بہت جھگڑے ہوتے ہیں! جھگڑے

رکھ دیجیے اور مجھے کہیں پڑی مل جائے اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے۔

راشدہ ہنس کر بولیں۔

”کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ کتاب میں کم پڑھتی ہوں ان کے بچے زیادہ پڑھتے ہیں۔“

زمیری صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”بچوں کو بھی کہا جاتا ہے لیکن بچوں کی ماں کو زیادہ کہا جاتا ہے، راشدہ کہنے لگیں۔“

”میں آپ کو بتاؤں کہ دنیا میں جہاں کہیں خرابی ہوتی ہے یا ہمارے گھر میں جہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کی قطعہ والی ٹیچ

پرس ہوتی ہے ان پر نہیں ہوتی، زمیری صاحب نے ہنسنے لگا کر کہا۔“

”صاحب کیجیے واقعی یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں ہمارے گھر میں جہاں کہیں گڑبڑ ہے اس کی ذمہ داری راشدہ پر ہے،“

راشدہ نے ہنس کر کہا۔

”دیکھا آپ نے اور پوچھو تو دنیا میں اور پورے گھر

ہی تو نارمل ہونے کی نشانی ہیں؟“

”عموماً کن باتوں پر ہوتے ہیں؟“

”بس یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ نیا نہ کھڑے ہیں، گاڑی باہر نکالنی ہے گیٹ کھل گیا ہے لیکن راشدہ اور

بچے تیار نہیں ہیں تو بس جھگڑا شروع ہو جاتا ہے،“ راشدہ باہر دیکھے ہیں آدمی تھیں۔ بولیں،

”دیکھئے نا ہوتا یہ ہے کہ یہ تو خود تیار نہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ان کو تو بس گاڑی نکالنا ہوتی ہے اور باہر جانا

ہوتا ہے اور مجھے ٹینوں بچوں کو تیار کرنا ہوتا ہے گھر کو دیکھنا ہوتا ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سارا

کام ہو جائے۔“ زمیری صاحب بہت دلچسپی سے راشدہ کی باتیں

سن رہے تھے جب وہ خاموش ہوئیں تو انھوں نے قہقہہ لگایا۔

”دوسرا جھگڑا اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی اہم چیز مثلاً کوئی کتاب جسے میں چاہتا ہوں کہ اس کی حفاظت کی جائے اور میں ان کے پیچھے دوں کہ صاحب اس کتاب کو منہال کر



میں جہاں کہیں اچھا نہیں ہے اس کے قطعہ دار آپ نہیں؟
میں ان دونوں کی دلچسپ لوک جھونک سے لطف اندوز
ہو رہی تھی وہ خاموش ہونے کو نہیں بنے کہا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جھگڑنے کا آغاز عموماً آپ کی
طرف سے ہوتا ہے؟“

زیریں صاحب نے فوراً تردید کی۔
”بھئی یہ تو پھولیش کی وجہ سے ہوتا ہے“

”نیا دہ غصہ کسے آتا ہے؟“
”مجھے؟“ زیریں صاحب نے بڑے اطمینان سے اعتراف

کیا۔

”غصہ آتا ہے تو کیا کرتے ہیں؟“
”بس سچ پرکار“ زیریں صاحب یہ کہتے ہوئے ہنس پڑے
”راشدہ کا دعوہ کیا ہوتا ہے؟“
”ان کا دعوہ بہت نفیاتی ہوتا ہے۔ یہ خاموش
رہتی ہیں؟“

”شادی کی کامیابی کا زیادہ انحصار کس فرق پر ہوتا ہے؟“
”دونوں پر یہ بالکل غلط خیال ہے کسی ایک فریق پر
زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے دونوں پر یکساں ذمہ داری
ہوتی ہے؟“

”آپ کی ازدواجی زندگی کامیاب ہے؟“
”نہیں میں سمجھتا ہوں پوری طرح کامیاب نہیں ہے
اگر راشدہ چاہیں تو اوہ کامیاب ہو سکتی ہے؟“ زیریں صاحب
یہ کہہ کر پھر ہنس دیئے۔
”راشدہ اسٹھ کر باہر چاکی تھیں باہر سے ہی بولیں۔
”میرا خیال ہے یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ نظر نہ لگ
جائے؟“

زیریں صاحب نے کہا۔
”نہیں بھئی مجھے راشدہ کا کچھ اور کمزری بیوشن درکار
ہے؟“

”مثلاً کیا؟“ میں نے پوچھا۔
”یہی کہ چیزوں کا ذرا زیادہ خیال رکھیں“
”سمجھ خیال آتا ہے کہ آپ کی شادی ان سے نہ ہوئی ہوتی؟“
”نہیں بالکل خیال نہیں آتا بلکہ آپ کو سچ بتانا ہوں اس

بات کا کوئی تصور دیا ہی نہیں رہا کہ ہم لوگ کبھی الگ رہے ہیں
سچ بات یہ ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم شادی شدہ پیدا

ہوئے تھے؟

راشدہ نے کہا ”بھئی آپ اس سوال کو اس طرح پوچھیں
کہ آپ کو دوسرا اجتماع ملا تو ایک دوسرے سے شادی کریں گے؟“

زیریں صاحب نے ہنس کر کہا۔
”سوچوں گا؟“

”شادی کے بعد راشدہ میں کوئی تبدیلی آئی؟“
”جی ہاں بہت زیادہ تبدیلی آئی۔ حد یہ ہے کہ ان کی
تحریر سے میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ زیادہ اچھا لکھنے لگی ہیں
پھر زیریں صاحب سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔

”سچ تو یہ ہے کہ گھر کی سادی ذمہ داری راشدہ پر ہے
یہ مجھے زیادہ سے زیادہ موقع دیتی ہیں کہ آرام کروں سب
کام یہ خود ہی کرتی ہیں بلکہ میرے خاندان کی بہت سی ذمہ داریاں
انھوں نے سنبھال رکھی ہیں۔ جن سے راشدہ کا براہ راست کوئی
تعلق نہیں ہے بالواسطہ تعلق ہے۔ میرے والدین مجھے اکثر کہتے
رہتے ہیں کہ کم لے کر رکھا ہے کہ اپنا کام بھی اس پر ڈال
دیا ہے۔ دراصل مجھ پر اب کام کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے۔
جس سے میری مصروفیت بڑھ گئی ہے۔“

”میں نے ان سے شادی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ
دیکھئے صاحب ہیں بالکل ملازم افورڈ نہیں کر سکتا ہوں۔ اگر آپ
گھر کا کام کرنے کے لیے تیار ہوں تو ٹھیک ہے آپ اپنے
ذہن میں رکھیے کہ آپ کو یہ کرنا ہے۔ دراصل انھوں نے اپنے
گھر میں کوئی کام وغیرہ نہیں کیا تھا۔ ان کے بارے میں ان
کے بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر تم راشدہ سے ایک کپ چلے
بنوا لو گے تو یہ تمہاری بڑی کامیابی ہوگی۔ ان کے لیے مشہور
تھا کہ چلے تیار ہوئی میز پر رکھی ہے تو یہ اپنے کپ میں
نہیں بنائیں گی۔ کوئی ان کے والد صاحب یا والدہ بنا کر دیں گی؟“

راشدہ نے ساختہ ہنس کر بولیں۔
”کہہ دیجئے کہ والد صاحب نے لگا ڈالا تھا؟“

زیریں صاحب ایک دم زور سے ہنس پڑے۔
”جی ہاں بالکل اسی کو تو مجھے ٹھیک کرنا پڑا ہے اسے خیال
تاوری صاحب ان کے والد سائنس دان تھے۔ وہ بالکل
قلندر آدمی تھے۔ ان کے ہاں بیٹا دیر میں ہوا تو انہوں نے
بیٹی کو زیادہ تر اپنے ساتھ رکھا یہ ان کے ساتھ گھومنے پھرنے

جاتی تھیں چنانچہ ان کو گھر کے کسی کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ سب
کچھ شادی کے بعد کیا۔“

اس میں بہت عرصہ تجریوں کا گزرا۔ میں ان سے کہتا رہا تو مشرقی نازک سرخون دو عالم میری گردن پر
 ”اب تو صاحب یہ سب کچھ ہوتا بھی طرح کرتی ہیں پہلے
 ہر وقت کا نام ہو جاتی تھی۔ اب کا میا اب رہتی ہے۔“
 ”زیریں صاحب آپ کا کام ایسا ہے کہ لڑکیوں سے سچے لفظ
 رہتا ہے تو کبھی ایسا ہوا کہ باشندہ کو آپ پر شک ہوا ہو؟“
 چونکہ باشندہ چاہتے آئی تھیں اس لیے زیریں صاحب
 نے انھیں دیکھ کر سن کر کہا۔

”ہاں ہاں بالکل یہ بہت جلیس ہوتی ہے۔“
 باشندہ بے ساختہ بولیں۔

”اللہ کے غضب سے ڈر رہے تھے کہ پھر دیکھ کر کے
 اس قدر جھوٹ نہ بولے؟“ پھر وہ مجھ سے کہنے لگیں۔
 ”جیسی میرے ایک بہنوی ہیں انہوں نے زیریں صاحب
 کے بارے میں مجھے بہت خبر کیا میں نے ان سے ایک بات کہی
 کہ یہ صبح جاتے ہیں اور رات کو لوٹ کر آ جاتے ہیں مجھے اور
 کچھ نہیں چاہیے۔“

”اور جیسی کا جو یہ کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ میں بہت
 مصروف ہوں اور میرے بال بچھرے ہیں یا حال خراب ہے
 تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے فلاں کی بیوی کو دیکھا، فلاں خاتون کو
 دیکھا کتنی اسمارٹ ہیں کتنی دلی ڈرلڈ ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ نے دیکھا ہوگا تو انہوں کی سی دھڑکی سی بات ہے کہ ہر وقت
 جو بلیں گھٹے تو نہیں رہا جاسکتا کام ہوتا ہے مصروفیت ہوتی
 ہے تو میں یہ کہنے لگیں کہ جلیس ہوگئی ہو۔“ یہ مسلسل سچ کا پڑیگٹو
 کر کے میرے متعلق جو جی میں آتا ہے کہہ رہے ہیں۔“
 زیریں صاحب مسکرا کر اسے تھکے ہوئے لگے۔

”بچی بات تو یہ ہے کہ مذاق میں کبھی کوئی بات ہوتی ہو
 تو ہر سچ کچھ بھی نہیں جھگڑے کے لیے بھی وقت کی ضرورت ہوتی
 ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا۔ میں صبح سے شام تک
 مصروف رہتا ہوں۔“
 لاشدہ کہنے لگیں۔

”جی اب تھوڑے تھوڑے سچ پر آئے۔ ان کی مصروفیت
 کا خیال ہمارے بچوں نے بھی کیا ہے۔ ہمارے تینوں بچے چھٹی
 کے دن پیدا ہوئے تھے۔“
 زیریں صاحب کہنے لگے۔

”اصل میں کیونکہ بیش بڑی چیز ہے۔ میں ان سے سب باتیں

کر لیتا ہوں دن میں اگر کسی خاتون سے کوئی بات ہوتی ہے تو

میں آکر بتا دیتا ہوں کہ یہ بات ہوئی ہے۔ چنانچہ دوسری یا غلط بھی
 کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

لاشدہ صوفے کے پیچھے کھڑی تھیں۔ زیریں صاحب نے
 کہا، ”آجائیں آپ بیٹھ جائیں۔“

لاشدہ نے ہنس کر کہا، ”تھینک یو سر آپ نے اجازت
 دے دی میں تو در کی وجہ سے تھک کر کانپ رہی تھی۔“
 دو لوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

لاشدہ صوفے پر بیٹھ گئیں تو زیریں صاحب نے کہا۔
 ”اچھا دیکھ کر بیٹھے مجھ کو ریل گئی ہے۔“
 لاشدہ نے کہا۔

”میں نے دیکھی ہے بے دھیانی کا عالم نہیں ہے۔“
 میں دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں نے لاشدہ
 سے پوچھا۔

”آپ کو کبھی غلط نہیں ہوتی جب یہ ہر وقت ایجنڈا
 کے نوڈ میں ہوتے ہیں؟“

لاشدہ نے ہنس کر کہا، ”میں کہتی ہوں کہ خدا کے لیے
 کسی وقت تو چھوڑ دیا کریں۔ سننے میں آتا ہے یہ تھا ہمسکرا ہٹ
 کا اسٹائل یہ تھا۔ بیٹھے کا انداز یہ تھا۔ بات کرنے میں بیٹھتی تھی
 ہر وقت اسی موڈ میں نظر آتے ہیں۔“

لاشدہ بتا رہی تھیں ان کے چہرے پر ناگوار کی کاہل کا
 سایہ بھی نہ تھا۔

”اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہر وقت کا کم کیوں بولتی ہو
 زندگی کے ہر معاملے میں کا کم نہیں چلتا ہے زندگی کے ہر معاملے میں
 ایڈیٹری چلتی ہے۔“

میں نے سوالات کا سلسلہ جوڑا۔

”لباس کے انتخاب میں آپ رائے دیتے ہیں؟“

زیریں صاحب نے کہا۔

”بہت سخت رائے دیتا ہوں اور کبھی کبھی انتخاب بھی
 کرتا ہوں ان پر تھیں شلوار مجھے اچھی لگتی ہے۔“

”یہ بھی آپ کے لباس کے بارے میں رائے دیتی ہیں؟“

”گھر کے لباس کا انتخاب ہی کرتی ہیں۔ دفتر کے لباس

کا انتخاب کبھی یہ لیکن بیشتر دفتر کے لباس کا انتخاب میں خود کرتا

ہوں۔“

ان کے چھوٹے بیٹے رافے آکر ابو کی گود میں بیٹھ گئے۔

زیریں صاحب کہنے لگے۔

”صاحب آپ دیکھتے ہیں تینوں بچے مجھے زیادہ چاہتے ہیں

سے متعارف ہوئی۔ پھر زبیری صاحب باہر چلے گئے تھے، جرنلز میں ایم اے میں نے شرارت کیا ہے میسج ایک استاد تھے سعید صاحب انھوں نے کہا۔
 ”تم اتنے دنوں سے پڑھ لکھ رہی ہو، تم جرنلزم میں ایم اے کیوں نہیں کر لیتی؟“

میں نے کہا۔
 ”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“
 کہنے لگے۔ ”اتنا آسان بھی نہیں جیسا آپ کہہ رہی ہیں۔“

میں نے کہا۔
 ”میں بغیر پڑھے ایم اے کر سکتی ہوں۔ تو میں نے غیر سنجیدگی کے ساتھ والد صاحب سے چھپ کر بریویس کا امتحان دے دیا۔ اور میرے بغیر بہت اچھے آئے۔“
 ”چھپ کر کیوں؟“

ذرا اصل والد صاحب کی مرضی نہیں تھی وہ چاہتے تھے کہ میں پی ایچ ڈی کروں، اور پڑھ لکھ کر یونیورسٹی میں پروفیسر ہو جاؤں یا ریسرچ کروں، تو میں نے ان کی بہت ڈرتے ڈرتے کہا کہ میں نے بریویس پاس کر لیا ہے کل فائنل کا پیر ہے اور کل میری ملگنی ہے کیا کروں اباجان نے پہلے تو ڈانٹا لیکن پھر اجازت دے دی۔ لیکن بڑی مشکل سے چھپ کر سٹیپ کیا مگر منہ ہے طبعیت خراب ہے اس طرح جا کر میں امتحان دے کر آئی۔“

”آپ نے سائیکالوجی میں ریسرچ کیوں نہ کی؟“
 ”ایک تو میری فطرت میں لالچا بانی بن بہت تھا۔ دوسرے مجھے بہت سے تجربے کر کے کا بہت شوق تھا جس کی وجہ سے میں زبیری صاحب سے اکثر ڈانٹیں کھاتی رہتی ہوں۔ یعنی ایک وقت میں جا رہا میں سوچتی ہوں اور جا رہوں میں کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتی ہوں، کالج میں سائیکالوجی پڑھا، شروع کیا تو بہت جلد یونیورسٹی کی سادری عمر پڑھانا ہے یہ تو کوئی مزید بات نہ ہوئی پھر میں نے جلال اسپتال جوائن کر لیا، وہاں میں اسسٹنٹ ڈاکٹر کی پوسٹ پر تھی۔ لیکن وہاں کنونینس کا بہت پرال تھا، شام کو آتی تھی تو تھک کر گر جاتی تھی۔ تو اباجی نے کہا کہ اس طرح صحت خراب ہو جائے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ یونیورسٹی میں ریسرچ کرو۔ پھر میں یونیورسٹی چلی گئی۔ وہاں خاصا کام کیا۔ مگر اسی دوران پھر میری شادی کا چکر شروع ہو گیا۔ شادی کے بعد مجھے معلوم

داخل تو ایک دن کے لیے راشدہ کا نہیں ہوا کہتا ہے کہ میں ابوکا ہوں۔ تو میرے لیے یہ ہوتا ہے جب بہت ہی شدید بھولوں میں ماں کی ضرورت ہوتی ہے تو کہتی ہے ہم دونوں کے ہیں جن کہتے ہیں جب ابو دفتر چلے جائیں گے تو آپ کا ہو جاؤں گا۔“
 راشدہ نے تائید کی۔

”جی ہاں ہر ضرورت کے لیے امی یاد آتی ہے۔ ویسے کہتے ہیں۔ ابوکا ہوں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ میں بہت سخت ماں نہیں ہوں اور مجھے بہت سخت ماں ہونا چاہیئے؟“

زبیری صاحب کو جلدی جانا تھا میں نے انٹر ویو کا اعتقاد کیا
 انہوں نے راشدہ سے کہا کہ ”آپ گپ بکھول دیں مجھے چھٹی دے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“

راشدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں ورنہ دوسرا کچھ شروع ہو جائے گا۔“ زبیری صاحب نے خود اصل ہمارے ہاں جو رہا ہے وہ پسند نہیں ہے۔“

زبیری صاحب کے جانے کے بعد میں نے راشدہ سے گفتگو کا آغاز کیا۔ راشدہ زبیری کے والد افاضال قادری صاحب مشہور سائنسدان اور اسکالر تھے، جامعہ کراچی کے مقبول و ذہین پروفیسرز میں ان کا شمار ہوتا تھا۔
 میں نے راشدہ سے پوچھا۔

”آپ نے سائنس کا انتخاب نہیں کیا۔۔۔ رجحان نہیں تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔؟“

”نہیں میری طبعیت شروع سے بہت مختلف تھی میں چاہتی تھی کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں میری اپنی شخصیت کا اظہار ہو اس لئے میں نے سائیکالوجی کا انتخاب کیا یہ اصل میں سائنس بھی ہے اور آرٹس بھی۔“

”زبیری صاحب نے بھی پہلے نفسیات اور پھر صحافت میں ایم اے کیا۔ اور آپ نے بھی پہلے نفسیات اور پھر صحافت میں ایم اے کیا۔ تو زبیری صاحب سے ملنے کے بعد آپ نے صحافت میں ایم اے کیا۔؟“

یہ دونوں باتیں الحاقیہ ہیں۔ زبیری صاحب ایم اے کر کے چاہتے تھے تب میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئی اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ زبیری صاحب کون ہیں؟ میں نے تھرڈ ایر میں کالم لکھنا شروع کیا اس وقت میں زبیری صاحب

”ہو کہ زندگی کی حقیقتیں کیا ہوتی ہیں؟“
 ”سائنکالوجی کے متعلق عموماً لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی نجوم ٹائپ علم ہے۔ اور سائنکالوجسٹ، بمثل دیکھ کر سب کچھ بتا دیں گے۔“

”جی ہاں؛ لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں میں معاشی روزنامے میں نفسیاتی مسائل کے جواب دیتی ہوں تو ایک صاحب نے لکھا:

”میں رات کو خواب دیکھتی ہوں صبح بھول جاتی ہوں وہ خواب کیسے یاد کروں؟“

سائنکالوجی اصل میں انسانی شخصیت کو بڑھے کا، انسانی صلاحیتوں سے بہتر کام لینے کا علم ہے اور خاص طور پر لوگوں کو ایک نارمل زندگی اختیار کرنے کے بارے میں بتانے کا، اس میں یہ ہے کہ صرف نفسیات پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ تجربہ و مشاہدہ دلچسپی ہونی چاہئے۔ مجھے جنون کی حرکت نفسیات سے دلچسپی رہی ہے۔ اور نفسیات کا سارا لٹریچر پڑھا۔ میں بتاؤں دنیا کے ہر معاملے میں نفسیات کا تعلق ہوتا ہے۔

اس معاملے میں میرا کریر اس حرکت بڑھا کہ میں گھر کے دوسرے معاملات سے لا تعلق ہو گئی، شروع میں میرے لئے بہت پریشانی ہاتھی کہ کوئی صاحب گزر کر جا رہے ہیں تو میں ان کے بارے میں بتا سکوں کہ انھیں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے کس ڈیپارٹمنٹ کے ہوں گے۔ تو میرے بیشتر اندازے درست ہوتے تھے۔

”آپ نے کہا آپ ایک روزنامے میں نفسیاتی مسائل کے جواب دیتی ہیں تو عموماً کس قسم کے خطوط آتے ہیں ہماری خواہش کے نفسیاتی مسائل کیا ہیں؟“

”خوانین کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔
 لڑکیوں کے مسائل۔ اور
 خواتین کے مسائل

لڑکیوں کے بیشتر مسائل وہی ہیں، ہمارے معاشرے میں آج بھی لڑکیوں کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں مجھے خاص طور پر اس لئے بھی لکھتی ہیں کہ میں خاتون ہوں اور ان کے مسائل کو سمجھ سکتی ہوں، شادی لڑکیوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں یہ بہت سخت ہے خواتین کا مسئلہ ان کے شوہر ہیں، بچے ہیں۔ شوہران پر بڑے مظالم ڈھالتے ہیں میں ان کے بارے میں زیادہ لکھتی ہوں۔“

جی ہاں نفسیاتی مسائل کا سبب زیادہ تر معاشی حالات ہیں معاشی حالات کی وجہ سے بھی بہت سی لکھنیں پیدا ہوتی ہیں ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ مردوں کو ضرورت سے زیادہ مردانگی دکھانے کا شوق ہے کسی بچہ میں بہت سے براہل پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد جمعی کمیونیشن کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ اس بات کو اپنی لوہن سمجھتے ہیں کہ کسی معاملے میں بیوی سے مشورہ لیں یا اس سے باتیں کریں وہ بیوی کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ کسی مسئلے میں کسی بات میں اسے شریک کریں۔“

”نفسیات کے بارے میں جو کچھ کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا جاتا ہے وہ ہمارے ماحول میں فائدہ مند ہو سکتا ہے۔“ میں نے جس سال ایم اے کیا۔ میری خوش قسمتی سے ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ امریکہ سے بہت ایڈوکیٹ

سائنکالوجی پڑھ کر آئے تھے۔ ہمارے ہاں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ پڑائے ہوئے ہیں۔ ہمارے پروفیسر صاحب بالکل جدید سیکینک کا علم حاصل کر کے آئے تھے وہ ہمیں بمثل ہسپتال کے لے کر جاتے تھے۔ کس دکھاتے تھے ان سے ڈیل کرنا سکھاتے تھے۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارے اور باہر والوں کے مسائل میں کیا فرق ہے۔ ہمارے مسائل کیا ہیں



انہیں کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کا انحصار کچھ شوق اور تجربے پر بھی ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں، نفسیات زندگی کے ہر شعبے میں کام دیتی ہے۔ لیکن یہ روٹی نہیں دیتی۔ ”باہر نفسیات کے بہت سے ادارے ہیں۔ آپ کے خیال میں ہمارے ہاں ایسے ادارے قائم کئے جانے چاہئیں؟“

”مسل میں نفسیاتی پراپرلم ہائی سوسائٹی ولے زیادہ محسوس کرتے ہیں؟ نفسیاتی علاج بہت مہنگا پڑتا ہے تو اس کے لئے کوشش یہ کرنی چاہئے کہ نفسیاتی مسائل پیدا نہ ہوں۔ نفسیاتی مسائل کی روک تھام کے انسٹیٹیوٹ قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ کوننگ کے ادارے زیادہ ضروری ہیں جو کہ یہاں نہیں ہیں۔ مثلاً لوگوں کو صحیح مشورہ دینا، تعلیم میں، زندگی گزارنے میں شادی میں اور دوسرے مسائل میں رہنمائی کے ادارے کی ضرورت ہے۔“

”آپ کا ایسا کوئی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے؟“

”میرے ذہن میں اس کا ایک بڑا عجیب تصور ہے اور

شاید مجھے زندگی میں وقت ملایا موقع ملا۔ کوئی اچھا آدمی اس فیلڈ میں مجھے مل گیا جو میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو تو میں ایک لیبارٹری قائم کروں گی۔

رنگ، خوشبو، اور موسیقی۔

ان تین چیزوں کا انسانی شخصیت پر بہت اثر ہوتا ہے اس سچ میں جہاں دباؤ بہت زیادہ ہے ہماری ہوا میں آلودگی، تمکین ہے تو میرا ارادہ ہے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کروں جس سے انسان کے ذہن کو پرسکون کیا جاسکے۔

ایک آلہ ہے جس سے جھوٹ پکڑ سکتے ہیں میں چاہتی ہوں کہ اس آلے کو اس طرح استعمال کروں کہ رنگوں کے ساتھ تجربہ کروں، کہ کسی خاص رنگ کے یا خاص خوشبو کے استعمال سے ٹینشن میں مبتلا کسی آدمی کو کیسے پرسکون کیا جاسکتا ہے۔ میں ایسے تجربات کرنا چاہتی ہوں کہ آدمی بغیر ٹریکیولا نر ریڈیے پرسکون ہو جائے۔“

”تو مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟“

اس کے اثرات ایسے ہوتے ہیں کہ بہت سے لوگ سرد مزاج ہوتے ہیں اگر ایسے لوگوں کا بیڈروم کا اور ڈرائنگ روم کا رنگ سرخ ہو یا بہت شانگنگ سنڈر ہو تو لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو بہت گرم مزاج ہوتے ہیں ان کے بیڈروم میں اگر ہلکا نیلا یا نیلا یا نیلا یا نیلا رنگوں کا استعمال کیا جائے تو اعصاب پر اچھا اثر

ہوتا ہے۔ اگر خواتین کہ اس قسم کی ٹرننگ دی جائے تو وہ اپنے گھر میں مردوں کو پرسکون رکھ سکتی ہیں جو لوگ کسی اہم پیشے سے وابستہ ہیں ان کے لئے نامرل رہنا بہت ضروری ہے۔

مختلف خوشبوؤں کے اثرات بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ مثلاً رات کی رانی کی خوشبو کے باسے میں یہ ہے کہ راحسا کو شدید کر دیتی ہے یعنی اگر آدمی خوش ہو تو اس کے اثر سے بہت خوش ہو جائے گا۔ اور اگر عرصہ یا ٹینشن کی حالت میں ہو تو مزید عرصہ بڑھ جائے گا۔ اس طرح موتیا کی خوشبو ایک مسکون کا احساس دیتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں اس طرح کے انسٹیٹیوٹ ہونے چاہئیں جہاں ہم لوگوں کو صحیح مشورے دے سکیں۔

زیریں صاحب کی نیچر ہے وہ — جلد خوش اور غصے میں آجاتے ہیں اگر میں اس سچ میں کوئی سمجھ سکتی تو میرا خیال ہے کہ ایک سال میں ہماری آلودہ ماحول میں یہ ایسے کہ زیریں صاحب کو غصہ آتا تو تین منٹ کا ہے مگر وہ اتنا طوفانی ہوتا ہے کہ ناقابل برداشت ہوتا ہے لیکن میری صورت حال یہ ہوتی ہے کہ مجھے اس پر ہنسی آتی ہے اور میں ادھر ادھر منہ کر لیتی ہوں کہ اب مجھے مارا بیٹھیں گے اگر مجھے ہنسنے دیکھ لیا تو چنانچہ زیریں صاحب فوراً نامرل ہو جاتے ہیں۔

”تو اس طرح عملی زندگی میں آپ کو نفسیات سے فائدہ پہنچا؟“

”جی ہاں میں نے ساری زندگی میں نفسیات سے بہت سے فائدے حاصل کئے ہیں ہماری اردو واجی زندگی خدا کا شکر ہے کہ بہت کامیاب ہے حالانکہ ہماری شادی ہوئی تھی تو ان حالات میں کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ ہماری شادی کامیاب ہوگی۔ دراصل ہمارے حالات میں آٹھیس میں بہت زیادہ فرق تھا۔ میں سمجھتی ہوں میں اس وقت بہت زیادہ خوبصورت تھی کہی جاتی تھی۔ اب تو دس باہر برس میں حالات نے بہت تبدیل کر دیا ہے۔ ہر شخص منع کرتا تھا کہ شادی کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن میرا اپنا خیال تھا کہ جب تک زندگی میں جدوجہد نہ ہو اور آپ ہر چیز کو جیلج کے طور پر قبول نہ کریں تو زندگی میں کوئی مزا نہیں آتا۔“

”تو آپ نے لوگوں کے کہنے کی وجہ سے جیلج کے طور پر شادی کی تھی؟“

”نہیں لوگوں کے کہنے سننے کی بات نہیں تھی۔ بسر

انسان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ سچ بولتا ہو، اور منافق نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں جتنے بھی لوگ ملے ان میں زبیری صاحب انتہائی مخلص آدمی تھے اور میں ہزاروں افراد سے مل چکی ہوں۔“

میں اپنے والد کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ مجھے خواتین کے معاملات سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ الترمیال نے جسم خواتین کا بنادیا، دل و دماغ حضرات کا ڈالا میری سوچ کبھی بالکل اس طرح تھی۔ زبیری صاحب سے ملنے سے پہلے میں نے سن لیا تھا کہ بہت سخت آدمی ہیں مگر ان سے گفتگو صرف فون پر رہتی تھی، میں اخبار میں طلبہ کے صفحے پر ”فریاد کچھ ہو تو“ کے عنوان سے کالم لکھتی تھی۔ یہ ایسا طریقہ تھا، میرے ذہن میں ان کا تصور یہ تھا کہ بہت بڑھا بہت ہی پختہ بہت رعب داب والا شخص ہو گا۔ یہ یونیورسٹی میں بہت آتے رہتے تھے۔ جب میں ان سے مل تو مجھے ان سے مل کر بہت حیرت ہوئی اور میں نے دل میں سوچا کہ ان سے خواہ مخواہ عروب بھی، یہ تو بالکل مرغوب کرنے والی شخصیت نہیں۔ پھر جب یہ دوسرے اخبار میں جانے لگے تو ان کے اعزاز میں تقریب ہوئی اس میں میں نے ان کا ایک مزاحیہ خاکہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا اچھا میں اس کا جواب دوں گا۔ اس دوران ہم لوگوں کی تحریریں چلیں اور فیس کے بازیاں ہوتی رہیں۔ چار پانچ برس گزر گئے میں نے شادی کے بارے میں کبھی سوچیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ تمام لوگوں میں زبیری صاحب سب سے زیادہ مخلص اور دیانت دار ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ انتہائی بد مزاج آدمی ہیں۔

شادی سے پہلے مجھے خاندان میں بہت چاہت اور توجہ حاصل تھی۔ یونیورسٹی کی تمام تقاریر میں حصہ لیتی تھی میری زندگی کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوتی ہو، ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، اپنے تمام فیصلے مجھے خود کرنے ہوتے تھے تو ان حالات میں جب میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو زبیری صاحب نے بہت منع کیا۔

”زبیری صاحب نے منع کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”جی! ہاں اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ تم نے اب تک کہا نیوں نادلوں والی زندگی گزاری ہے اور تجھے اندازہ نہیں ہے کہ زندگی کی حقیقت کتنی تلخ ہوتی ہیں۔ مالی معاملات کیا ہوتے ہیں تم نے تو کبھی مالی معاملات کا نام بھی نہیں سنا، جب انھوں نے مجھے حد سے زیادہ روکا تو میں نے کہا۔

چھٹی حس

انسانی دماغ اور عقلانی دورہ مردہ انسان کے ہیماٹ
پھیلتی حس کا استعمال خوابوں کے باطنی اثرات و گمان

آپ کو پھر دکانا۔ قیمت ۶ روپے
ڈاک خرچ ۲ روپے

دنیا کے بہت گزیر علوم

پانچویں حصے کا کتاب کے نویں حصے کی
پانچویں حصے کا کتاب کے نویں حصے کی

قیمت ۸ روپے

ڈاک خرچ ۲ روپے

وچ کرافٹ

جادو کے بارے میں حقائق اور
ظہریے کہانی و مشہور اداس کے تعلق

خوفناک کالے علوم

علم اعداد مستقل شناسی
قیمت ۸ روپے۔ ڈاک خرچ ۲ روپے

آدی اور پراسرار علوم

جانشناسی اور علم ہنسی کا
خال، آرتھو پال و دیگر کائنات کی
قیمت ۸ روپے۔ ڈاک خرچ ۲ روپے

آئینہ اور سائے

شائے جمیل کی کہانیوں سے انتخاب

قیمت ۸ روپے

ڈاک خرچ ۲ روپے

پانچویں کتاب ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ ہمارے نامہ
شفیع برادرز، پوسٹ بکس ۵۸۶ کراچی۔



”نہیں میرا خیال یہ ہے کہ میری زندگی کافی کامیاب ہوگی کہ لوگ اس پر رشک کریں گے۔“
 ”تو شادی کے بعد ایڈجسٹمنٹ میں آپ کو کوئی دشواری

ہوئی؟“

”پہلی نظر میں یوں لگا کہ جو لوگ کہتے تھے وہ سچ ہے کہ طبیعت مختلف مزاج مختلف انداز مختلف رہائش مختلف پھر شدید معاشی مسائل تو اس دوران زبیری صاحبہ کو سب سے ڈیپر پریس ہونے لگے۔ تو میں نے ان سے کہا۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ آدمی جب اپنی کشتیاں جلا دیتا ہے تو زیادہ مضبوط ہوتا ہے میں تو یہ سب پتہ تھا کہ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہیں۔ آپ اس کی قطعاً فکر نہ کریں کہ میں کسی بھی حالات میں نہ ہمت نہ ہوس کر دوں گی اور نہ دوسروں کو محسوس ہونے دوں گی۔“

زبیری صاحبہ کہتے تھے کہ تم نے تو کبھی مسئلہ نہیں دیکھا ہے کہ

”ہاں خراب ہو جائیں گے۔ میں نے کہا۔“ ہو جائیں گے جب زندگی میں آئے ہیں تو کبھی کچھ ہوگا۔ پھر ہمارے ہاں ایک لڑکی ہوئی تو میں نے کہا۔

”ہمارا اپنا گھر ہونا چاہیے۔“

زبیری صاحبہ ٹیلی کو سپورٹ کرتے تھے ان کی تنخواہ بہت کم تھی، لیکن ہم نے پلاننگ کی اور گھر بنا لیا۔ اس میں زبیری صاحبہ کا بڑا کردار بیوشن میں ہے کہ انھوں نے اس بات کو بڑی اچھی طرح فہم کیا کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں ان کی خوشنودی کے لئے کر رہی ہوں۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اس معاملے میں بڑی خوش قسمت ہوں کہ مجھے ہسٹری بہت اچھی ملی۔ میری ساس مجھے بہت چاہتی ہیں۔ اور انھوں نے اپنی دوسری بیویوں کے مقابلے میں میرے پاس رہنا پسند اور مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں، انھوں نے ریشٹا رز کر لیا ہے کہ میں ان کے لئے اچھے جذبات رکھتی ہوں۔“

”کالم لکھنے میں ایسا ہوا ہے کہ کسی پر لکھا تو اس نے بہت جبر مانا یا؟“

”جی ہاں بہت زیادہ لوگوں نے بہت بھڑک کر سب سے بڑے گالیوں کے خطوط لکھے۔ میں نے تو زیور کی کئی شخصیات پر اپنے رشتے داروں پر حتیٰ کہ اپنے والد صاحب کے بھی کئی خاکے لکھے جن کے بارے میں کوئی نہیں کھ سکنا تھا۔ دراصل اس طرح لوگوں کے خوف کی آزمائش ہو جاتی ہے کہ کون کس حد تک برداشت کر سکتا ہے۔ زبیری صاحب برہم کی کالم لکھے تو زبیری صاحب کہتے تھے۔ جی دُنیا میں منہ دکھانے کے قابل چھوڑ دو گی یا نہیں بہت سال پہلے جب ہم لوگوں میں کوئی لڑائی ہوئی تھی تو میں اکثر جملے لکھ دیتی تھی۔ لیکن زبیری صاحب ہمیشہ اُجھلنے کرتے ہیں بہت تعریف کرتے ہیں بس وہ یہ چاہتے

ہیں ہمارے جواب دینے دلچسپ معاملات میں یہ کسی تک نہ پہنچیں جبکہ میرا خیال ہے کہ تم صحافی ہیں ہم لوگوں کی زندگی لکھنے کی طرح ہونی چاہئے کھلی ہوئی کتاب کی طرح کیونکہ لوگ اسی سے سیکھتے ہیں“

”کالم لکھنے سے پہلے موضوع سوچ لیتی ہیں یا لکھنا شروع کر دیا تو بات سے بات نکلتی چلی گئی۔“

”عموماً یہ ہوتا ہے کہ اخبار میں کوئی خبر اہل کرتی ہے اور تقریباً روز کوئی نہ کوئی خبر مل جاتی ہے بلکہ روز کسی کئی خبریں ہوتی ہیں فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کس خبر پر لکھنا جائے۔“

”زبیری صاحب نے کہا شادی کے بعد آپ اچھا لکھنے لگی ہیں۔ تو آپ کی کالم نگاری میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟“

”یہ زبیری صاحب کہتے رہتے ہیں کہ پہلے تھی تمہاری نیچر تھی لا آبائی انداز سے لکھی تھیں اب منظر انداز سے لکھتی ہو۔“

”زبیری صاحب لکھتے ہیں آپ کی کوئی مذکر کرتے ہیں؟“

”جی ہاں وہ میرے کالم پڑھتے ہیں نفسیاتی مسائل کے جوابات پڑھتے ہیں اور بہت سخت تنقید کرتے ہیں ان کی سخت اور بے رحمتہ تنقید سے مجھے یہ مدد ملتی ہے کہ میں نہیں جلانے کے لئے بہتر سے بہتر لکھتی ہوں“

”آپ کے پسندیدہ کالم نگار کون ہیں؟“

”مجھے یہ تو بتانا بہت مشکل ہے۔ خواتین کالم نگار تو بہت کم ہیں کس کس نام لوں دوسرے ناراض ہو جائیں گے، ویسے انہی انشا بہت پسند ہیں۔ وہ واحد آدمی ہیں جو مجھے بہت

”آپ مشر کہ خاندان نظام کی قابل ہیں؟“

”جی ہاں! بالکل میں لوگوں کو مشورہ دیتی ہوں کہ زندگی زندگی بہت اچھی ہے تو میری زندگی بھی اچھی ہونی چاہئے زبیری صاحب کے ہاں شادیاں خاندان میں ہوتی تھیں میں باز سے آئی تھی۔ ان کی دونوں بھیا بھیا خاندان کی تھیں اور خواتین کے لحاظ سے کامیاب تھیں۔ میں تو خود کو خواتین میں شمار ہی نہیں کرتی تھی، میں لا پڑاہ اپنے آپ میں ممکن ان کے ہاں سب نظم و ضبط کے قابل یعنی زندگی میں غلوں، لگن اور نیک نیتی بڑی چیز ہے۔“

”کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کی شادی زبیری صاحب سے نہ ہوئی ہو؟“

”زبیری صاحب کو جب میں نے دیکھا تھا تو بے انتہا خلص اور سچے آدمی لگتے تھے، میں نے سوچا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ زندگی گزارنا ہے تو بہت مشکل زندگی ہوگی لیکن بہت اچھی بھر پور اور خوب صورت۔ شادی کے بعد مجھے کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ میرا فیصلہ غلط تھا زبیری صاحب نے مجھے اتنا غلوں دیا کہ میں اس قسم کی باتیں سوچ ہی نہیں سکتی۔ وہ بڑے بہت ہیں مجھے بہت چھوڑتے ہیں۔ دراصل زبیری صاحب مجھے غصہ دلا کر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“

”آپ کو غصہ آتا ہے تو کیا کرتی ہیں؟“

”میں چھوڑ کر اٹھیں دیکھتی ہوں یا کبھی کبھی دلنا شروع کر دیتی ہوں۔ میں بھی انھیں احساس دلاتی ہوں کہ وہ قابل کوئی دانشور نہیں ہے۔“

”اچھا! سند یہ بتائیے گھر کی اتنی قمتے دار یوں کے ساتھ آپ دوسرے کاموں کے لئے وقت کیسے نکال لیتی ہیں؟“

”میرے سلسلے میں بوقت ایک چیز رہتا ہے مجھے باغبانی کا بہت شوق ہے گھروں کے سارے پودے میں نے خود لگائے ہیں پودے پھول بہت اچھے لگتے ہیں لکھنے پڑھنے کا کام بن رات کو کرتی ہوں۔“

”کالم لکھنے کا سلسلہ کب شروع کیا؟“

”یہ میں نے ۱۹۹۸ء میں شروع کیا۔“

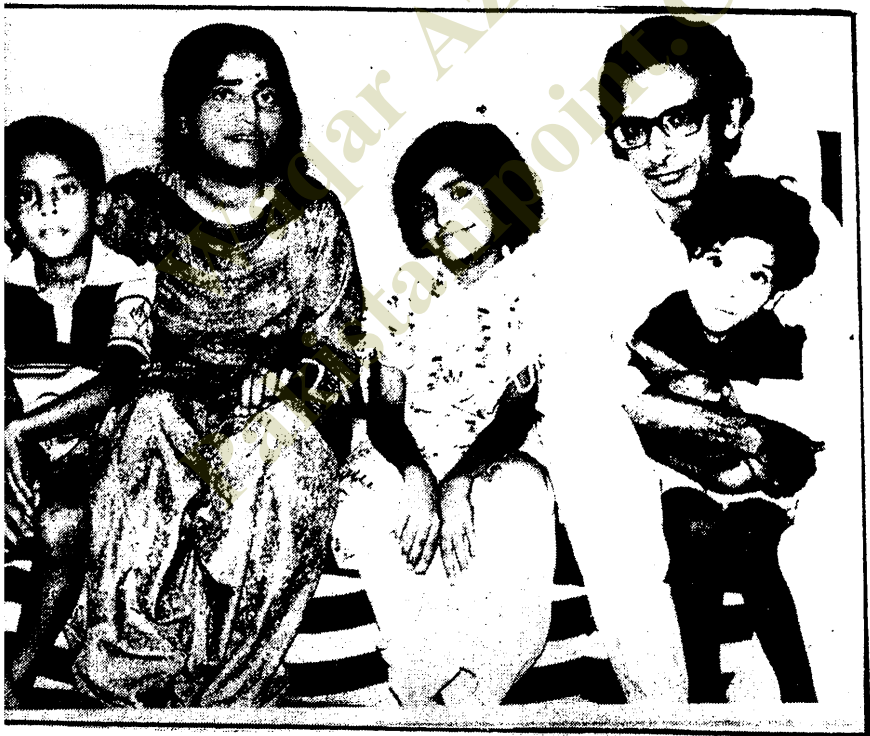
”کبھی ایسا بھی ہوا کہ کالم لکھتا ہے لیکن موڈ نہیں ہے؟“

”نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا، کیونکہ بقول زبیری صاحب ”میں اچھے پیچھے کالم لکھتی رہتی ہوں۔ کالم میں اس طرح سعی ہوں کہ جسے کھانا کھا لیا پانی پی لیا۔“

نہیں لوٹے۔“ چائے پی کر میں نے راشدہ کو خدا حافظ کہا وہ گھٹ تک چھوڑنے آئیں۔ اس دوران بھی وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ زبیری صاحب کو دیر ہوگئی ہے، اب تک نہیں آئے۔
آتے ہوئے میں سچ رہی تھی کہ دل میں محبت اور خلوص اور لگن ہوتی کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

پسند ہیں۔“ اور مشاغل کیا ہیں؟“
باغبانی کا شوق ہے پودوں اور پھولوں سے دلچسپی پڑھے کا بہت شوق ہے شاعری سے بہت لگاؤ ہے انکار میں مزاحیہ ٹاپ کے مضامین لکھتے ہیں ریڈیو پر ڈرامے لکھتے۔
”ٹی وی کے لئے کچھ نہیں لکھا ہے“
”ٹی وی کے ان لوگوں نے کہا لیکن اب تک ٹی وی کے لئے لکھا کچھ نہیں میرا ارادہ ہے لکھنے کا دراصل مجھے وقت نہیں ملتا۔“

ہمیں باتیں کرتے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی، میں نے راشدہ سے اجازت چاہی تو انھوں نے کہا ایک پیالہ چائے اور پی لیں میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“ راشدہ فارمنڈ ہیں کہ زبیری صاحب کو گئے ہوئے کافی دیر ہوچکی ہے ابھی تک



راہِ گزشتہ ہے

لبیٰ غزل



سید اور سبقت ہو ایسے اس کے جسم کی رگ رگ کا ہر جاپ کی تھیں۔ اس کا ریشہ ریشہ مجھ پر کیا تھا لیکن وہ پھر بھی ان سنسناتی ہواؤں کا مقابلاً کر رہا تھا۔ آج وہ اپنا وجود کسی بھی ظالم شے کے حوالے کر دیتا تو بھی اسے اتنا ڈھکے نہ ہوتا۔ کچھ نہ سمجھ کر زبان کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ کاری ہو تا ہے۔ دھڑ تیر، قدم اٹھانا، ناخانی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جانے کہاں جانا تھا اسے۔ قدم جہاں لے جا رہے تھے اُدھر ہی جھاگ جا رہا تھا اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ تیز اور سرد ہوا میں اس کے جسم کا سارا ہونچر کر رہی تھیں۔ مگر اس کے جسم میں تو جیسے آگ دھب لگی تھی۔ اس کی روح کے انگاروں کی نذر ہونے لگی تھی۔ اس کے کانوں میں اس کے باپ کے الفاظ بھر سیدھ بن کر اترنے لگے تھے۔

”نکل جا میرے گھر سے۔ تم جیسے نالائق اور بے حس انسان کے لئے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ باپ کی عزت نہ کرنے والے اور وطن دینے والے بیٹے کے لئے میں باپ کہلانا اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں۔ میرے گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔“ ابا جان بہت زور سے کہہ رہے تھے۔

”میں بھی اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔“ وہ تو تھا ہی غصے کا تیز فوراً گھر سے نکلے کو تیار ہو گیا۔

”آئندہ اگر تم نے اس گھر میں قدم رکھا تو وہ میرا ہتھارا آخری دن ہوگا۔“ ابا جان پھر بولے۔

”میں بھی آپ کو اپنی شکل دکھانا پسند نہیں کروں گا۔“ فیصل نے اپنا منہ وری سامان لئے بغیر ہی قدم گھر سے باہر نکال دیئے۔

”فیصل فیصل!“ اُمی اس کے پیچھے لگیں۔

”ٹوک جاؤ بیٹا!“ ان کی آواز ڈوب گئی۔

”اگر تم نے اسے روکا تو تم بھی اس گھر سے نکل جاؤ۔“ ابا جان نے آخری تجربہ استعمال کیا تو اُمی اپنے ذہن سے دل کو سنبھال کر اُٹھ آئیں۔

”جانے کہاں جائے گا۔“ اس کی بدتریزی کے باوجود ان کا دل اس کے لئے بیٹاب تھا۔ آخر ماں جو تھیں۔

”جہنم میں جائے۔ میرے لئے اب وہ جگہ ہے۔“ ابا جان نے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

”ابا جان روز ہی فیصل کو گھر سے نکالنے کی دھکیں دیتے تھے۔ آخر ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔“ ثمنینہ بولی۔

فرح بے تحاشہ روتی ہوئی اُمی کو سنبھال رہی تھی۔ فیصل تو بچپن سے ہی اپنے باپ کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ وہ بچپن سے ہی پڑھائی کے معاملے میں پچھست تھا۔

کچھ اس کا ذہن کمزور تھا اور کچھ زیادتیوں نے اس کا مہمان پڑھائی سے بالکل ہٹا دیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے سب کی ڈانٹ سننا پڑتی تھی۔ پھر پھر روجہ نہ ملنے کے باعث اور ہر وقت کی ڈانٹ بھٹکار نے اسے ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ کسی طرح اس نے میٹرک تو کر لی تھی مگر بڑے بھائیوں کی طرح اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ وہ تو اپنی اپنی نوکریوں میں مگن تھے اور باپ کے ہاتھ پر پسیہ لاکر رکھ رہے تھے۔

فیصل جو کچھ لے کر تھا اور تھوڑا کتناخ اور غصے کا تیز بھی اس لئے آج ہی ہر وقت اس کے ساتھ زیادتیاں کرتے نہ دھکتے تھے۔ گھر کے اس ماحول سے گھر کر وہ اکثر باہر رہنے لگا تھا۔ ٹھکانا کھانے کے وقت گھر آتا تو پھر آبا کی وہی طنز بھری ڈانٹ اس کی منتظر ہوتی۔

”تم مجھے صاحبزادے نوکری کیسے سارا دن کے نکلے ہوئے ہو اپنی ماں سے کہو کہ ہتھارے لئے مرغ پلاؤ گے رکے؟“ اُمی اس کے لئے کھانا نکال کر رکھتیں تو آبا کی یہ بات سن کر ان کے ہاتھ کانپ جاتے۔

”مے کھانا تو کھا لینے دیں۔“ وہ کہتیں۔

”ہتھاری اس غلط حالت نے اس کا دماغ اور خراب کر دیا ہے۔“ سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کی پرواہ نہیں۔ آخر ساری زندگی تو باپ اور بھائیوں کے بل بوتے پر نہیں گزارنی مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔“ ابا کی گرم ہو گئے تھے۔

اور

”اُمی کو تیرے بھائی کے جلا کر کس وقت فیصل گھر سے باہر نکل گیا تھا۔“ ثمنینہ بیٹی دیکھنا فیصل کہاں گیا ہے؟“ اُمی نے غصے کو آواز دی۔

”اُمی! فیصل بھائی تو چلے گئے ہیں۔“ ثمنینہ بولی۔

”کہاں؟“ ان کا دل ڈوب اٹھا۔

”باہر گئے ہیں شاید۔“ ثمنینہ نے جواب دیا۔

”آوارہ گردی کرنے نکل گیا ہوگا پھر۔“ ابا کی بولے۔

”اُمی نے کھانا دیا اسے رکھ دیا اور خود اٹھ کر آئیں۔“

”فیصل بیٹا تم ہی راہ راست پر آ جاؤ۔“ وعاما مگنے مانگے اور کی چلوں کے کنارے بھیجنے لگے تھے۔

رات کو پھر فیصل دیر سے گھر لوٹا تھا اور کھانا کھا کر بغیر ہی سو گیا۔ ناشتہ پر سب ہی بیٹھے تھے اور مصروف گفت گوتھے۔ اُمی ر چھٹی تھی اس لئے سب میں گھر پر تھے۔ فیصل بھی اٹھ کر آ گیا۔ وہ دوا آیا تو فرح نے اسے اپنی جگہ دے دی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ ابا کی نے اس سے پوچھا۔

”میں تخت پر بیٹھ جاؤں گی آبا جی۔ یہاں فیصل بھائی کو
 بیٹھنے دیں نا ورنہ وہ کھڑے رہیں گے“ وہ بولی
 ”فیصل اتنی اہم شخصیت نہیں ہے۔“ آبا جی بولے۔
 ”امی نے ہی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔“ عادل بھائی
 نے کہا تو فیصل کے چہرے پر پھر کھٹکتی چھا گئی۔
 ”امی۔ کیا میرے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے؟“
 ”ہاں نہیں ہے کوئی جگہ جو کہا کر لائے گا وہ اس گھر میں
 ہے گا۔“ آبا جی کی آواز میں کوئی شفقت نہ تھی۔
 ”تو پھر آپ شینہ اور فرخ کو بھی گھر سے نکال دیں وہ بھی
 تو نہیں کماتی ہیں۔“ اس کا اچھوٹا بھتیجہ تھا۔

”یکو اس بند کرو۔ دن بدن گشت ہوتے جا رہے ہو۔
 سن رہی ہو تم اپنے لاڈلے کی بکواس۔“ شینہ اور فرخ
 سہاے پر نہیں بیٹھی ہوئیں۔ تم انہیں سے بھی کیا کہتے ہو؟“
 آبا جی نے اپنے غصے کی لپیٹ میں امی کو بھی لے ڈالا۔
 ”ایک تلاش اور ریکارڈ بھائی انہیں دے بھی کیا سکتا ہے؟
 اگر تھے ہی غیرت مند ہو تو نوکری کرو بہنوں کا جو کچھ ٹھاؤ“
 کڑوں کا نوکری اور اب اس گھر میں اسی وقت داخل
 ہوں گا جب نوکری کروں گا۔“ وہ وہاں سے اٹھ گیا۔
 ”بیٹا ناشتہ تو کرو تم نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا
 اتنی پھر منٹا کے ہاتھوں مجھ پر ہوکروا۔“
 ”امی جانے دو! اسے باہر نکل کر دیکھ ذرا کٹے وال کا
 بھوا و معلوم ہو جائے گا۔“ سہیل بھی پیچھے نہ رہا۔
 ”میشک پاس کو کوئی نوکری دے گا۔ کہیں مزدوری
 کی کرنا اور تیر کوٹنا۔“ آبا جی نے اس کے جاتے جاتے بھی شتر
 لگایا۔ امی اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔

”بیٹا آخر تم ہی ایسی باتیں کرنا چھوڑ دو“ وہ سمجھانے لگیں۔
 ”امی آخر میں نے کیا بگاڑا ہے۔ مجھے جس جرم کی سزا مل
 رہی ہے۔ میں صرف زیادہ پڑھنے سے کا، ان کی طرح کیا نہیں
 سکتا۔“ انھوں نے کب مجھ سے جنت کی بات کی ہے کہیں
 دن مجھے شفقت سے پاس بلا رہے۔ مجھے تو اس گھر سے ہمیشہ
 دھٹکارا گیا۔ پھر مجھ سے آپ یہ کیوں توقع رکھتے ہیں۔“ وہ بکھڑا ہوا تھا۔
 ”میں یہ بھی بدواشت نہیں کر سکتا کہ تم مہفت کی روٹیاں
 توڑو۔“ آبا جی پھر بولے۔

”میشک ہے اب میں اس گھر کی روٹیاں نہیں توڑوں گا۔
 وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ امی روٹی رہ گئیں۔ شینہ اور فرخ اس
 ہوئی تھیں۔ آبا جی کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا رہا تھا اسی

لئے وہ بھی ان کے ساتھ اس بدیہیزی سے پیش آتا تھا۔
 ”جہاں اسے سلامت ہے۔“ اتنی ہر خاز کے بعد اس کے
 لئے یہی دعا مانگتیں۔

بین چار ماہ بعد وہ گھر واپس آیا۔ اس دوران گھر میں
 بہت تبدیلیاں آچکی تھیں۔ عادل بھائی اور سہیل کے بعد دیگرے
 جتدہ اور ریاض چلے گئے تھے اور وہاں سے ریاں لگا کر بھیج
 رہے تھے۔ ہزاروں ریاں کے سامنے اس کے چند سو روپے
 کیا اہمیت رکھتے۔

وہ مٹھائی لے کر گھر میں آیا تھا۔
 ”تم کس کے پاس آئے ہو؟“ آتے ہی اسے آبا جی کے
 سخت لہجے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر اب کے قدم دنگا کے نہیں
 وہ قبضوٹی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔
 ”میں بس مایاں کے پاس آیا ہوں۔“
 ”کیوں؟“

”یہ بتانے کے لئے کہ مجھے نوکری مل گئی ہے اور آج
 پہلی تنخواہ لے کر آیا ہوں۔“

”بہت خوب۔ تو اب صاف جڑا دے کمانے لگے۔“ آبا جی
 کی مسکراہٹوں میں بھی طنز کے تیر چھپے تھے۔ فیصل کے ماتھے پر
 شکلیں سی پڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا آبا جی کے دل سے اس نفرت
 کو کس طرح مٹائے۔ وہ ابھی پہلی ہی دیوار گرانے آیا تھا مگر یہاں
 لگ رہا تھا کہ اب کئی دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جن کے سامنے
 بیٹھ کر وہ روز نو سکا ہے مگر ان فاصلوں کو ختم نہیں کر سکتا۔

”شینہ، فرخ یہاں آؤ اور اپنی اتنی کو بھی بلاؤ۔“ آبا جی نے
 ان سب کو آواز دی۔ شینہ اور فرخ فوراً دوڑی آئیں۔
 ”کیا ہوا اب جی؟“ وہ اچھی دواڑے میں ہی بیٹھ کر چوک سی
 گئیں۔

”فیصل بھائی آپ!“ وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔
 ”امی بھی ان کی آواز سن کر آگئی تھیں۔“

”فیصل بیٹا! اسے دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔“ فرخ
 جاکر بیٹے کو گلے لگا کر بے تحاشا سیر کیا۔

”تو کہاں چلا گیا تھا میرے نعل!“
 ”اتنی میں نے کہا تھا نا اس گھر میں اس وقت قدم رکھو
 جب کم کر لاؤں گا۔“

بہت کم کر لایا ہے تمہارا بیٹا! آبا جی پھر بولے مگر فیصل
 نے ان کی بات کا نوٹ نہ لیا۔

”امی یہ میری پہلی تنخواہ ہے۔ ہے تو بہت کم مگر محنت

کروں گا تو زیادہ کماؤں گا۔ ابھی تو رکھیں یہ۔“ اس نے سات سو روپے ہاں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”بس یہی کما کر لائے ہوتے مہینوں میں؟“ اباجی نے گہرے طنز کے ساتھ اس معمولی سی رقم کو دیکھا۔

”جتنی میری حیثیت ہے اتنی ہی دوں گا کسی کو، فیصلہ میرا جھکا کر بولا۔“

”تم کسی کو دے ہی کیا سکتے ہو، میریک پاس کو ہزاروں کی نوکری تو مل نہیں سکتی بہت عرصے کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ اب یہ معمولی سی رقم ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دی ہے۔ ذرا عادل کی طرف دیکھو مجھے فخر ہے عادل پر جو ہر مہینے ماں شاد اندر پانچ ہزار ریال کما رہا ہے اور مجھے پانچ ہزار کا چیک بھی بھیج رہا ہے۔“ اباجی نے بہت زعم سے عادل بھائی کے بارے میں کہا۔

”ان کی کمائی آپ ہی کو مبارک ہو۔ آپ مجھے بار بار ان کا طعنہ منت دیا کریں۔“

”اس کی کمائی پر مجھے فخر ہے۔ سات سو روپے کم کلاس کی برابری کرنے چلا ہے۔ راجا واپسی یہ کمائی نہیں ضرورت ہے اس کی۔“ اباجی عادل بھائی کی شان میں شاید اس کی ریگستانجی برداشت نہ کر سکے۔

”میں یہ اپنی ماں کے لئے لے کر آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔
”بٹیا تم نے اپنے لئے بھی کچھ رکھا ہے؟“ امی نے پوچھا۔
”آپ میری فکر نہ کریں۔“

”بٹیا جب تک تم اس میں سے اپنے لئے کچھ نہیں کھو گے تو میں بھی نہیں لوں گی۔“

”امی، اگر آپ کا اصرار ہے تو میں یہ لے لیتا ہوں اُس نے ایک سو کا نوٹ اُٹھا لیا۔

”یہ بھی رکھ لو،“ امی نے ایک اور سو کا نوٹ رکھ دیا اُس کی بیٹھیلی پر۔

”پہلی بار تنخواہ لے کر آئے ہو تو کم از کم مہنتوں کے لئے کچھ لے آئے۔“ اباجی پھر بولے۔

اس نے ساری تنخواہ تو لا کر مجھے دے دی ہے، امی بولیں۔
”میں اگلی تنخواہ میں سے لے کر آؤں گا آپ سب کے لئے کچھ نہ بچھا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے تمہاری چیزیں۔“ اباجی نے سختی سے منع کیا۔

”مانا کہ میں عادل بھائی جیسا نہیں کما سکتا مگر جو بھی کماؤں گا آپ لوگوں کو سہی لا کر دوں گا۔“

”میں نے کہا نا مجھے تمہاری کمائی کی ضرورت نہیں! مگر کیوں کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں! وہ جو حاصل

مٹانے آیا تھا اتنے اباجی شاید خشم کرنا نہیں جانتے تھے۔
”مجھے سنبھالنے اور میرا خیال رکھنے کے لئے میرا ایک

بھی بیٹا کافی ہے جس نے تمام زندگی میرا خیال رکھا ہے۔ تم لوگوں نے مجھے کیا دیا ہے۔“

”اگر آپ یہی سمجھتے ہیں تو پھر ایک دن آپ ہماری محبت کے لئے ترسیں گے۔“ فیصل بہت دیر سے برداشت کر رہا تھا۔
”مجھے تمہارے لئے ترسنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ عادل بھائی کی محبت نہیں ان کے دیال بول رہے ہیں اگر میں بھی آج آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار روپیہ لا کر رکھ دوں تو شاید آپ مجھے گھر سے نہ نکالیں۔ مگر میں اب یہاں رہنا بھی نہیں چاہتا۔

جہاں آپ کو میری نہیں صرف عادل بھائی کی ضرورت ہے۔“
”میں کیا شک ہے۔ یہ گھر تو اسی کا ہے۔ اسی نے

تم سب کو سہارا دیا ہے۔ سنبھالا ہے۔ تم لوگ اپنے لئے کیا کر سکتے ہو۔ آج سات سو روپے لے کر لائے ہو تو مجھے طعنہ دیتے ہو۔ اس کے گھر میں بیٹھ کر اسی کو برا کہتے ہو نکل جاؤ یہاں سے

میں اس کے بارے میں تمہاری یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اباجی اس کی بات سن کر

بھڑک اٹھے تھے۔
فیصل بیٹا اتنے مہنتوں اور گھر میں کئے ہو اور اب جلنے

کی بات کر رہے ہو! امی کا دل ڈوبنے لگا تھا۔
”امی یہ گھر سہارا نہیں ہے؟“

”ہاں اس گھر کی سی نالافی کا حق نہیں ہے۔ اگر اتنی ہی مہنتیں اپنی خودداری و عزت سے تو بنا لو اپنا محل!“

”خدا نے جہاں بہت جلد اپنا محل بناؤں گا مگر اس گھر کو اپنی صورت نہیں دکھناؤں گا۔ آپ کے بیٹے کی کمائی اور گھر آپ

کو مبارک ہو۔“ فیصل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان کشمکش دیکھ کر شمیم اور فرخ چپ ہو کر کھڑی تھیں مگر

امی چپ نہ رہ سکیں۔
جب بھی وہ گھر میں آتا ہے آپ اس کے ساتھ میری بیوی

رکھتے ہیں سمجھی تو اس سے پیار سے بات کی ہوتی۔ آج نے عرصہ بجا گھر میں آیا ہے۔ پہلی تنخواہ لے کر آیا ہے۔ آپ نے کچھ تو زری کا

برتاؤ کیا ہونا۔ آپ کو تو جانے اس سے خدا واسطے کا میرے۔“
”بہت بڑی تنخواہ لے کر آیا ہے حواس لگے نکلاؤں بیٹا

کروں۔ اگر کسی قابل ہوتا تو کسی اچھے گریڈ پر نوکری کرتا۔ امی غرل

جانے کے بعد اب نوکری کا خیال آیا ہے۔ تہاڑی غلط حمایت نے اس کا دماغ خراب کیا ہے۔ اس سے کہہ دو چلا جائے بیگم گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

”آپ عادل بھائی کی کمائی پر اتنا گھنڈ نہ کریں۔ وہ اصل کرتے ہوں گے تو آپ پر انھوں نے پیدا ہوتے ہی کمائی شروع نہیں کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے محنت کر کے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔ خدا نے چاہا تو مجھے ان جیسا مقام ملے گا مگر میں اب آپ کو اپنی شکل بھی نہیں دکھاؤں گا۔ اس نے باہر جانے کے لئے اپنے قدم ڈھکادیئے۔

”بشارت جاؤ۔“ امی اس کی طرف پکیں۔

”جانے دو لے ورنہ تم بھی اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں اس گھر میں اب اس گستاخ کا جو دردداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آج کے بعد تم نے اس گھر میں قدم رکھا تو وہ میرا بھٹا آخری دن ہوگا۔“ اباجی نے اسے اپنا آخری فیصلہ سنادیا تھا۔

اور

وہ بھی ان کے اس آخری فیصلے کو قبول کر کے گھر سے نکل گیا۔

باہر بارش اور طوفان کی شدت سختی اور اندامی کے آسٹھوں کا سیلاب نہ ختم رہا تھا۔ جب سے فیصل لگایا تھا گھر کی ہفتا بہت بوجھل بوجھل سی تھی۔ شبینہ اور فرح بھی خاموش اور پریشان تھیں کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ امی اس وقت سے رو رہی تھیں اور جب سے موسم خراب ہوا تھا، بارش شروع ہوئی تھی اتنی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔

”جیسے کہاں ہوگا وہ اتنی بارش اور طوفان میں اس نے پناہ لی ہوگی۔ میں کس سے کہوں کہ اس کو ڈھونڈ کر لائے۔“ امی جان رو رو کر کہہ رہی تھیں۔

”اباجی کو تو ان کے ساتھ یہ رو بہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ فیصل بھائی تو ہیں بھی بہت جذباتی۔“ اباجی نے ہنسی مویج سمجھ سے کام لیا ہوتا۔ ”شبینہ کو بھی بہت غصہ تھا۔“

”آج کل لوگ اولاد میں بھی فرق کرنے لگے ہیں۔ سب جھوٹ سے کہہ کر اولاد برابر ہوتی ہے، صرف پیسے کی اہمیت ہو۔ اگر آج عادل بھائی کو انٹرمیڈیاٹ نے اتنا پیسہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دوسروں کو گھر سے نکال باہر کریں۔ آج پہنچ گیا کہ اباجی کی نگاہ میں پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ غرض نہ بھی دل کی بھرپور اس نکالی۔

”اب ان باتوں کے سوچنے سے کیا فائدہ پڑے نہیں وہ کہاں جھٹک رہا ہوگا۔“ امی پھر بولیں۔

”امی اب بس کرویں۔ اباجی نے آپ کو اس طرح روتے دیکھا تو شاید وہ بھی ابھی گھر سے نکال دیں۔“ شبینہ نے مان کو سنبھالا۔

اسی وقت اباجی اندر آئے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بارش میں بھیسکتے ہوئے آئے تھے۔

”اباجی آپ فیصل بھائی کو ڈھونڈنے گئے تھے، فرح نے جلدی سے پوچھا۔

”تم لوگ اب تک اس کو رو رہے ہو میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا اور تم اس کا ذکر کر رہی ہو میرے سامنے، آئندہ میں اس گھر میں اس کا ذکر اس کا نام نہ سنوں، وہ میرے لئے محرک ہے۔ گستاخ اور بدتمیز بھائی کا بہت خیال ہے میرا کچھ احساس نہیں ہے۔ میرے دوسرے کپڑے نکالو اور اپنی ماں سے کہو کھانا گرم کر کے میرے لئے۔“ اباجی نے سختی سے کہا تو پھر شبینہ کو بھی جرات نہ ہوئی۔ امی نے چپ چاپ اپنے آئینہ سمیٹ لئے اور باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

رات بھر ان کی آنکھوں سے سادھن قطرہ قطرہ ٹپکتا رہا۔ اور لب پر بیٹھے کی خیریت اور سلامتی کی دعائیں تھیں۔ گھر سے وہ کچھ بھی تو نہ کر نہ نکلا تھا۔ سروسامان تھا۔ امی نے اب اپنے خدا کے سپرد کر دیا تھا، وہی اس کی حفاظت کرنے والا تھا۔

رات کی بارش کے بعد صبح کی فضا بہت گھبرائی تھی۔ تیز دھوپ نکل آئی تھی۔ آسمان بہت صاف شفاف تھا اور پھولوں پر رات کی بارش کا گھبران لہرا رہا تھا۔ تیز اور چمکیلی دھوپ کھلی کھڑکی کے راستے عین اسٹے چرے پر پڑی تو وہ اٹھ بٹھا۔

”یہ میں کہاں ہوں، یہ میرا کپڑا ہے۔ اس نے اپنے پانچوں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس چھوٹے سے کمرے کا صفحہ سترے کمرے میں وہ بالکل تنہا تھا جس بستر پر وہ سو رہا تھا اس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس بستر کے ساتھ ہی ایک میز بڑی تھی جس پر بھی سفید صاف کوڑ بچھا ہوا تھا۔ اس پر چند کتابیں ایک ٹیمپ اور پانی کا جگ اور گلاس پلیٹوں سے ڈھک کر رکھا ہوا تھا۔ سامنے شاید کپڑوں کی الماری رکھی تھی اور چند کرسیاں سامنے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ کتنی صفائی اور سلیقہ تھا۔

”یہ کس کا گھر ہے۔ میں یہاں کیسے آ گیا ہوں۔“ فیصل کا دماغ کل والے واقعے سے آشنا ماؤٹ تھا کہ وہ کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں پارہا تھا۔ ابھی وہ کچھ یاد کرنے ہی والا تھا کہ فرار

اندرا گیا۔

”کچھ فیصل کیسی گزری رات نیند تو ابھی آئی نا،“ فرزانے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں۔ ہاں بالکل ٹھیک“ اس نے ججائی کور وکتے ہوئے جواب دیا۔ اسے یاد آگیا تھا رات کو فرزانہ ہی تو اسے اپنے گھر لایا تھا۔

”میں تمہارے ناشتے کا کبہ دوں“ اتنا کہہ کر فرزانہ کمرے سے باہر نکل گیا اور فیصل بھر رات والی تلخ باتوں میں الجھ کر رہ گیا۔ چلتے چلتے وہ ٹھیک سا گیا تھا اور کچھ کالے کالے بالوں نے نوراستہ اندر بھی اندھیرا کر دیا تھا۔ آسمان پر لمبے لمبے کے وقفے سے چمکنے والی بجلی اس بات کی گواہ تھی کہ بارش اس کا راستہ روکے گی تیز موائیں کسی طوفان کا پیشی نیمہ تھیں مگر اب اسے اس طوفان کی کیا پرواہ تھی۔ اس کی زندگی میں تو طوفان آ ہی چکا تھا پھر تیز بارشیں اور طوفان نے اس کا راستہ روک ہی لیا۔ وہ تو گھر سے ساری کشتیاں بلا کر نکلتا تھا۔ اور یہاں جانا۔ مروجہ اس کو اس کے جسم میں پہلے ہی چھپے سوراخ گزری تھیں۔ اب ان کا مقابلہ کرنا اس کے لئے دوپھر ہو گیا۔ وہ بہت لمبھاں ہو چکا تھا۔ اس کے پاؤں میں بہت سے پتھر چھب رہے تھے جن سے خون رسنے لگا تھا۔ تکلیف اور بارسن کی شدت اتنی تھی کہ وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور وہیں ٹھک کے کنارے گر پڑا۔ جانے کب تک وہ حالات اور موسم کی اس قسم ظریفی کا شکار ہوتا رہا۔ طوفان کا دور رکا اور بارش بھی تو روک اپنی اپنی پناہ کا جوں کی طرف چل نکلے۔ اسی اشار میں ایک گاڑی اس کے قریب گزری اور پھر واپس ہو کر اس کی طرف آئی۔
”مجھے لگتا ہے یہاں“ فی راہ گیر گر پڑا ہے۔ فرزانے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ اس کا دوسرا ساتھی بھی ڈراموں کی سیٹ سے اتر آیا۔ فرزانہ اپنے دوست کے گھر گیا موائے۔ واپس آنے کا تواتر شروع ہو گیا۔ اب اس کا دوست اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے میں ٹھک کے کنارے بے حس پڑے ہوئے فیصل پر نگاہ پڑ گئی۔

بارش میں نہ حال معلوم ہو رہا ہے۔ شاید پھیل گیا ہو، فرزانے نے کہا۔

”زخمی ہے یاؤں سے خون رس رہا ہے“ اس کے دوست نے کہا۔ فیصل کے پاؤں اور سنونوں پر زخم لگے تھے اور پٹریاں بھی خراشوں

تھیں۔ خون جم گیا تھا۔

یہ تو بے ہوش لگ رہا ہے“ فرزانے اسے سیدھا کیا۔ ایک لمحے کو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونکا۔ اندھیرے میں وہ ٹھیک طرح سے پہچان نہ سکا تھا مگر چہرہ شناس سالک رہا تھا۔ قریبی بلب ابھی روشن ہوئے تھے۔ ان کی دودھیا سی ناٹھام روشنی اس کی شناخت کے لئے نا کافی تھی۔

”پھر کیا کریں گے اس کا؟“ فرزانے دوست نے پوچھا۔
”میں اسے اپنے گھر لے چلتا ہوں۔“ صبح ہوتے تک جتنے اس کی کیا حالت ہو جائے۔ اور پھر بھی یہ اپنے بارے میں بتانے کی سکت بھی نہ رکھتا ہوگا“ فرزانے مشورہ دیا۔
”ٹھیک ہے،“ فرزانہ اور اس کے دوست نے مل کر اسے گاڑی میں ڈالا۔

اور یوں وہ ایک انجانے گھر میں آگیا۔ مگر یہ گھر بھی اس کے دست اس کے مسیحا کا تھا۔ فرزانے اسے اپنے گھر لے آیا تھا مگر لا کر فرزانے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی شناخت کے لئے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں اسے اس کا شناختی کارڈ، چند رسیدیں اور دو سو روپے ملے۔ فرزانے اس کے شناختی کارڈ سے اس کا نام اور ایڈریس پڑھا۔ اس کی تصویر اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ اس کا دوست فیصل ہے جو پچھلے چند سالوں سے اس سے بچھو گیا تھا۔ آج اسے اچانک ملا بھی تو کس تکلیف دہ انداز میں، فرزانہ کا دل دکھ کر رہ گیا۔

”میرے دوست فیصل تم نکھیں کھولو“ فرزانے اس کے چہرے پر اس کی بچھری جبین تلاش کرتے ہوئے اسے پکارا۔ اس کے ہاتھوں اور جسم کو گری پہنچائی۔ اس کی امی نے جلدی جلدی اس کے زخم صاف کر کے ان پر مرہم لگا دیا تھا اور فرزانہ کا ایک گرم سوٹ، کمبل اور سوئیڈ نکال دیا تھا۔

”صفوفی تم جلدی سے زور فرما کر وہ ٹھیک کر دو۔ آج فیصل بیٹا وہیں سوئے گا۔ فرزانہ کی امی نے فرزانہ کی ہنسی سے کہا اور خود فیصل کے لئے دو دھڑک کر کپڑے پہنائیں۔ واپس آئیں تو فرزانہ فیصل کو ہوش میں لانے کی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو چکا تھا۔ فیصل اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں۔ میں کہاں ہوں؟“
”تم میرے گھر میں ہو، تم میرے دوست ہو“ فرزانے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”مگر تم کون ہو؟“ فیصل کا وارغ فادغ سا تھا۔

”میں تمہارا ایک بچہ ہوا دوست ہوں فیصل“ فرانز نے اس کی نگاہوں میں اپنی نگاہیں ڈال کر کہا۔
 ”بچہ ہوا دوست“ فیصل نے چہرے پر کچھ شگافا کچھ اجنبی سے مٹا خرافات لہرائے۔
 ”ہاں میں فرانز ہوں فیصل“ فرانز اسے مکمل یقین دلانا چاہتا تھا۔

”فرانز“ فیصل کی آنکھوں میں پہچان کے سائے لہرائے
 ”ہاں میں فرانز ہوں۔ یاد کرو دوست آج سے چار سال پہلے ہم بچہ تھے۔ اور آج فقیر بنے ہیں ملایا بھی تو کیسے“
 فرانز نے اسے یاد دلایا۔

”فرانز۔ فرانز!“ فیصل نے یاد کیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس سے پٹ گیا۔

”ہاں فرانز میں تمہارا دوست فیصل ہوں۔ دراصل کچھ نئے واقعات اور دو کم کی شدت نے میرے ذہن پر ایسا اثر ڈالا تھا کہ میرا دماغ ناؤف سا ہو گیا۔ مجھے صاف کر دینا دوست! مگر میں چپاں کیسے آگیا فیصل کچھ بچہ پریشان ہوا۔

”میں اپنے ایک دوست کے گھر سے آ رہا تھا کہ راستے میں تم سڑک کے کنارے ملے۔ تم بے ہوش تھے میں تمہیں لپٹنے ساتھ گھر لے آیا۔“ فرانز نے بتایا۔

”میں سڑک کے کنارے گر گیا تھا!“ فیصل کو اپنا غم پھر ستانے لگا۔

”کیا ہوا تھا فیصل جو تم مجھے یوں سڑک کے کنارے ملے۔ کیا گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔“ فرانز نے مذاق سے کہا۔

”ہاں اور اب شاید ساری زندگی کے لئے گھر کا راستہ بھول گیا ہوں“ فیصل نے بہت بو جھل سانس سینے کی قید سے آزادی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ فرانز پریشان ہو گیا۔

”فرانز!“ فیصل نے نہایت بے چینی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

”فرانز! بابھی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں وہ گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا ہوں“

فیصل نے اپنے آنسو روک کر کہا۔

”تمہیں دوست ایسا نہ کہو!“

”ہاں فرانز ایسا ہو چکا ہے۔ ایسا ہو گیا ہے!“ اب کے فیصل نے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ فرانز کا نڈھال تھا اور اس کے آنسو۔ اس کی داستان غم مٹی اور فرانز کی ہمدردی۔ اس نے

اپنے اوپر گزرنے والی ساری قیامت کہہ سنائی۔

”اب تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میرے پاس رہو گے“ فرانز نے اسے دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”نہیں فرانز میں صبح تک میں سنبھل جاؤں گا۔ پھر اپنا ٹھکانہ بناؤں گا۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ میں ان کے بغیر بھی ایک مکمل انسان ہوں“

وہ تو حشیک ہے مگر جب تک تم پوری طرح سنبھل نہیں جاتے میں تمہیں یہاں سے جلتے نہیں دوں گا۔ تم جلدی سے کپڑے بدل کر سردی کی بارش میں بیٹھتے ہوئے ہو“

فرانز نے اپنا سوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”تمہیں تکلیف دی۔۔۔ بہت شرمندہ ہوں فرانز!“ فیصل نے نہایت بے بسی سے کہا۔

”زیادہ بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ تمہارا گھر ہے۔“ فرانز نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

”ہاں بیٹا اسے اپنا بھی گھر سمجھو۔ میں سمجھوں گی کہ مجھے دوسرا بیٹا ملے۔“ فرانز کی اُمی نے کہا۔

”یہ آپ کی بہن بانی ہے ماں بچی۔“ فیصل کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے آیا تو فرانز کی اُمی اس کے لئے گرم گرم دودھ کا گلاس لے آئی تھیں۔

”بیٹا یہ بی بی جلدی سے نہیں سردی لگ رہی ہو گی۔ اب فوراً سو جاؤ۔“ انھوں نے اس کے بستر پر گرم مکمل بھی رکھ دیا۔

”اچھا۔“ فیصل دل میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ مگر مجبور تھا۔

”اچھا فیصل اب تم اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح بائیں“ فرانز نے اسے دعا حافظ کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

”یہ میری ماں کی دعا ہیں ہیں جو میری خیریت سے ہوں!“ رات کو اس نے سوئے ہوئے سوچا۔

فرانز اس کے لئے ناشتہ اور اخبار لے کر آیا تو وہ چونک سا گیا۔ رات والا غبار دھل چکا تھا اور اب اس کا ذہن صاف تھا گردوں میں کہیں تلخ شہ صوفی۔

”تم نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود اچھا تھا! فیصل شرمندہ ہو گیا۔

”میری بہن ہے ناصفو وہ ناشتے میں گرم گرم برائے بناتی ہے میں نے سوچا کہ میں بلا نے جاؤں اور لاؤں تو کہیں پر لٹھے ٹھنڈے نہ ہو جائیں اس لئے میں یہیں لے آیا“ فرانز نے

ٹرسے میز پر رکھ دی۔

”جلدی سے آجاؤ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے“ فرانز نے پھر کہا تو فیصل اٹھ کر آگیا۔ فرانز نے دو کرسیاں قریب کھینچ لی تھیں۔ دونوں ناشتہ کرنے لگے۔

”تکلف سے کام نہیں چلے گا“ فرانز نے فیصل کی سستی دیکھ کر کہا جو بہت آرام سے لیٹے توڑ رہا تھا۔

”اگر تکلف کرنا ہو تو رات کو ہی یہاں سے چلا جاتا مگر ہر نوالہ اس کے حلق میں اٹک رہا تھا۔ جانے امی اور بہنوں نے بھی ناشتہ کیا ہو گا یا نہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ تین چار مہینے گھر سے غائب رہا تھا۔ کبھی کسی دوست کے گھر اور کبھی کسی دوست کے گھر ایک ایک رات گزار کر گزارہ کیا تھا۔ اس وقت یہ امید تھی کہ جب وہ تنخواہ لے کر گھر جائے گا تو شاید آبا جی کی نفرتوں کی کمی آجائے۔ مگر وہاں تو دولت سا بن کر رہتوں کی محبت پر بھی پھیلنے لگے۔ فیصل کا دل بھر گیا۔ اس نے لقمہ وہیں پھونک دیا۔

”کیا ہوا؟“ فرانز نے دیکھا تو بولا۔

”نہیں نہیں امی اور بہنوں نے بھی رات سے کچھ کھایا ہو گا یا نہیں! فیصل بہت دھبی ہو گیا تھا۔

”دیکھو فیصل! زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔ دیکھ سکتے تو آتے ہی ہیں۔ اگر تم اسی طرح گزرے دنوں کو یاد کرتے رہو تو کچھ نہ کر سکو گے جو ہو چکا اس کو بھول جاؤ۔ اب آنے والے دنوں کو خوش آمدید کہو۔ اب اس دن کا انتظار کرو جب تم ایک کامیاب انسان بن کر گھر جاؤ گے اور سب ہتھیں گلے لگائیں گے“ فرانز نے اسے سمجھا یا۔ آس دلائی۔

”شاید وہ دن کبھی نہ آئے“ فیصل نے بہت حسرت کے ساتھ کہا۔

”ایسی ناامیدی کی باتیں نہ کرو فیصل خدا پر بھروسہ رکھو“ کچھ“ فرانز نے اسے جو صلہ دیا تو اس نے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔

خدا نے انسان کو صبر جیسی طاقت عطا نہ کی ہوتی تو شاید دنیا سے کبھی دکھا اور دو ختم ہی نہ ہوتا۔ انسان اپنے ہی غموں کے حوالے ہو کر اپنا استحصال کرتا رہتا۔ یہی کچھ سوچ کر امی، ثمنہ اور فرح نے بھی فیصل کی طرح حالات سے سمجھنے نہ کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ صبر آتی گیا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ آبا جی اس گھر میں اس کا نام اس کا ذکر نہ سنا پسند نہ کرتے تھے تو وہ کیسے یہ آرزو کرتے کہ فیصل آکر ان کو اپنی صورت دکھا جاتا تاہی شکوہ

نہ کرتی تھیں مگر اندر سی اندر گھل رہی تھیں۔ ثمنہ اور فرح اپنے اپنے کاموں میں ابھی رہتی تھیں اور امی سوچوں میں کم پریشان رہا کرتیں۔ کبھی با ثمنہ اور فرح نے انہیں بھیجا یا تھا۔

امی جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ کو آبا جی کی عادت کا علم ہے بس خدا سے دعا کریں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں“ ثمنہ نے کہا۔

”میری تو ہر لمحہ خدا سے یہ دعا رہتی ہے“ امیوں نے آہ بھر کر کہا۔

”میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن ضرور آئیں گے“ فرح نے ماں کو وصلہ دیا۔ یہی طرح تو ان کا دل ہلانا تھا۔

باں کا شکر وہ آجائے۔ چھ ماہ ہو گئے اس کی صورت دیکھ مرنے اور اب تو ثمنہ کی شادی بھی قریب ہے۔ بہن کو رخصت کرنے بھی نہ آئے گا۔ امی ایسے یاد کر کے پھر رو پڑیں۔ ثمنہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ فرح پھر انہیں تسلی دینے لگی۔

ایک دو دن میں سہیل نے دلا تھا۔ ابھی عادل بھائی نہیں آ سکتے تھے۔ انہیں چھٹی نہ مل سکی تھی۔ ان کے خط نے معلوم ہوا تھا کہ وہ ثمنہ کے جہیز کے لئے بہت سا پڑا اور نقد رقم سہیل کے ہاتھ بھیج رہے ہیں۔

جس دن سہیل آیا اس دن آبا جی بہت خوش تھے۔ اس کے ساتھ عادل بھائی کا بیگ اور خط آئے تھے۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ پچیس ہزار کا ڈرافٹ بھیج رہے ہیں۔ ثمنہ کی شادی دھوم سے کی جائے۔ سہیل بھی اس کے لئے بہت سی چیزیں لایا تھا۔ یوں آبا جی کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی جنہیں بہنوں کا خیال ہوتا ہے۔ آبا جی نے امی سے کہہ کر ان کے دل کے زخم ہر رب کریم تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ فیصل پر گہرا طعن کر رہے ہیں۔ اب اس میں فیصل کا کیا قصور۔ وہ خود تو اس کی صورت نہ دیکھنا چاہتے تھے۔

”امی، فیصل نظر نہیں آ رہا کہاں ہے وہ؟“ سہیل جو بہت دیر سے بے چین تھا آخر پوچھ ہی بیٹھا۔

”وہ اب اس گھر میں نہیں رہتا“ امی کی بجائے آبا جی نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”وہ اب گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے اس جیسے گناہ اور بد قیڑے کے لیے اس گھر میں قطع ضرورت نہیں ہے۔ باقی فیصل اپنی ماں سے پوچھ لو۔ فیصل کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر گئے تو سہیل نے امی جان

سے ساری تفصیل پوچھ لی۔ اچھی جان نہ دیتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔ پہیل کو جانے کوں افسوس سا ہوا۔ آبا جان کے روئے پر دکھ بھی ہوا۔ آٹھ دس ماہ گھر اور کچھ والوں سے دور رہنے سے ان کی جدائی کے خیال نے بہت پریشان کر رکھا تھا ان کی محنت دل میں اور بڑھتی تھی اور اب تو وہ اپنے بیویوں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ کمانے لگا تھا۔ ایسے میں آبا جان کا یہ رویہ اس کے لئے کچھ درست نہ تھا۔

گھر میں قمیض کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اچھی جان کو اب بھی فیصل کا انتظار تھا۔ مگر فیصل جانے نہ تھا۔ چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا اسے گھر چھوڑے ہوئے۔ اس نے کئی بار فراز سے کہا تھا کہ اب وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنا گھر لے سکے لیکن فراز سے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شمشیر میں چھ ماہ بیت گئے تھے۔ اس دن فراز اپنے کسی دوست کی بہن کی شادی میں جا رہا تھا۔ اس کی بہن صفوا اور اس کی اچھی بھی جا رہی تھیں۔

”تم بھی جلد فیصل (فراز) نے کہا۔“

”شادی کس کی ہے؟“ فیصل نے پوچھا۔

”میرا دوست ہے ماما علی جس کے ساتھ میں تہیں گھر لایا تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہے۔“ فراز نے بتایا۔

”بہن کی شادی؟“ وہ کھو سا گیا۔ اسے اپنی بہن ٹینہ یاد آگئی۔ جب وہ پہلی بار ابا جی کی زیادتیوں کا شکار ہو کر گھر سے نکلا تھا اس سے دو تین دن قبل ہی تو ٹینہ کا رشتہ طے ہوا تھا اور ان کا امر تھا کہ سال چھ چھپنے میں شادی کر دی جائے علی کی بہن کی شادی کا ذکر سننا تو فیصل کے لیے لگا جیسے اس کی بہن کی شادی ہو رہی ہو۔ اسے ایک بار پھر گھر کی یاد نے بتایا تو وہ بے چین ہو گیا۔

”نہیں فراز، نہیں ہاں۔ تم لوگ جاؤ، ۲۱ آنے سوچو کہ جواب دیا۔“

”کیوں؟“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔ یوں بھی مجھے اپنی طبیعت اچھی محسوس نہیں ہو رہی۔ فیصل نے بیکسی دیکھی کے کہا۔

”ارے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ فراز اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”اے ایسی کوئی بات نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ تم جاؤ تہیں دیر ہو رہی ہو گی۔“ فیصل نے اسے اطمینان دلایا۔

”فراز بھائی چلیں نادیر ہو رہی ہے۔“ اچانک ہی صفو

اندر آگئی۔ فیصل کی نگاہ اس پر پھسل گئی۔ سکے اودھن رنگ کی سا دھکی تھی جس پر رنگین نقیش کا کام کیا ہوا تھا، اس پر بہت سچ رہی تھی۔ سکے سے میک آپ میں آج پہلی بار فیصل نے اسے اس روپ میں دیکھا تھا۔ فیصل کی نگاہ اپنے اوپر رہتے دیکھ کر تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ اس کی کرپہرانی لمبی چوٹی اور سلو چوٹی میں جکڑے ہوئے خوبصورت پاؤں بہت دیر تک فیصل کے ذہن میں رہے۔ وہ سب چلے گئے تو وہ تنہا رہ گیا۔ اس کے خیالات اس کی سوچیں اس کی تہنایوں کی ساقی تھیں۔ اتنی پریشانیوں کے باوجود صفو کا خیال اس کے ذہن کو تازگی بخش رہا تھا جیسے طبعی دھوپ میں بھی کوئی پھول اپنی خوشبو پھیلا رہا ہو۔ بیاسی زمین پر سانوں کے پہلے پھیننے سے ذہن کو جو سکون ملتا ہے وہی سکون اس وقت فیصل کے تھکے ہوئے ذہن کو بھی حاصل ہو رہا تھا مگر اس سکون میں ابھی اضطراب تھا۔ اس اطمینان میں اب بے چینی سی تھی۔

میں ایسی باتیں کیوں سوچنے لگا ہوں؟“ اس نے اپنے ذہن کو ٹھوٹا تو دل خوشش ہو گیا۔ واقعی ابھی اسے ایسی باتیں ملتی نہیں سوچتی نہیں چاہیے تھیں۔ اپنے باسے میں یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے تھا۔ ابھی اس کی دو بہنوں کی ڈولی تھی۔ اوصاف تو اس کے گھر کی بہن تھی۔ اس کے متعلق ایسا خیال کیوں اس کے ذہن میں آگیا۔ اس نے اپنے دل کو ڈانٹ دیا اور یہ سوچنے لگا کہ کل کیسے وہ چلے گھر جائے گا۔



گھر میں ایک منگیا مہر رہتا تھا۔ بوسے گھر میں اٹھن کی مہک بکھرتی ہوتی تھی۔ تھپتھپے ہی تھپتھپے تھے۔ سارے خاندان کی اڑکیاں عورتیں اور لڑکے جمع تھے۔ ٹینہ کی شادی میں چند ہی روز رہ گئے تھے۔ آج اس کی مایوں کی رسم تھی۔ آٹھ تھپتھپ منگیا مہر جا رہی تھا۔ لڑکیاں ڈھولک گیت گارہی تھیں۔ لڑکے انہیں بار بار گرتک کر رہے تھے جس پر لڑکوں کی بڑک خواتین انہیں ڈانٹ رہی تھیں۔ ٹینہ کے کزن سمیرا کے ہاتھ میں اٹھن کا پیرا تھا۔ اس کا بھائی شاہد بار بار آتا اور اہنوں میں انگلی لگا کر سمیرا کے منہ پر لگا کر چلا جاتا جس پر وہ بہت چڑھتی تھی۔

اب کے شاہد آبا تو میں نے یہی پیالہ اس کے منہ پر مل مانا ہے، اسے میرا نے زرخ سے کہا تو فرح صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس کی بہن کی شادی تھی مگر وہ صرف اس خیال سے افسردہ تھی کہ اس کا بھائی بہن کو رخصت نہ کر سکے گا۔

”دیکھو فرح شاہد اگر ماہے میں چھپ کر یہ ابلن اس کے منہ پر ماروں گی“ سیرا نے دور سے شاہد کو آتا دیکھ کر کہا۔
 ”اچھا“ فرح پیچھے ہٹ گئی۔ سیرا بھی دروازے کی اوٹ میں ہوئی اور ہاتھ میں بہت سا ابلن کے کر شاہد کی طرف اچھا دیا۔ جس کے کچھ چھینٹے تو اس پاس کھڑے لوگوں پر بھی پڑے۔

اور
 سارا ابلن آنے والے کے منہ پر جا پڑا۔ شاہد تو موقع وارثا پر ہی پیچھے ہٹ گیا تھا اور سارا ابلن اندر آنے والے فیصل کے منہ پر لگ گیا۔ پورے کمرے میں ایک ساتھ کئی قبضے گونج اٹھے۔ مگر جب فیصل نے اپنے جہرے سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو سب ہی چونک گئے۔ قبضے ختم گئے اور سرخوشیاں چیخوں میں بدل گئیں۔

”فیصل!“
 فیصل بھائی!

سب نے ہی اسے لپکارا۔ ان بیکاروں پر زرد دیکڑوں میں ملبوس سرخ روپہ اوٹھے درد مونی ٹینڈ نے بھی دیکھا۔ سب ہی فیصل کی صورت دیکھ کر سہم گئے تھے۔ اس کے غصے کا تو سب کو علم تھا اور سیرا تو اپنی جگہ کانٹ اٹھی تھی۔
 ”اگر فیصل بھائی کو پتہ چل گیا کہ ابلن میں نے پھینکا ہے تو“

مگر فیصل کسی اور کو کچھ کہنے کی بجائے سیدھا ٹینڈ کی طرف بڑھا۔ ٹینڈ بھی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔
 ”ٹینڈ! فیصل نے بیک کر اسے گلے لگا لیا۔
 ”فیصل بھائی!“ ٹینڈ بڑی شدتوں سے رو پڑی۔
 ”تم کہاں چلے جاتے ہو بھئی!“

فرح اس کی دوسری طرف لڑ پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ سب ہی خاموش کھڑے تھے۔ اندر امی جان ٹینڈ کے دوپٹے پر کرن لگا دی تھیں۔ ان کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کر باہر آئیں تو دیکھا فیصل کھڑا تھا۔

”فیصل بھیا!“ امی جان کی آواز لرز گئی۔
 ”اُمی“ فیصل نے ٹینڈ کو کھجور کر انہیں تنہا۔ امی جان نے اس کے جہرے کی کئی بلائیں لے ڈالیں۔
 ”بہن! کوہ رخصت کرنے آئے ہو بیٹا!“ امی جان کی آواز آنسوؤں کے پوچھ سے کانپ گئی۔

”ہاں اُمی!“ اس نے ماں کی آنکھوں کے آنسو سمیٹ لیے۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں بہن کو رخصت کرنے کی!“
 ”ابا جی کی رخصت آواز پر سب چونک گئے۔
 ”مہم کس منہ سے آئے ہو بہن کو رخصت کرنے کے لیے ہسبل یہاں آچکا ہے اور عادل نے وہاں سے دعائیں لکھ کر بھیج دی ہیں!“ ابا جی نے بھری عقل کا کوئی خیال کے بغیر کہا۔
 ”مگر میں ابھی زندہ ہوں!“ فیصل نے ساری جہتیں جمع کر کے جواب دیا۔

”مہم ہمارے لئے مرچے ہو۔ فوراً اس گھر سے نکل جاؤ۔“
 ابا جی کو موقع کی نزاکت کا بھی احساس نہ تھا۔
 ”میں بہن کو رخصت نہیں کر سکتا مگر اسے کچھ بے تو سکتا ہوں۔ امی جان میں نے یہ تین ہزار روپے جمع کئے تھے۔ امی یہ رکھیں کام میں گئے۔ اس نے باپ کی پرواہ کے بغیر تین ہزار روپے نکال کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

لے جا ڈالیں یہ کمائی بٹائیاں تین ہزار میں نہیں ہو سکتیں اگر اتنا ہی بہن کا خیال ہے تو عادل کی طرح کچھ ہزار کا چیک لے کر آتے“ ابا جی نے پھر اسے عادل بھائی کا طعنہ دیا تھا۔
 ”آپ عادل بھائی کے ریا لوں پر اتنا غور نہ دکھائیں۔ مجھے ٹینڈ کی شادی پر خرچ ہونے والے پیسے کی قدرت ملے دیں۔ ایک ایک پائی چکا دیں گا۔ آئندہ میں یہ طعنہ نہ سنوں!“
 ”بہت جبرت مند ہو گئے ہو۔ اگر تہی جبرت والے تھے تو یہاں قدم کھول رکھا۔ یاد ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اس گھر نے فوراً نکل جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا منحوس سایہ بہن کی خوشیوں کو ڈس لے“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب کبھی نہ آؤں گا۔ ٹینڈ میں تمہاری خوشی دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ فرح تم سمجھ لینا کہ تمہارا بھائی مر گیا ہے۔ تمہیں رخصت کرنے نہ آ سکیں گے مجھے معاف کر دینا!“ اس نے اپنے آنسو چھپائے اور تیزی سے باہر نکلے۔ سیرا اس کی راہ میں آگئی۔

”مجھے معاف کرو بیٹا! فیصل بھائی۔ میں نے آپ کے چہرے پر ابلی چھینکا تھا۔ وہ بہت شرمندہ ہو کر ہوئی۔

”کوئی بات نہیں میرا۔ یہ تو میری بہن کی خوشی تھی نا!“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔
 اور اپنے قد کوں کے نشان تک لے گیا۔ ٹینڈ بے ہوش ہو گئی تھی اور ماں شدتوں کے ساتھ رو رہی تھی کیسا باپ تنہا جس نے اولاد کی خوشیوں میں ہمیشہ رکاوٹ ڈالی تھی۔

○
فرانز نے دھک براڑھ کر دروازہ کھولا تو فیصل کھڑا تھا۔
بہت پریشان لگ رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ پھر اس پر قیامت ٹوٹی
سے۔ فرانز نے تو اسے بہت حوصلوں کے ساتھ اس کے گھر کی
طرف روانہ کیا تھا۔ کتنی اس دلائی تھی۔ بہت تسلیاں دی تھیں
پھر یہ کیا ہو گیا تھا۔ اس کی ساری بہتیں جواب دے رہی تھیں۔
حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ امیدوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔
فیصل صدمہ افرانز نے اسے تمام لیا۔ بہت تھکا ہوا سا لگ
رہا تھا۔ اتنا شکستہ اور ٹوٹا ہوا تھا کہ اگر فرانز اسے سہارا نہ دیتا تو وہ
گرہ جاتا۔ فرانز اسے اندر لے آیا۔ اسے آرام سے بستر پر بٹھا یا۔
"میں نے نہیں وہاں بڑی امیدوں کے ساتھ بھیجا تھا نہیں
اب تم سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ فرانز نے کہا۔
"ہاں میرا شکستہ اور ٹوٹا ہوا وجود ہی اس بات کی گواہی دے
رہا ہے کہ میری وہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہن کو رخصت
کرنے گیا تھا۔ اب خود وہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر آ گیا
ہوں۔ وہ میرے لئے مچھے میں اور میں ان کے لئے مچھ چکا ہوں۔ فرانز
ان کو میری ضرورت نہیں رہی۔" فیصل اس کی گودیوں سر رکھ کر سسک
اٹھا۔

"فیصل ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ سب جذباتی فیصلے ہیں۔ اس
طرح زندگی نہیں گزرتی۔ زندگی کو گزارنے کے لئے بہت بڑا حوصلہ
چاہیے۔ تم تو ابھی سے مار رہے ہو۔ آج تھا اسے ابجائی نے جذبات
میں گر نہیں گئے۔ نکال دیا ہے تو کیا ہوا۔ کل کو بھی آجی نہیں
ٹکے سے لگا نہیں گئے۔ وقت آئے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔
فرانز نے پھر اسے حوصلہ دیا۔
"وہ دن کب آئے گا۔ کیا میں یونہی مجنتوں کے لئے ترستا
رہوں گا؟"

"نہیں فیصل۔ تم مجنتوں کے لئے ترسو گے نہیں۔ نہیں
محبت ضرور ملے گی۔" فرانز نے اس سے کہا۔
"صافاً" پھر اس نے صاف کو آواز دی۔
"جی جیتا۔ باورچی خانے میں اس کی آواز آئی تھی۔
"ایک کپ گرم گرم چائے آؤ جلدی سے!" فرانز نے
وہیں سے کہا۔

"اچھا" اس نے جواب دیا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا فرانز تم نے خواہ مخواہ صاف کو تکلیف
دی۔" فیصل نے تکلف سے کام لیا۔
"چلے پٹی کر تہاڑی پر سے کتنی دور ہو جائے گی!" فرانز نے کہا۔

"اچھا" اس نے جواب دیا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا فرانز تم نے خواہ مخواہ صاف کو تکلیف
دی۔" فیصل نے تکلف سے کام لیا۔
"چلے پٹی کر تہاڑی پر سے کتنی دور ہو جائے گی!" فرانز نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں صاف چلے آئے۔ پہلے پہل وہ
بروہ کرتی تھی۔ دروازے کے باہر سے ہی اسے چہرہ پر
پٹلی جایا کرتی تھی۔ مگر اب رفتہ رفتہ اس کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔
وہ بھی کچھ فیصل کے سامنے آجاتی تھی۔ مگر حجاب ضرور ملنے
تھا۔ نگاہیں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ وہ خاموشی سے اندر آتی
اور چلے مینہ سر رکھ کر چلی گئی۔

درخت پر فیصل اتنا ہی کہہ سکا۔ سادہ سادہ یہی وہ
کتنی اچھی لگا کرتی تھی۔ اب بھی وہ آتی تو اسوں کے پھینکوں کی طرح
اسے سکون دے گئی۔ وہ جب بھی اپنی صورت اسے دکھاتی تھی
اس کے جملے خوب پریشانی پھواری کی طرح برس کر چلی جاتی تھی۔
فیصل کو ایک دم سکون سا محسوس ہوا۔ اب اسے پرانی باتوں
کو بھول کر نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔

○
فیصل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ فرانز کے گھر نہیں
سے گا۔ کافی عرصے سے وہ وہاں رہ رہا تھا۔ فرانز نے دوستی
کا حق ادا کیا تھا۔ گھر وہاں ساری زندگی کو نہیں رہ سکتا تھا۔ یوں
بھی مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس دن وہ آفس سے آیا تو اس نے
آتے ہی فرانز کو خبر پڑا ڈالی۔

"فرانز میں نے اپنے لئے ایک کمرے کا مکان کرائے پر
لیا ہے۔ تم مجھے یہاں سے رخصت کر دو تو اچھا ہے۔" فیصل نے
کہا تو فرانز اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"کیا بات ہے نہیں خوشی نہیں ہوئی؟ فیصل نے اسے کرایا۔
"اس بات کی خوشی ہوئی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو سنبھال
لیا ہے اور دکھ اس بات کا ہے کہ تم مجھے سے دور ہو جاؤ گے۔ فرانز
نے جواب دیا۔
"میں تم سے دور نہیں رہوں گا فرانز میں تم سے ملنے آیا کروں گا۔"

فیصل نے کہا۔
"تم سے پوچھ لیا؟" فرانز نے پوچھا۔
"میں نے ان سے رات کو بات کی تھی۔" فیصل بولا۔
"پھر کیا جواب دیا انہوں نے؟"
"بہت ادا اس ہو رہی تھیں۔ وہ منہ کر رہی تھیں۔"
"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے ضرورت
سے زیادہ سہارا دیا ہے۔ آپ لوگوں کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔
جنہیں میں فراموش نہیں کر سکتا۔ مگر اب میں ساری زندگی تو یہاں
نہیں بٹھ کر سکتا نا؟" فیصل نے معقول جواب دیا۔

"میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے ضرورت
سے زیادہ سہارا دیا ہے۔ آپ لوگوں کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔
جنہیں میں فراموش نہیں کر سکتا۔ مگر اب میں ساری زندگی تو یہاں
نہیں بٹھ کر سکتا نا؟" فیصل نے معقول جواب دیا۔

”ٹھیک ہے فیصل لیکن اگر کبھی ہماری ضرورت محسوس ہو تو مجھے خبر نہ بھجنا!“

”اگر میں تمہیں خبر نہ بھجھتا تو اتنا عرصہ کس طرح تمہارے پاس رہتا۔ تم تو میرے دوست میرے محسن ہو فرازا!“ فیصل نے محبتوں کی شدتوں سے بڑے خلوص کے ساتھ فرازا کا ہاتھ تھام لیا۔

”آج کا اودامی ڈنر تو ہمارے ساتھ کرو گے نا؟ فراز بہت ادا اس پر رہا تھا۔

”لیکھوں نہیں فیصل نے فرط محبت سے اس کا ہاتھ دبایا پھر دونوں باتیں کرنے لگے۔

فیصل کے لئے اودامی ڈنر فراز نے بہت اہتمام کر ڈالا تھا۔ اسی اور صفو شام سے باورچی خانے میں کھسکی تھیں۔

فیصل بہت شرمندہ ہوا تھا۔

”یار تم نے تو خواہ مخواہ اتنا اہتمام کر ڈالا ہے۔“

”میں نے تھوڑی کیا ہے۔ اسی اور صفو نے کیا ہے۔“ فراز مسکرایا۔

”بہت عمدہ کھانا پکا یا ہے۔“ اس نے دل کھول کر تعریف کی۔

صفو اس کی تعریف پر لگا ہیں بھکا کر مسکراتی رہی۔

جب وہ جا رہا تھا تو اس وقت خود بھی بہت ادا اس پر رہا تھا۔ فرازا کی امی نے بہت دعائیں مانگی تھیں۔

”بیٹا تمہارے روپ میں ایک اور بیٹا بھل گیا تھا۔ جہاں رہو خوش رہو۔“

”امی آپ کو پا کر مجھے یوں لگا جیسے حقیقی ماں مجھے مل گئی ہو اگر کوئی گستاخی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ وہ بہت سادہ دل ہے۔“

اسے بیٹا گستاخی کیسی تم کو لاتے ہو نہار اور فرمانبردار بیٹے ہو۔

بس تمہیں ذرا سی توجہ اور محبت کی ضرورت تھی فرازا کی امی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ان سے دعائیں مانے لگا اور کھڑی صفو کے قریب آیا۔

”صفو میری وجہ سے تمہارا کام ٹھہر گیا تھا نا۔ اب جا رہا ہوں اگر میری کوئی بات میری لگی ہو تو معاف کر دینا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“ اس نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر فیصل کو دیکھا اور فوراً ہی چہرہ تھکایا۔

فرازا نے چھوڑنے کی بات نہ کی۔ جاتے ہوئے فیصل خود بھی بہت پریشان اور مضطرب ہو رہا تھا صفو کی وہ پہلی نگاہ تھی کہ دل میں آنرز لگی تھی کتنی ادا اسی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

”پھر لوٹ کر آؤ گے نا؟“

ان آنکھوں کا انتظار اسے پکار رہا تھا مگر ابھی لوٹ کر آنا اس کے بس میں نہ تھا۔

”میں آؤں گا صفو میرا انتظار کرنا۔“ رات بہت دیر تک خیالوں میں وہ اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ وہی تو اس کی تہائیوں کا سہارا تھی۔

○ شروع فرور عین تو اس کو بہت عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔۔۔۔۔ کام سے واپس آ کر وہ شام کو کھڑے آتا تو تہائی کاٹ کھلنے کو دوڑتی تھی۔ کھڑے کھڑے چھوڑ دینا اور بے ترتیبی کو دیکھ کر اسے دکھ ہوتا۔ اس کو ہول سے اٹھنے لگتا۔

”یہ کب کب سے گا؟“ وہ سوچتا۔ اس وقت یہ احساس شدید ہو گیا تھا کہ پچھلے آشیانے سے پھر جانے تو راستے کے ساتھ موسم اس کی راہ اس طرح روک لیتے ہیں کہ وہ پھر اپنے آشیانے تک نہیں جاسکتا۔ ایسی ہی بے درخزاں سے بھرپور تھیں اس کے آنکھیں بھی آسانی تھیں جو اس کے دروازے تک لے جانے کے راستے میں کانٹے پھنسا دیتی تھیں۔ وہ جب بھی شام کو کھڑا ہوتا خشک پتوں کا آلاؤ سنگت ہوا محسوس ہوتا۔

”یا اللہ میری زندگی میں یہ خزاں کا موسم کہاں سے آ گیا ہو؟“ وہ اپنا تھکا تھکا سا وجود دستبرگر کر کے بس سا ہو کر تکیے میں منہ چھپا کر رو رہی تو دیتا تھا۔ پھر اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کھڑے کر پھر کرے۔ وہ صبح ناشتہ تو جیسے جیسے کر کے چلا جاتا تھا دوپہر کو کھانا کھاتا تو کھانا کسی ہوٹل میں یا اپنے آفس کی کینٹین میں کھاتا تھا۔ مگر وہ کھانا کوئی مزہ تو نہ دیتا تھا۔ اسے اپنے گھر کا کھانا یاد آتا تو اس کے حلق میں نولے پھنسنے لگتے مگر میں آؤ جلیں کسی محسوس ہوتی اور آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

”پتہ نہیں اپنے گھر کا کھانا اب نصیب ہو گیا یا نہیں؟“ اس دن جمعہ تھا۔۔۔ اپنے لئے ناشتہ تیار کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ چائے تو اس نے بنایا تھی۔ اب تو اس سینک کر انڈا پرائی کر رہا تھا کہ کھی کے چھینٹے پڑنے سے ہاتھ بھی جلا۔ جیسے جیسے اس نے ناشتہ کیا اور باورچی خانے سے باہر نکل آیا۔ باہر آیا تو گھر کا بے ترتیب نظام اس بات کا منتظر تھا کہ اسے درست کیا جائے ایک حقے بجھتی گا دن ملتا تھا۔ وہ اس دن آرام کرنا چاہتا تھا مگر آرام اس کے نصیب میں کہاں تھا۔ ہفتے بھر کا بچو ہوا نظام اسے درست کرنا تھا صبح تو وہ جلدی جلدی آفس چلا جاتا تھا۔ شام کو آتا تو اتنی تھکن ہوتی کہ وہ صرف چائے خانہ کی کر سوجاتا تھا۔ رات ہونے کے قریب سو کر اٹھتا تو ہنہا کہیں باہر

نکل جاتا۔ کھانا وہ ساتھ ہی لے آتا تھا۔ یوں اس کی زندگی کے یہ کھن، بے کیف اور بے رنگ دن گزر رہے تھے۔

چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں ایک اکلوتا گھرہ اور چھوٹا سا آنکھن تھا جس میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ باورچی خانے میں گندے برتنوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ غسل خانے میں میلے کپڑے اس کے منتظر اور کمرہ صفائی کے انتظار میں تھا۔

”ہیلہ! کروں؟“ وہ تو اتنا سا لکام دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ہیلہ باورچی خانے میں برتن دھو یوں ورنہ کھانا بھرتی رہیں گی۔ وہ کچھ سوچ کر باورچی خانے میں آ گیا۔ سارے برتن صاف ہوئے اسے یوں گھنٹھ لگ گیا۔ وہ تو برتن دھو کر کئی گھنٹوں گھر رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے انگلیں بھی درد کرنے لگی تھیں۔

”پتہ نہیں یہ عورتیں کس طرح ڈھیروں برتن دھو جاتی ہیں؟“ تو دل سے ہاتھ خشک کرنا وہ اندم کرے میں آ گیا۔ کمرے کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جیسے کسی نے اسے تھیں نہیں کر ڈالا ہو۔

”اب تو ادھلی میں مرنے ہی دیا ہے میاں اب تو یہ ب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“ اس نے بہت دکھ اور مجبوری کے ساتھ کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ ہر چیز کو دسے آئی پڑی تھی۔ اس نے اپنے بے ترتیب کپڑوں کو سمیٹا۔ جیسے تیسے الماری میں گھومنا۔ بے ترتیب چیزیں ان کی جگہ صاف کر کے رکھیں۔ بستر کی چادر بھاڑ کر پھر اس پر بچھائی۔ کمرے کے فرش پر جابجا کافے ٹیوٹے، اسکرٹ کے ٹکڑے، ایک کدو وغیرہ پڑی تھی۔ داغ دھبے بھی پڑے تھے۔ اس نے بھاڑ لگا کر چابی لکڑی پوسے گھر میں کہیں بھی بھاڑوں نہ مل سکی۔ پھر اسے خیال آیا۔ اس نے بھاڑوں کو خریدی ہی نہیں تھی۔ گھر کے قریب ہی جنرل اسٹور تھا وہ بھاڑ خریدنے کے لئے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھاڑوں کو طلب کی تو نوکاندار نے اسے کہا۔

”آپ خود گھر میں بھاڑوں لگائیں گے؟“

”تو اور کیس کروں؟“ وہ بھی غمگینا ہوا تھا۔

”اکیلے آدمی کا تو یہی حشر ہوتا ہے۔ اب گھر بسا لو میاں!“

اس نے سنتے ہی بے نتیجہ بی بی تو فیصل بھاڑوں خرید کر واپس آ گیا۔ گھر آ کر اس نے بھاڑوں کو لگا دی کہ اور کچھ اوصاف ہو گیا تھا مگر داغ دھبے اب صاف نظر آ رہے تھے۔ اسے اکیدم خیال آ گیا اس کی بہن فرح اور شہینہ باری باری کھیلنے کے لئے فرح صاف کیا کرتی تھیں۔ اس نے اپنی ایک بیٹی ہونی بنیان کی اور اسے نیلا کر کے فرش صاف کرنے لگا۔ اب احساس ہوا تھا کہ اگر مرد لکھتا ہے تو عورت گھر کو سمجھاتی ہے۔ گھر کا انتظام کتنے بچے طریقے پر چلاتی ہے۔

عورت کے بغیر گھر واقعی نامکمل ہے؛ گھر صاف کر لینے کے بعد اس نے کھلے دل سے اعتراف کر لیا۔ اب اس کا اپنا حال بہت بُرا ہو گیا تھا۔ تنہا تنہا سے پورہ ہفت روزہ گزر چکا۔ ایسے میں ایک بار پھر صفو کا خیال اس پر ساون کی دم چھری طرح چھا گیا۔

”صفو میں ادھورا رہ گیا ہوں۔ مجھے مکمل کرنے اور اس گھر کو مکمل کرنے آ جاؤ۔ مجھے بہاری بہت ضرورت ہے۔“ صفو کے خیال سے ہی اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ صفو ٹھٹھکی دیر کے بعد اٹھ کر ٹائم دیکھا تو مسجد کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ گھر کے کاموں میں وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ نہانے کے لئے غسل خانے میں چلا گیا۔ میلے کپڑے دیکھ کر ایک بار پھر دل جل گیا۔

”اب نہانے اور نماز پڑھنے کے بعد ہی دھوؤں گا؟“ اس نے سوچ کر اپنے آپ کو ٹپکی دے دی۔

نماز پڑھ کر آتو بھوک بہت شدت کی لگ رہی تھی آج اس نے کام بھی تو بہت کیا تھا کدو میں کھانے کے لئے کچھ بھنا نہیں۔ بازار سے اسے اندرے اور دوٹیالے آیا اور انڈوں کا اہلیت بنا کر کھانا بھنکنا ایسی کھنی کر کھانا کھاتے ہی نیند آ گئی۔ دینیک سوٹا نہا شام کو سو کر اٹھا تو ایک بار پھر میلے کپڑوں کا خیال آیا۔ صبح کے لئے بھی صاف کپڑے موجود نہ تھے۔ اس نے کپڑے دھونا ضروری سمجھے۔

وہ کپڑے دھو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جھانک میں بھرتے ہوئے ہاتھ دھوئے اور باہر آ کر دروازہ کھول دیا۔

”اے یار فرزانہ؟“ وہ ایک دم فران سے لپٹ گیا۔ ”تیرے وفا دیکھ لی بہاری محبت۔ ان پندرہ دنوں میں ایکٹا بھی تم لکھ نہیں بھانکا۔ امی جان بہت خفا ہو رہی ہیں؟“ فرزانہ اندر آ کر شکوہ کیا۔

”پہلے بیٹھ تو جاؤ پھر شکوہ شکایت کرنا“ فیصل نے بہت خوف کوار موڈ میں کہا۔

”کیا کر رہے تھے؟ لگ رہا ہے بہت مصروف ہو؟“ فرزانے پوچھا۔

”ہاں یار اب احساس ہوا ہے گھر کس طرح سنبھالا جاتا ہے؟“ فیصل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”گھر تو بہت صاف لگ رہا ہے۔ بہت اچھا سنبھالا رہے ہو۔“ فرزانے گھر میں چاروں طرف گھوم کر بولا۔

”آج ہی سارا دن لگا کر سارا گھر صاف کیا ہے۔ میری تو بہت تھک گیا ہوں“ فیصل نے عجیب سی تھکن ہجے میں سموک

بیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔

”صغوا“

اسم یوں لگا جیسے یہ مہک صفوکا وجود بن کر اس کے سامنے مجسم ہو گئی ہو۔

”میں اس مہک کو اپنے دل کے آئین میں منور تاروں کا۔“
یہ اس کا اپنے آپ سے عہد تھا اور وہ اس عہد کو گنبد کی صورت دینے کے لئے مواقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

○

وہ اپنے گھر بننے کے لئے بہت بے چین تھا لیکن اس کا حوصلہ نہیں بڑھ رہا تھا۔ اباجی نے جس طرح اس کے وجود کو اپنے غلبے سے چھپنی کر کے اسے اس گھر سے رخصت کیا تھا، ان راستوں پر اس نے پھر کبھی قدم ڈالے ہی نہ تھے اور نہ ہی اب وہ اس رستے پر چلنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں وہ دونوں سے بہت بے چین تھا۔ ایک غش نے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ فخر کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے اس دن بہت کر کے اپنے آپ کو حوصلہ بخیر اپنے گھر کی طرف قدم بڑھائیے کہ اچانک ماہ میں اسے اس کا پڑوسی جاوید مل گیا۔

”اے فیصل! کہاں جا رہے ہو؟ اس آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا تو شمسائی اور بچائی کی جھلک اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر جاوید کے قریب آ گیا۔

”کیسے ہو جاوید؟“ اس نے جاوید سے ہاتھ ملا کر پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے تم کیسے ہو۔ کہاں ہو؟ جاوید نے پوچھا۔

”جی رہا ہوں اسی آسمان کے تلے!“ اس کی آواز میں

محرومی نہ ہونے کے باوجود محرومی سمٹ آئی۔

”تم تو یہاں سے ایسے گئے کہ کبھی پلٹ کر خبر نہ لی؟ جاوید کی آواز میں شک و شبہ بھی تھا اور کچھ سناٹے کا شوق بھی۔

”بس موقع ہی نہ ملا،“ فیصل نے مصروفیت کا بہانہ بنایا۔

حالا کہ جاوید کو تو سب معلوم تھا۔

”تمہارے جاننے کے بغیر یہاں بہت تبدیلیاں آ گئی ہیں فخر بہن کی بھی شادی ہو گئی ہے اور تمہارے عادل کی بھیانی کی شادی ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی ہوئی ہے۔“ جاوید نے اپنی دانست میں اسے اطلاع دی، مگر فیصل کے کانوں کے رستے ایک قیامت اس کے دل میں برپا ہو گئی۔

”کیا وہ انجانہ ہو چکا تھا؟ اس کا دل ڈٹا تھا۔ پھر فوراً ہی آباہی کے الفاظ کو سمجھنے لگے کہ تمہارے لئے مگر کچھ ہو۔“

”اچھا ہی ہوا فیصل نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ جاوید کو اس

کہا تو فراز مسکرایا۔

”گتا ہے کپڑے دھو رہے ہو خود! فراز نے غسل خانے میں اور اس کے باہر کپڑے بکھرے دیکھ کر کہا۔

”ہاں بہ کام تو خود ہی کرنا تھا مجھے“ فیصل نے باورچی خانے میں جلتے ہوئے کہا۔ ”سوچا رہا تھا چائے بنانے کے لئے۔“

”اب تو تم گھر بسا لو!“ فراز اس کے پیچھے چلا آیا۔

”گھر بسا لو!“ فیصل نے اس کا جملہ دہرایا۔ ایک لمحے

کو اس کا دل بڑی طرح سے دھڑکا۔ گھر بسانے کا خیال آیا تھا تو صفوی ذہن میں آئی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ سا گیا۔

”کیوں یار کیا برائی ہے اس میں؟“ فراز نے اس کا کوئی

جواب نہ پا کر کہا۔

”برائی تو کوئی نہیں۔“

”پھر۔“

”پھر یہ کہ اب تم اطمینان سے میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے

پیو۔ فیصل نے اس کی بات کاٹ کر اس کا دھیان دوسری طرف

بٹھانا چاہا۔ مگر فراز نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اسی لئے تو کہہ رہا ہوں آپ شادی کرو۔ گھر والی آجائی

تو آرام تو ہو جائے گا۔ اس طرح بہ کام نہیں کرنا پڑ رہا ہے۔“ فراز

نے ملی ہمدردی کے ساتھ کہا تو فیصل بھی ایک لمحے کو سنجیدہ ہو گیا

”اسی تنہائی اور جیون کے خالی پن سے تنگ آ کر میں نے کئی

بار سوچا۔“

”مگر ابھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”ابھی ایک بہن باقی ہے جسے اپنے گھر کا ہونا ہے۔ اگر

وہ اپنے گھر کی ہو جائے تو پھر یہ اپنے باسے میں سوچوں؟ فیصل

نے دو لمحوں میں چائے انڈلی اور فراز کے سامنے رکھ دی۔

”پتہ نہیں کیسی بنی ہوئی؟“ فیصل نے کہا۔

”اچھی ہے بلکہ بہت اچھی۔“ فراز نے چائے کا پہلا پی

گھونٹ لے کر کہا۔

”اگر کبھی تنہائی ہوئی بیجا پڑی تو اسے یہ غم تو نہ ہو گا کہ

گھر کا کام کس طرح ہو گا؟ نہیں آہستہ آہستہ اس کی تربیتنگ

حاصل ہو جائے گی۔“ فراز نے کہا تو فیصل مسکرایا۔

فراز کے ساتھ کچھ دیر گزارنے کے بعد وہ بالکل فریش ہو

گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد پھر وہی تنہائیاں بچیں اور وہ تھا

مگر اب کے لئے اپنی ان تنہائیوں میں ایک خوشگوار سی مہک کا

احساس ہوا تھا جس نے اس کے وجود کو دھیرے دھیرے اپنی

کی کیفیتوں کا علم ہو چکا تھا۔

”میرے ساتھ گھر چلو گھر محل کر آرام سے باتیں ہوں گی“
جاوید نے گھر چلے گئے تو اس نے گورڈا لٹکا کر دیا۔ اب کس لئے اس
راستے پر اپنے قدم ڈال کر ان کو لوہا بن کر تا۔

”نہ نہیں یار مجھے ایک ضروری کام ہے جانا ہے پھر کبھی
آؤں گا۔ سب کو میرا سلام کہنا اور میری اکی کو چپکے سے میرا سلام
میں دینا اور کہہ دینا کہ میں غیر سیتے ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی
آنکھیں میچکے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے جاوید سے اپنا ہاتھ
چھڑا دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے
روح نکل رہی ہو۔ بار بار موت کی سی اذیت ملتی تھی۔

”یا اللہ مجھے لمبے لمبے کی موت کیوں مار رہا ہے۔ ایک
دفعہ ہی موت دے دے نا! اس نے خدا سے شکوہ کیا۔ خدا سے ہی
تو گھر کر سکتا تھا۔ مگر جانے ابھی اسے کیا منظور تھا۔ ابھی اور کتنی آزمائشیں
باقی تھیں۔ ضبط کے کن کی محلوں سے اسے گزرنا تھا۔ اپنے قدموں میں
تھکن اور وجود میں بے پناہ شکست کی اور روح پر بوجھ سا لے وہ جب
واپس لوٹا تو اپنے آپ کو فراز کے دروازے پر پایا۔

”میں یہاں کیوں آیا ہوں کیا میری منزل یہی ہے“ اس نے
دشک کو ہاتھ بڑھا دیا۔ دروازہ کھلا تو اسے واقعی اپنی منزل سامنے
نظر آئی۔ مگر وضندھی وضندھی صفوں نے دروازہ کھولا تھا اور
حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے آنکھوں سے ہی شکوہ
کر رہی ہو۔

”اندر آ سکتا ہوں؟“ فیصل کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔
”ہاں ہاں آئیے“ اس نے جلدی سے گھر کر فیصل کو
راستہ دیا اور وہ اندر آ گیا۔

”آپ بیٹھیں۔ میں فراز بھائی کو بھیجتی ہوں! وہ غائب
ہو گئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر
سارا دھواں بون فضا میں چھوڑ دیا جیسے سینے پر بہت بوجھ
سائیں ہوں اور وہ انہیں برداشت نہ کر پایا ہو۔
”مجھے موفیصل؟“ فراز نے اندر آ کر پوچھا۔ فیصل سگریٹ کے
دھوئیں میں اپنا دھندلا ہوا چہرہ پھیلے بیٹھیا تھا۔
”نکلتا ہے کسی کا سوگ منار ہے ہو؟“ فراز اس کی اس حرکت

پر مسکرایا۔
”ماں! انا سوگ منار ہا ہوں۔ اپنی خوشیوں کا نام کر رہا ہوں“

فیصل نے پھر گہرا کش لے کر کہا۔
”خدا نہ کرے فیصل میں تو مذاق کر رہا تھا“ فراز اس کے

قریب آ گیا۔

”یہ حقیقت ہے فراز آج ایک بار پھر ٹکڑا کر رہا ہوں
فرح کی شادی ہو گئی ہے اور عادل بھائی کی بھی لیکن انھوں
نے مجھے بلانا تو کیا مجھے اطلاع تک دینا گوارا نہ کیا۔ بھائی کے
بغیر گھر سے بہن رخصت ہو گئی اور دیور کے بغیر گھر میں بھائی
آگئی فیصل کا ٹوٹا ہوا لہجہ اپنے اوپر سے گزرنے والی قیامتیں
سنارہا تھا۔ فراز کو بہت دکھ ہوا۔

”یہ دکھ ہی ایسا ہے فیصل کہ میں نہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا“
”نہیں فراز۔ اب میں اتنا ٹوٹا ہوں کہ مزید ٹوٹنے اور پھرنے
کی گنجائش نہیں ہے مجھ میں۔ اب میں پتھر ہو گیا ہوں۔ اب میں
روؤں کا نہیں۔ بہت رو چکا۔ بہت آسٹو ہوا لے۔ میرے آسٹو
اب اتنے فالتو نہیں ہیں کہ میں انے در دو لوگوں کے لئے ضائع
کروں۔ اب تو کوئی آس ہی نہیں ہے فراز!“ دکھ اتنا شدید تھا
مگر ضبط کے مارے فیصل سے رو یا بھی نہ جاسکا۔ اس کے آسٹو
خفک ہو چکے تھے۔

”فیصل تم تو بہت حوصلہ مند ہو۔ تم میرے عزیز دوست
ہو میں تمہاری یہ بکھری بکھری ٹوٹی پھوٹی زندگی نہیں دیکھ سکتا۔
مجھے موقع دو کہ میں تمہارے لئے کوئی ایسی مستی تلاش کر سکوں
جو تمہیں سمیٹ سکے! فراز نے اس کی دھکی رگ چھڑادی۔
”کون ہے ایسا اس جہاں میں!“ فیصل کی آواز میں یابری
صاف ظاہر تھی۔

”کوئی تو ہوگا“
”نہیں فراز مجھے کون لڑکی دے گا؟“ کہنے کے باوجود وہ
نہ کہہ سکا۔

”تم اپنی پسند تو کیاؤ۔ ابھی تمہاری شادی کرو اتنا ہوں
فراز آج جیسے اس سے اقرار کرنے پر تیار بیٹھا تھا۔
”اپنی پسند؟“ فیصل کھوسا گیا۔

”ہاں ہاں بتاؤ۔ فراز نے اس کے جذبے کو سہارا دیا۔
”ڈرتا ہوں کہیں کوئی ایسے مجھ سے چھین نہ لے۔ وہ میری
زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے جس کا تصور ہی مجھے سائے
عنوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ بہت کوشش کی کہ تمہیں بتا دوں
مگر اس خیال سے نہ بتا سکا کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ اب تم پوچھ
لے ہو تو تمہیں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی راز بتانا ہوں فراز میری پسند
تمہاری بہن صفو ہے فراز۔ مجھے میری اس کشتی پر مصافحہ کرو دینا فراز
میں بہت بے رحم ہوں!“ فراز کی گود میں سر چھپا کر وہ سب کچھ کہ گیا۔
”فیصل! فراز نے اس کا چہرہ ادا کیا۔
”تم نے یہ بات کیوں پھپکی! مجھ سے۔ تمہاری خوشی پر میری

بہن تو کیا میری زندگی حاضر ہے۔ تم فکر نہ کرو فیصل۔ میری بہن کو تم سے بہتر ساتھی اور کون مل سکتا ہے۔ تم شادی کی تیاری کرو۔ میں اچھی جان سے بات کروں گا۔" فرانز نے اس کا بھیجا چہرہ چوم لیا۔
 "فرانز! خلسہ پہلے بار اس پر مہربانی کی تو وہ حیران رہ گیا۔
 "ہاں فیصل ایسا ضرور ہوگا۔ فرانز نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا۔

زندگی رفتہ رفتہ اپنے معمول پر آگئی تھی۔ فیصل نے زندگی سے جو سمجھوتہ کیا تھا وہ بہت خوبصورت تھا۔ صفو اس کے لئے بہترین شریک حیات ثابت ہوئی۔ اس کے دکھ سکھ کی ساری تھی اس نے اس پھر سے اسے کھوکھی جنت کا تونہ بنا دیا تھا جس جہن میں غصہ تھے پھر کھر خزاں کی بے دردرتوں کا اعلان کیا کرتے تھے وہاں صفو نے کیا ریاں بنائی تھیں۔ اب ان میں سبزہ مہکتا تھا۔ ہرے بھرے پورے تھے۔ خوبصورت پھول نگاہوں کو بہت تسکین دیتے تھے۔ رات میں رات کی رانی کی مہک پورے گھر میں پھیل جاتی تو فیصل اپنی اس چھوٹی سی جنت پر فدا ہو جاتا۔
 "تم نے تو اس کو جنت کا تونہ بنا دیا ہے صفو۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ گھر کبھی آباد نہ ہوگا۔ لیکن اب یہاں مہلتی آمدنے تو فیصل کھلا دیتے ہیں۔" اس کے اچھے کا پیرا صفو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہی تھی۔

"یہ تو میرا فرض ہے فیصل۔ وہ عورت ہی کیا جسے اپنے گھر سے محبت نہ ہو؟" اس نے فیصل کا ہاتھ تھام لیا۔
 "مہلتیں اس گھر سے بہت محبت ہے؟" فیصل نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں بھانکا۔
 "ہاں! اس کا کبھی کسی بناوٹ سے پاک تھا۔
 "اور مجھ سے! فیصل نے اس کے چہرے پر اپنی محبتیں تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو میرا سنگھار ہو فیصل۔ میری زندگی میں آنے والے وہ پہلے مرد جو مجھ سے خدا کے بعد چاہا ہے۔" صفو نے اپنی محبتوں کا اظہار کیا تو فیصل کا دل بے قابو ہو گیا۔
 "اگر صفو تم مجھے نہ ملیں تو میں مرجاتا۔"

"ایسی باتیں کہیں کرتے۔ خدا نے جب ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کیا ہے تو پھر خدا کی کیسی؟
 "ہاں صفو! ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ہم زندگی کے آخری سانس تک محبت کریں گے۔ وعدہ کرو۔" فیصل نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"وعدہ! صفو نے اس کے ہاتھ پر اپنا چہرہ ٹھکا دیا۔
 اور
 یونہی محبتوں کی چھٹاؤں میں فیصل نے بہت سفر طے کر لیا۔ یہ صفو اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ فیصل کی ترقی ہوئی تھی۔ وہ بہت محنتی تھی کبھی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ دفتر میں اس کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ اسی لئے تو اس کا عہدہ بھی بڑھ گیا تھا۔ تنخواہ بھی بڑھی۔ اب اسے اور نام سے نجات مل

اور
 فیصل نے اس یقین کو اپنے دل میں قید کر لیا۔
 اس کا چھوٹا سا گھر اس کے دوستوں کے دل کسب دیا تھا۔ اس کا اکلوتا گھر بھی پھولوں سے آراستہ کیا تھا۔ اس نے فرانز سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کیا تھا۔ صرف صفو کو مانگا تھا۔ گھر کی ضرورت کی چیزیں اس نے پہلے ہی لا کر گھر کو مکمل کر دیا تھا۔
 وہ خوشی سے میٹھے اور پھولوں کی مارک بیلوں سے سجے ہوئے۔
 یا۔ جہاں اس کی زندگی کی اولین تنہا بھی مہک رہی تھی صفو کا دُہن بارسا پاؤں پکیر کر اسے اپنی قسمت پر اعتبار نہ آیا تھا۔
 کاش کہ میری اس پسند کو اچھی جان اپنی پسند بنا کر اس گھر میں لائیں۔ اچھی جان کا خیال اسے بہت دکھائے گیا۔ اس نے پھولوں کے ہار تار کر صفو کے تالی پیروں کے قریب رکھ دیئے اور خود اپنا چہرہ ان پھولوں پر ٹھکا دیا۔

صفو آج ان پھولوں کو دیکھ کر احساس ہو رہا ہے کہ ان کی خوشبو اپنے آنکھ میں بکھیرنے کے لئے میں نے کتنے کانٹوں سے اپنا وجود زخمی کیا ہے۔ کبھی بار اپنے پاؤں لوہان کے کس میں بیٹھ کر کاٹھا لیا ہوا ہمارا انسان ہوں اور ابھی میری آواز سن سکتے نہیں ہوتی۔ خدا جانے ابھی اور کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تم میری شریک سفر ہو۔ ان کھٹن راستوں سے گھرانا نہیں۔ میرا ساتھ دو گی۔" صفو! اس کا لہجہ التجا بن گیا تھا۔ وہ صفو سے اقرار چاہتا تھا۔

اور
 جواب میں صفو کا مہکتا حنائی ہاتھ فیصل کے کچھے اٹھ گیا ہال میں آکر ٹھہر گیا۔ آنکھوں کی چٹھن اور چوڑیوں کی کھٹک محسوس ہوئی۔ مگر ساتھ ہی ایک حمد اس سانس اس کی رگوں میں اتر گیا۔ صفو کا یہ جواب اسی کی طرح حسین اور مہکتا ہوا تھا۔

"سچ صفو! اس نے صفو کا یہ جواب پا کر کہا۔
 "ہاں! اس کی خوبصورت آنکھوں میں محبت کا دریا اُمنڈ رہا تھا۔ فیصل نے زندگی کی اس پہلی اور بھرپور خوشی کو سمیٹتے ہوئے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

گئی تھی۔

اس شام وہ بہت خوش تھا۔ میٹھا لے کر گھر گیا تھا۔ اس نے گھر جاتے ہی صفو کو گھٹا ڈالا۔

”اے اے کیا کر رہے ہیں؟“ وہ چیخی۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔“

”پتہ بھی تو پٹ کیا بات ہے۔ یہ میٹھا تو کس سلسلے میں ہے؟“ اس نے تخت کی طرف دیکھا جہاں فیصل نے میٹھا لی کا ڈبہ

رکھ دیا تھا۔

”صفو تم میری زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہو۔ میری پڑموش ہو گئی ہے۔ اب میں اور رانا تم نہیں کروں گا۔ جلد ہی آجایا کروں گا اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے کارخانے میں ہائیڈروٹائڈنگ گا۔ اس نے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان ساری تفصیل بتائی تو صفو ہنس دی۔

”یہ بات آرام سے بھی بتا سکتے تھے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی؟“

”نہیں یہ بات آرام سے بتانے کی نہیں تھی۔ اٹاپ سے یہاں تک بھاگتا ہوا آیا ہوں کہ جلدی سے صفو کو تینا دوں؟“ اس نے بے صبری سے میٹھا لی کا ڈبہ کھولا اور گلاب جامن نکال کر صفو کے منہ میں ٹھونس دی۔

”خدا کرے فیصل آپ کو ہر قدم پر ایسی کامیابی نصیب ہو“ صفو نے غلوں دل سے دعا کی اور دوسری گلاب جامن اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈال دی۔

”تم میرے ساتھ ہو صفو اب مجھے کوئی غم نہیں۔ تمہاری دعاؤں میرے ساتھ ہیں۔ میں انشاء اللہ بہت ترقی کروں گا؟“ اس نے صفو کا ہاتھ تھام کر بہت یقین کے ساتھ کہا تو صفو بھی اس کے یقین میں شامل ہو گئی۔

اور

یہ صفو کی دعاؤں ہی تھیں کہ فیصل نے بہت ترقی کی۔ اس نے اپنے ایک نئے دست کے ساتھ اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ بہت محنت سے کام کر رہا تھا اس لئے کاروبار میں بہت فائدہ اور منافع ہوا۔ اور وہ اپنا پہلا منافع بیکہ گھر پہنچا تو صفو وہاں نہیں تھی۔

”صفو“ صفو اسرار سے گھر میں آوازیں دیتا وہ بھیہر آہنگ میں آگیا۔ ”کہاں چلی گئی؟“ وہ بڑبڑاتا۔ اسے اپنی ساری خوشی ماند ہو چکی تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دیوار کے ساتھ لی ہوئی پڑوسیوں کی دیوار پر سے بی اماں نے بھانکا

”فیصل بیٹیا!“ انھوں نے پکارا۔

”جی اماں!“ وہ تیزی سے پلٹا۔

”صفو کو ڈھونڈ رہے ہو؟“

”ہاں۔ کہاں ہے وہ؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ ہسپتال میں ہے!“

”کیوں کیا ہوا اسے؟“ وہ چیخا۔

اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ تم بھی تو اسے ایسی حالت میں بھوکے پیٹے گئے تھے۔ ابھی چلو میرے ساتھ۔ تمہارے لئے یقیناً کوئی خوشخبری ہوگی۔“ اماں بی نے ساری تفصیل بتائی تو وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا اور ایسی طرح کھر سے باہر نکل گیا۔ بی اماں کے ساتھ وہ ہسپتال پہنچا تو بے صبری سے صفو کے کمرے میں چلا آیا۔

”صفو“ صفو“ وہ بے تابی سے صفو پر جھک گیا جس کے چہرے پر بہت خراب صورت سا لڑکھیل ہوا تھا اور ہونٹوں پر بڑی کڑی مسکراہٹ تھی۔

”میں تو تمہارے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا تھا۔ مگر اب پہلے تم مجھے وہ خوشخبری دو گی جس کے لئے میرے بغیر میں یہاں آنا پڑا۔ کہاں ہے وہ؟“ وہ بہت بے صبر ہو رہا تھا۔

”بہت بے شرم ہیں آپ۔ بی اماں کیا کہیں گی؟“ صفو نے بی اماں کی طرف اشارہ کیا تو وہ مسکرا کر باہر چلی گئیں۔ اور فیصل صفو کے دوسری طرف آگیا۔ جہاں ایک خوب صورت کیل میں بہت پیارا گلہری گلابی سا بچہ سو رہا تھا۔ فیصل نے اسے بے اختیار گود میں اٹھا کر حودنا شروع کر دیا۔

”یہ میری خوش قسمتی کی علامت ہے صفو!“ فیصل نے صفو کی طرف دیکھا تو صفو نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

”اس کا نام ہے عرفی!“ فیصل نے اس کا چہرہ چوم کر کہا تو جانے کیوں ایک لمحے کو وہ آداس سا ہو گیا۔

”اگر آج اتنی میرے پاس ہوئیں تو اپنے پوتے کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔ مگر اب انھوں نے عادل بھائی کے بچوں سے اپنا دل بھلا لیا ہوگا۔“ جلدی وہ منسلک گیا۔

”فیصل! صفو نے اس کی بے چین حالت کو دیکھ کر اسے پکارا۔ وہ عرفی کو اس کے پاس لٹا کر اس کے قریب آگیا۔

”بولو!“ فیصل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”دکھ تو مجھے بھی بہت ہے لیکن تقدیر کے فیصلوں کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ لیکن نا امید نہیں ہونا چاہیئے۔ انشاء اللہ ایک دن ہمارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔“ صفو نے پھر بہت

پیارے سے اسے آسرا دیا تو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بہت شکستہ سا ہو گیا۔

”صفوف تمہاری عزت میرے دل سے ہر دم دور کر دیتی ہے میں نے لوگوں کا خیال آنا سے تو بے چینی ہو جاتا ہوں۔“

”اچھا۔ میں نے تو آپ کو خوشخبری دے دی۔ اب آپ بھی مجھے وہ خوشخبری سنا دیں۔“ مصوف نے اس کے سر کے بالوں میں اپنا ہاتھ بھا کر کہا۔

”ہاں مصوف عزیٰ ہمارے لئے بہت بڑی خوش قسمتی لایا ہے میں نے جس کاروبار میں اپنے دوست کا ہاتھ بٹایا ہے اس میں بہت منافع ہوا ہے۔ یہ دیکھو ابھی ہمدان منع۔ یہ دس ہزار کاویک ہے۔“ فیصل نے جیب سے جب تک نکال کر صفو کو دکھایا تو مصوف نے دل سے پھر دعا نکلی۔

”آپ ہر قدم پر کامیابیوں میں کھیلیں فیصل۔“ فیصل نے دھیرے دھیرے ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس کی تعلیم کے بعد بھی اس نے پرائیویٹ انٹر اور بی۔ اے کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مصوف کو پورے توجہ اور اپنی محنت سے اس نے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کی ترقی ہو رہی تھی عہدہ بھی بڑھ گیا تھا۔ ان کی فرم نے اپنی ایک اور شاخ کھولی تھی۔ اس کے تجربے، محنت اور حسن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اسے وہاں کا مینجر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہ شاخ شہر سے دور تھی۔ اس لئے اسے وہاں فرنیچر سے آراستہ، بنگلہ، لوکر اور ایک گاڑی بھی دی گئی تھی۔

وہ لوگ وہاں شفٹ ہوئے تو فیصل ایک بار پھر اداں سا ہو گیا تھا۔ مگر پھر مصوف نے اسے حوصلہ دیا۔

”فیصل خدا نے ہمیں اس خوبصورت گھر سے نوازا ہے مگر یہ اپنا ذاتی گھر تو نہیں ہے۔ خدا آپ کو بہت سے۔ ہم اپنا گھر بنائیں گے۔“

”ہاں مصوف۔ انشاء اللہ میں اپنا ذاتی گھر محل جیسا بنواؤں گا۔“ فیصل کی نگاہوں میں بہت چمک تھی۔ ایک عزم تھا اسے باپ کے الفاظ اچھی طرح یاد تھے، اس لئے اسے یہ کام کر کے دکھانا تھا اور قسمت بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

زندگی نے دو تیس سال بہت جلد بہت پیچھے دھکیل دیئے تھے اور ان دس سالوں نے انہی سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ وہ بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ ایک دم سے چھپے جان ہی باقی نہ رہی ہو۔ تین دن اور فرخ تو برسوں پہلے اس گھر سے رخصت ہو گئی تھیں۔ عادل اور سہیل کی بھی شادی کر دی تھی

لیکن سب کام تکمیل پا جانے کے بعد بھی وہی دامن اتنی دست تھے۔ گھر کی ویرانیاں اور تنہائیاں انہیں کاٹ کھلنے کو ڈرتی تھیں۔ اچانک جان تو بیٹے سے ملنے کی آس لئے ہی اس دنیا سے چلی گئی تھیں اور باجی عادل بھائی اور ان کی بیوی کے ہوتے ہوئے تنہا تھے۔ ان کی آنکھوں کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر ان کی آنکھوں کو لوہا بن کر چپکے تھے۔

عادل بھائی فرخ کی شادی پر پاکستان آئے تھے تو باجی کو ان کا گھر بسانے کی بھی فکر لاحق ہو گئی۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہوجی تھیں۔ اس لئے انہیں اب کیا اعتراض تو تھا۔ ان کے لئے کئی لوگیاں دیکھنے کے بعد ان کی نگاہ انتخاب نادک سی خوبصورت سیلے پر جا کر پھری تھی۔ نام تو اس کا ایسے تھا مگر جتنی بہت گلانی سی اور خوبصورت۔

عادل بھائی تو بیلے کو پا کر دل و جان سے خدا ہو گئے تھے وہ اس کی ہر بات مانتے تھے۔ یہ گھر اب چھوٹا ملنے لگا تھا۔ وہ اکثر عادل بھائی سے یہی کہتی تھی کہ دوسرا مکان لے لیں۔ اتنے لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ عادل بھائی کا بھی یہی خیال تھا مگر انہیں تو دوبارہ سعودی عرب جانا تھا اس لئے وہ بیلی کو بھیجا کر چلے گئے۔

”میں وہاں سے واپس آ کر کوئی ندر و بست ضرور کروں گا یا تمہیں اپنے پاس بلائے کی کوشش کروں گا۔ تم پریشان مت ہونا۔“

عادل بھائی اسے سمجھا کر چلے گئے تھے اور یہ سیلے کی خوش قسمتی سی تھی کہ عادل بھائی نے جلد ہی اسے اپنے پاس بلایا۔ سیلے کے جڑہ سیٹ ہو جانے کے چند دن بعد ہی باجی کے نام عادل بھائی کا خط اور ڈرافٹ سہا تھا۔ اس مرتبہ ڈرافٹ میں رقم کم لکھی تھی۔ یا سچ نہرا کی بجائے تین ہزار کا ڈرافٹ دیکھ کر باجی کو گھر جانی بھی ہوئی۔

”شاید مجھے میں غلطی ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اپنے آپ کو تسلی دی لیکن دوسرے ہی لمحے خط پڑھتے ہی ان کے امانوں پر جیسے اس سے پڑ گئی۔

انہوں نے لکھا تھا کہ شادی کے بعد ان کے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ شادی پر بھی ان کا کافی پیسہ اٹھ گیا تھا اور پھر بیلے کو وہاں بلانے کے اخراجات۔ اور اب وہاں ان کی فیس وادیاں زیادہ تھیں اسی لئے وہ اب انہیں یہی رقم بھیج سکیں گے۔ یوں بھی ان کے پاس اور کون تھا۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہوجی تھیں۔

”جی ہاں ضرور۔ اس سے اپنے آپ کو توسنبھا لائیں
جاتا اس گھر کو سنبھالتا“۔ آجی نے بڑی سختی سے کہہ لیا کہ
غور اور اکڑا ب تک نہیں ٹوٹی تھی۔

دوسرے شہریوں نے اپنے کے باعث سہیل ان سے ملنے
نہیں آسکتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بار بار کریم
خروج کرے آتا۔ بس خطرہ ہی گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار
سہیل کو اپنی نوکری اور اور نام سے فرصت نہیں ملتی تھی
اور اس کی بیوی کو گھر کے کام اور بچوں کی دیکھ بھال ہی کسی اور
کام کے لئے وقت نہ نکالنے دیتی تھی۔ ان سات سالوں میں
انہوں نے آجی کو چند ہی خط لکھے تھے اور خطوں میں ہی انہوں
نے اپنے دو بچوں کی پیدائش کی خبریں اور تصاویر بھی بھیجیں تو
آجی بے دل تھا مگر رہ گئے تھے۔

”اب اپنے بچوں کی اولاد کو بھیجیں ترس ترس کر دیکھو گا“
ان کے دل کی حسرت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اب تو آجی جان بھی
ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں کبھی کبھار فرح اور شبنم اپنے بچوں کے
ساتھ آتی تھیں تو ان کا دل بہل جاتا تھا۔ آجی جو کہ تنہا رہ گئے
تھے اس لئے گھر کی حالت دیکھ کر ان کا دل بھی رونے لگتا تھا۔
”یہ گھر کس طرح بگڑے گا“ اس نے آجی فیصل بھائی کو گھر
سے نہ نکالتے۔ آج وہ اس طرح تنہا تو رہتے۔ اس کی بیوی گھر
سنبھالتی۔ اس کے بچوں سے دو لڑکے ہوئے۔ شبنم نے آہ بھر کہا۔
”اس گھر کو تو جانے کس کی نظر کھا گئی“۔ فرح نے بھی اسی
ہجے میں کہا۔

”اس گھر کو کسی کی نظر نہیں آجی کے غلط اصول اور سبھا
ضد کھا گئی ہے“۔ شبنم نے بڑی نفرت سے کہا۔ آجی ان کی
باتیں سن رہے تھے مگر کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ اب کتنے بھی کیا۔
وہ دونوں تھوڑی دیر بعد کی گئیں تو گھر میں پھر وہی
اداسی اور تنہائی بگھڑ گئی جو ان کی رنگ رنگ میں زہر سا پھیر رہی
تھی۔

پچھلے دنوں سات سال بعد سہیل نے اکثر شکل دکھائی
تھی۔ وہ دفتر کے کسی کام سے کراچی آتا تھا۔ ساتھ میں بیوی
بچوں کو بھی لایا تھا کہ آجی سے مل لیں۔ آجی اس کے دونوں
خوب صورت اور پیارے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے
دل کو بہت ٹھنڈک ملتی تھی لیکن وہ بچے باوجود خوشش کے
بھی ان کے پاس نہ گئے۔ ان سے مانوس ہی نہ تھے کچھ دن تک
گھر کی تنہائی ان کے قہقروں سے گونجتی رہی۔ آجی نے دل کی تپنا
کا ہر عزم گھٹ گیا تھا لیکن اس بات کا ذکر ضرور تھا کہ ان کا اپنا

”مجھے امید ہے آجی آپ میری مجبوریں کا خیال
کرس گئے۔ خط کے آخری جملے نے آجی کو بہت تکلیف
پہنچائی تھی۔ انہیں عادل بھائی پر بہت ترس لگایا تھا۔ انہیں
نے دوسرے ہی دن ان کو خط لکھ ڈالا کہ تمہیں میرے لئے
تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے اتنی ضرورت
نہیں ہے۔ بس تم گھر کا کریم اور گھر کا خریش بھیج دو کرو۔“
یوں آجی نے عادل بھائی کی دستے دایوں میں کمی کر دی۔
دوسرے سال سہیل آیا تو آجی جان نے اس کی بھی شادی
کر دی۔

”بیٹا تم بھی اپنی دہن کو سافٹ لے جاؤ گے؟“ آجی جان نے
سہیل کو اپنے واپس جانے کی تیاریاں کرنے دیکھ کر پوچھا۔
”ابھی تو میں نہیں ہے جا سکتا اور یوں بھی یہ تمہارا
آخری چکر ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اگلے سال نہیں شفٹ
ہو جاؤں۔“

”کیوں؟“ آجی کو کوئی حد شرع لاتی ہو۔
”وہاں پر پاک تباہیوں کے لئے حالات اچھے نہیں ہیں۔
نکالا جا رہا ہے ہم لوگوں کو اسی لئے میں بھی اب آ جاؤں گا۔
سہیل نے جواب دیا۔

”تو پھر یہاں پر کیا کرو گے؟“ آجی نے اس کی نوکری
کی طرف سے فکرمند ہو کر کہا۔
”کچھ نہ کچھ تو کروں گا۔ بہر حال بھوکا نہیں مرؤں گا۔“

اس نے ہمیشہ کی طرح تلخ جواب دیا اور چلا گیا۔
ایک سال کے اندر سہیل کے کسی خط آئے تھے
جن میں اس نے یہی لکھا تھا کہ یہاں کے حالات اچھے نہیں
ہیں۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ وہ ایک سال سے بھی پہلے آ گیا
اب تو ساری کشتیاں چلی ہوئی ملتی تھیں۔ کوئی راستہ نظر
نہ آ رہا تھا۔ آجی کو اس گھر کی دیواریں گونج رہی تھیں
تھیں۔

”خدا تمہیں صحت دے گا بیٹا۔ آجی اب سوائے دعا
کے اور کیا کر سکتے تھے۔“

”بہت کوششوں کے بعد سہیل کو دوسرے شہر میں نوکری
ملی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں شفٹ ہو گیا تھا۔
”خدا اب عادل پر رحم کرے“ آجی نے کہا تو آجی جان
کے دل میں اک ٹوٹ سی تھی۔

”یہ گھر کبھر رہے۔ اگر آج فیصل ہوتا تو وہ اس گھر کو سنبھا
لینا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ وہ رو دینے کو چاہتیں۔“

خون ہی اس سے اتنا دور اور ریگڑ نہ رہا تھا۔

ایک مہفتہ بعد ہی سہیل نے جانے کی تیاری کر لی۔

”بھئی کچھ دن اور رک جاؤ۔ بچوں کی وجہ سے گھر میں رونے ہے۔ دل بھلا ہو ہے“ آبا جی نے بہت التجا سے کہا۔ مگر سہیل پراس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”میں آپ کا دل بھلاؤں یا اپنی نوکری کو دیکھوں؟“ اس نے بہت تلخ ہو کر کہا تو آبا جی کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ وہ تو ان بچوں کو بچی بھوکا اپنے سینے سے لگا کر پیار بھی نہ کر سکتے تھے۔ بڑی حسرت سے ان کو جانا ہوا دیکھتے رہے۔

عادل بھائی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کا انہیں بہت غم تھا مگر اب انھوں نے حالات سے بھونٹ کر لیا تھا۔

”اگر عادل کے بچے ہوتے تو وہ بھی مجھ سے اسی طرح دور ہوتے“ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نظر آتے تھے۔

ایک مہفتہ بعد ہی عادل بھائی کا خط آ گیا۔ اس میں رافٹ نہ تھا۔ ان کے ہاتھ کا پینے لگے تھے خط کھول کر پڑھا۔ عادل بھائی نے لکھا تھا کہ وہ اپنے مستقل طور پر کراچی آ رہے ہیں، سودہ سے پاکستانی نوکروں کو نوکریوں سے برخاست کیا جا رہا ہے انہیں اپنا مستقبل بنانا تھا اور یوں بھی وہ ساری زندگی تو وہاں رہ سکتے تھے۔

”اچھا ہے بھئی تم ہی آ جاؤ اپنے بوڑھے باپ کو سہارا دینے کے لئے۔ ایک نئی نوکری امیدوں کا مرکز ہو۔ سب نوکری خوشیوں کو پال کر دیا ہے“ آبا جی نے ان کا خط پڑھ کر بھیگی آنکھیں صاف کر لیں۔ عادل بھائی اور سہیل کے آنے کی وجہ سے گھر میں ایک باہر پھرنے والی تھی، لیکن آبا جی کو یہ رونے بہت اہلکی بڑی تھی۔

”میں اب اس چھوٹے سے گھر میں رہوں گی“ سہیل نے اتنے ہی چہچہ کر کہا تھا۔

”فی الحال تو یہیں رہنا پڑے گا“ عادل بھائی نے نہایت بے پارگی سے کہا۔

”میں اتنے چھوٹے سے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ صرف دو کمروں کا تو مکان ہے۔ وہاں تو ہمارے پاس پانچ کمروں کا مکان تھا۔ اپنی مرضی سے جو چاہے کرو۔ یہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ کسی اور گھر کا بندوبست کر۔ کم از کم تین کمرے تو ہوں“

”میں کوشش کروں گا بیٹی“

”مگر کب؟“

”دیکھ میں سدا سے ساری کشتیاں جلا کر کیا تھا اپنی نوکری چھوڑ کر گیا تھا۔ اب دوسری نوکری جانے کیسی اور کہے۔ فی الحال اسی میں گزارہ کرنا ہو گا“ عادل بھائی نے سختی سے کہا

تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے آتے ہی کمروں کی سینٹنگ بدل ڈالی تھی۔ کمرے میں پرانے طرز کا فرنیچر تھا۔

عادل اب یہیں رہنا ہے تو پھر اس گھر کو بنائیں فرنیچر بنانا لانا پڑے گا۔ اب میرے ملنے جلنے والے یہیں مجھ سے ملے آ رہے کریں گے تو کیا کہیں گے کچرہ سے واپس آ کر تمہیں تلاش ہو گئے“

پیلانے اور فرائش کی اور عادل نے دوسرے ہی دن پوری کر دی۔ نیا اور جدید طرز کا فرنیچر ایک کمرے میں سیٹ کر کے لئے ڈرائنگ روم بنوا دیا گیا۔ اور دوسرے کمرے میں بیڈا لمار کی ڈرائسنگ ٹیبل اور ضرورت کی دوسری چیزیں سیٹ کر لیں۔ آبا جی کا سارا سامان اننگ میں بکھر چکا تھا۔ آبا جی کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو اپنے سامان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”سہیل بیٹی میرا یہ سامان یہاں کس نے رکھا ہے؟ اٹھو! نے نہایت شفقت سے پوچھا اور جواب میں انہیں سہیل کی تیز آواز سنائی دی۔

”میں نے رکھا ہے؟“

”کیوں؟“

عادل آج ہی فرنیچر کے آئے ہیں جو میں نے دونوں کمروں میں سیٹ کر دیے۔ اس کے ساتھ یہ سامان بالکل نہیں بچ رہا تھا۔ یہ ٹوٹا پھوٹا پرانا سا رنگ آلود صندوق، کھنڈیوں پر ملے ہوئے کپڑے اور یہ عقدہ! اس نے نہایت حقارت سے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اس کے لیے سے انہیں بدشانت نہ کرنے کی ہوس بھی آ رہی تھی۔

”اچھا بیٹی میں اس کے نیچے رکھ لیتا ہوں!“ انھوں نے بڑے شکست خوردہ ہو کر کہا اور اپنی چیزیں صحن میں پچھے تخت کے نیچے رکھ دیں اور عقدہ ایک طرف رکھ دیا۔

”میں یہ تخت بھی یہاں سے ہٹا دوں گی اور یہاں لگے رکھوں گی“ اس نے آبا جان کے سامان کو پٹا ہٹے دیکھ کر کہا۔

”جب رکھو گا جب مٹا دینا ابھی تو میں پٹا مٹاؤں“ وہ تھک کر اسے سخت پریشانہ نظر آئے تو نیلے بڑے ہاتھ، ہونٹ، اندر ہلکے، آبا جی ہلٹ کر اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ ان کے سبکے چہرے اور لاڈلے بیٹے کی مویں جو تھکی۔

گھر میں ہر روزی نت نئے ہنگامے ہو کر آتے تھے بیٹی کی دھیر ساری گزشتہ تمام کو آ کر فی حق، پارٹیوں اور دعوتوں کا سلسلہ برقرار رہتا تھا جب دیکھو عادل بھائی پھل و ٹھکانا لائے آتے تھے دعوتوں کے لئے سامان لاتے رہتے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آبا جی کا دل کڑھتا تھا۔

”بیٹا تمہیں پلنگر نہ دلی نہیں کر سکتے؟“ آخر ایک دن انھوں نے کہہ ہی دیا۔
 ”نہیں آبا جی!“ عادل بھائی نے صاف جواب دے دیا۔
 ”یہ اے ان کی یہ بات سن لی تھی، فوراً کمرے سے نکل کر باہر آئی۔“
 ”عادل جو خرچ کرے ہے وہ اپنی کمائی میں سے خرچ کرے ہے۔ اسے کچھ مانگ نہیں ہے۔“ آپ نے ان پر کچھ خرچ کیا تھا وہ آپ کو دس سال میں اس سے دو گنا فائدے پہنچے تھے۔
 آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے، ”یہ اے ایک ایک لفظ تیر بنا کر بے پایا اور پھر اندر چلی گئی۔“ عادل بھائی بھی کچھ نہ کہہ سکے اور آبا جی نے پناہ چھوٹا لیا۔

پھر روز ہی ایسے طعنہ تشنیہ انہیں پہنچتے تھے کہ وہ دو سو روپہ کو کھانا کھا رہے تھے۔ بیٹا نے تو کہا جی کہ وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھ جائیں مگر وہ نہ مانے اور وہیں تخت پر چٹکی میں روٹیاں اور ایک کٹورے میں سالن ڈال کر تنبیہ کرتے۔ بیٹا دل میں تلملا کر رہ گئی۔

”عادل کو آنے دیں۔ ایک ایک حرکت بتاؤں گی۔“
 فقیروں جیسی حرکت ہے، ”اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بیٹا نے دروازہ دروازہ کھولا۔
 آنے والی اس کی سہیلیاں تھیں۔

”آؤ اندر آؤ“ بیٹا نے انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دیا اور خود بیٹھ رہا۔ ”آبا جی تخت پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے اور اس کی سہیلیاں انہیں دیکھتی ہوئی اندر آ رہی تھیں۔
 ”یہ کون صاحبہ تھیں؟ اس کی سہیلی نے منہ کر لیا۔
 ”عادل کے آبا جی یہ بیٹا کا کاٹ دار لہجہ آبا جی کے دل پہی

”میں تو سمجھی تھی کہ کوئی نوکر ہے جو اس طرح کھانا کھا لے۔“
 دوسری سہیلی نے بھی منہ کر لیا تو ایک زوردار قہقہہ پڑا جس کی صداؤں میں آبا جی کے دل کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔
 ”ابھی تو وہ سننے بھی نہ تھے کہ عادل کے کمرے پر بیٹا نے جو باتیں ان کے متعلق کہیں وہ ان کی روح میں بھی سوراخ کر گئیں۔“ آبا جی سے کہیں کہ اگر یہاں رہنا ہو تو ذرا تیز سے رہیں تخت پر گندے گندے رومال بکھرے رہتے ہیں۔ اخباروں کے تراشے پڑے۔ جوتے ہیں اور اسی پیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں آج میری سہیلیوں کے سامنے میری بہت اہمیت اٹھ گئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ تمہارے مسخرہ ہیں! ”بیٹا کا ایک ایک لفظ آبا جی کے دل میں انگاروں کی طرح برس رہا تھا۔

”میں ان سے بات کروں گا تم فکر نہ کرو“ عادل نے

اسے تسلی دے کر خاموش کر دیا مگر باپ کے دل پر گزر جانے والی قیامت کا اسے احساس تک نہ ہوسکا۔

دوسرے دن بیٹی کی سہیلیوں اور اس کے گھروالوں کی دعوت تھی۔ بیٹا نے ان کا تخت اس طرح صاف کیا کہ انہیں اپنی ضرورت کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ یوں بھی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ بس دل چاہ رہا تھا کہ تخت پر بیٹھ جائیں مگر اندر سے آنے والا شور اور قہقہے ان کے سر پہی در و کو مزید بڑھا رہے تھے۔
 ”بیٹا بیٹی، ڈرا دھراؤ،“ آخر انھوں نے بہت مجبوری کی حالت میں اسے آواز دے ہی ڈالی۔

”بیٹی ذرا چم تو بھر دو،“ انھوں نے اپنی بیماری سے ناگہ آکر کہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ کام کر لینے تھے۔

”میں یہاں آپ کی چلیں بھرے نہیں آئی۔“ عادل کو نوکری ملے گی تو آپ کو ایک نوکر کھواؤں کی چلیں بھرنے کا ہمارا اس نے بڑے طنز سے کہا اور اندر چلی گئی۔
 اور سب مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہوئے عادل کو اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ بارہو آبا جی کی کس طرح تواضع کرے آئی ہے۔

○
 عادل اپنے ساتھ جو کچھ لائے تھے وہ سب گھر سیٹ کرنے اور بیٹی کی فضول خرچیوں پر ختم ہو گیا تھا۔ ابھی تک ان کی نوکری کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ دو تین ماہ سے بڑی مشکل سے گزارہ ہو رہا تھا۔ قریبی جنرل اسٹور سے ادھار راشن آ رہا تھا۔

در آخر اس طرح کب تک گزارہ ہوگا؟ ”بیٹا نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں اپنی پوری کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ ایک جگہ انٹرویو ہے ہونے بھی پندرہ دن ہو گئے ہیں۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے“ عادل نے تسلی دی۔

دوسرے دن عادل کو اپنا منٹمنٹ لیٹر مل گیا تھا۔ ”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے نوکری مل گئی ہے۔“
 ”بیٹا!“ عادل کا لہجہ شکر سے بھر پور تھا۔

”کتنی تنخواہ ہے!“ ”بیٹا نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”پندرہ سو!“ عادل نے بہت بے دلی سے بتایا۔
 واقعی یہ تنخواہ تو ان کے لئے ناکافی تھی مگر کچھ نہ ہونے تو بہتر تھا۔
 ”کیا پندرہ سو!“ اب کے بیٹا کے چہرے کی باری تھی۔

”باں بیٹی فی الحال تو اسی پر صبر کرو!“
 ”مگر کیسے۔ آج کے اس ہنگامی کے دور میں کس طرح گزارہ ہوگا۔“ ادھار بھی چکانے ہیں۔ گھر کا خرچہ اکرایہ اور پھر

ملی۔ حالانکہ رات کو انہوں نے رکھی تھی۔

”بیٹا بیٹی۔ انہوں نے مجھ پر جو کمرے آواز دی۔ بیٹا
”کی آواز بن سنے کے بعد آئی۔“

”جی۔“ اس کا بچہ مار ڈالنے والا تھا۔

”بیٹا میں نے یہاں بیڑی رکھی تھی کہاں گئی! انھوں
نے ابھی اور نامور ساتشوں کے درمیان بے شکل پوچھا۔

”وہ میں نے صبح صفائی کرتے ہوئے پھینک دی تھی
اس نے بڑی بے دردی سے جواب دیا۔

”بیٹا میرے لئے تو وہ بہت اہم تھی۔“ وہ ہنسا کر
بیٹھ گئے۔

”شام کو عادل آئیں گے تو نگوا دوں گی۔ اگر اکبر ان
نشہ نہیں کریں گے تو قیامت نہیں بن جائے گی۔ اس نے بڑی

گستاخی سے کہا اور اندر چلی گئی۔
”اب میں اس گھر پر جو حجب ہوں۔ اس گھر کو میری

ضرورت نہیں ہے۔ ان کے سگے سہوئے دماغ میں نہ رہی
سوچیں رہ گئے تھے۔“

”شام کو عادل آئیں گے ہنسا کر اس نے واپس لوٹے تھے
کچھ دیر آرام کرنے اور چائے پینے کے بعد وہ باہر نکلنے لگے تو

اباجی نے آواز دے کر روک لیا۔ عادل واپس بیٹھے۔
”بیٹا تم کو اور کونسا ختم ہو گئے ہیں بیٹے آغا میں نے

آج دن بھر سے حقہ نہیں پیا“ انھوں نے اپنی ٹوٹی ہوئی آواز
میں کہا۔

”اباجی آپ اتنے کوٹوں اور تبا کو کا کیا کرتے ہیں۔ ہر
دوسرے دینے کے دن تو میں نے کراتا ہوں۔ آپ کو کسی پھل میں

بھی لاکر دیں گے آپ وہی ٹوٹی چھوٹی جلیہ اور میلا جلیہ حقہ لے کر
مہماؤں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ تو سہارا بھی لیا کر لیا کر لیا

عادل کے الفاظ کوئی سخت سی چیز بن کر اباجی کے ذہن نے ٹکرائے
تھے۔ وہ تو باہر چلے گئے تھے مگر اباجی کو تو مار ہی گئے تھے۔

”مجھے مرنے سے امید نہ تھی عادل!“ وہ بار بار یہی کہے
چلے تھے۔ ان کی بو بھی آٹکھوں میں آسکتی تھی۔ چہرے پر رعبت

کمزوری بھرتیاں اور ریشمی ہوئی شیعوئے ان کا حلیہ بگاڑ کر
رکھ دیا تھا۔ ان کے قدم احتجاجی منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔

آخر ایک دن تو یہ کرنا ہی تھا۔ عادل کا گھر چھوڑنا ہی تھا۔ انہوں
نے وقت سے پہلے ہی وہ گھر چھوڑ دیا تھا اور تارک یک لایوں

میں نکل پڑے تھے۔ نگ رہا تھا کہ قدرت نے آج سے دس سال
پہلے والی وہ تارک یک رات واپس لوٹا دی ہے۔ جو فیصل پر چلی

بن کر گری ہوئی۔
آج بیٹے کو گھر سے نکال کر لایوں کی نذر کرنے والا اباجی

آج اباجی کے جتنے کا خرچ الگ۔ ان سے کہہ دیں کہ اپنا انتظام
اب خود کریں۔ بیٹی نے آخری بات بڑی نفرت سے کہی۔
اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اباجی اس وقت اپنی دوائی لے کر
گھر میں داخل ہوئے تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے
ہی بیٹے کی تیز آواز سنائی دی تو دل کے اندر کوئی چیز پائے
کی طرح اتر گئی۔ درج تک میں سے جیسی بھیل گئی۔
”اے اباجی! اپنا انتظام خود ہی کرنا ہو گا۔ کھانسی
سے بے حال ہوتے ہوئے وہ سخت پرہیز کرے گئے۔ معلوم
خود پریشان تھے۔ ان کی خیر سربیت بھی دریافت نہ کر سکے اور باہر
نکل گئے۔“

پچھلے کئی دنوں سے ان کی طبیعت خراب تھی۔ عادل
کے کہنے پر باوجود انھوں نے ڈاکٹر کو نہ دکھایا تھا۔ جو شاید

پرہیز گزارہ کرتے رہے۔ اب طبیعت زیادہ بگڑی تو ڈاکٹر
کو دکھانے گئے تھے۔ دوائی لے کر واپس آئے تو سید کی لڑکی

کیسلی باتیں ان کے سینے میں آگ لگا گئی تھیں۔ کتنی دیر وہ کھاتے
رہے مگر بیٹے نے اندر سے پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔

انھوں نے خود ہی بانٹتے کانٹتے، گھر دوائی لی لی
اور سونے کی کوشش کرنے لگے مگر منہ ان کی آنکھوں میں

ہوتی تو آتی نا۔ وہاں تو ان کے سینے کا تپ کی نازک نازک
کریچاں بن کر ان کی آنکھوں میں اتر رہے تھے۔ ساری رات ان

کی آنکھوں سے ہونٹا رہا تھا۔
صبح عادل تو اپنی سرس جوائن کرنے چلے گئے تھے اور

آج اباجی اب بیٹے کے بس میں تھے اور وہ جی بھر کر اپنے دل کی بھڑک
نکال رہی تھی۔ اباجی خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ آج

ان کا سارا غور ان کے قدموں تلے ڈھیر ہو رہا تھا۔ ان کی سادہ
اکڑا آج جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اپنے بیٹے کی گستاخی پر انہوں

نے گھر سے بے گھر کر دیا تھا اور اس غیر عورت کو وہ اپنے منہ
سے اس کی بدترین زبانی اور حد سے بڑھتی ہوئی گستاخی پر ان کی

لفظ نہ کہہ سکے تھے۔
ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکتے۔ مگر کافی

دیر سے حقہ نہ پیا تھا اس لئے طبیعت بہت پوچھل ہو رہی تھی
اپنی اس عادت سے مجبور ہو کر انھوں نے اپنی ساری بکھرے ہوئے

کو جمع کیا اور اٹھ کر ایک ایک قدم اٹھاتے اپنی جگہ بھرے
چلے گئے۔ مگر وہاں دکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ تمباکو، نہ کوئلے اور

اور نہ ہی کوئی لکڑی تھی جسے جلا کر اس وقت کام چلا سکتے۔ وہ
اسی طرح نامراد ہو کر واپس آئے کہ اپنے تخت پر آکر انہوں نے

تکیے کے نیچے بیڑی تلاش کی کہ جب کچھ نہ ہوا تو وہ طلب
توڑنے کے لئے یہی استعمال کرتے تھے۔ مگر وہاں وہ بھی نہ

خود ان تارکبہ! انہوں کے سپرد تھا۔ اس قیامت خیز طوفانی رات میں فیصل کس طرح تیز پامو کا یہ اب احساس ہو رہا تھا۔ فیصل تو جوان تھا۔ ان یخ بستہ سواؤں کا مقابلہ کرنا بھی ملکہ ان کے پورے کمزور وجود میں آئی تا اب کہاں تھی۔ ان کی رگوں میں تو خون پہلے ہی بجھ رہا تھا۔ اب تو سانس بھی ساتھ نہ رہے رہی تھیں مگر ان کے قدم اٹھ رہے تھے۔ تارکبہ رات نے ان کے سارے رستے بند کر دیئے تھے۔ وہ تو کسی درخت سے ٹکرا کر وہیں گر گئے۔

منزل تو انہیں بھی مل گئی تھی لیکن احساس نہ تھا منزل نظر نہ آ رہی تھی۔ فیصل کی محل ملنا کو بھی کے خوبصورت بیدروم میں شاید وہ زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے۔ فیصل اس دن طوفان اور شدید بارش کی وجہ سے دیر سے گھر کو نہ آ سکا تھا۔ گھر کے باہر ہی ٹیٹ کے پاس درخت کے نیچے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گرا ہوا ہے۔ اسے آج سے دو سال پہلے والی وہ طوفانی رات یاد آئی تو وہ لرزسا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گاڑی پورے ہی کھینچی کی اور لاک کر کے تیزی سے باہر آیا۔ یہی طرح کا زندگی سے شکست کھا جانے والا ایک بوڑھا شخص بارش کے گندے پانی اور کچھ میں زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے انہیں اٹھایا اور اندر لے آیا۔

کال پہل کے لمحے پر صفونے دروازہ کھولا۔
”یہ کیا ہے کون ہے یہ؟“ صفونے حیران ہو کر پوچھا۔
”میری ہی طرح کوئی شخص مجھے اپنے گھر کے باہر پڑا ہوا ملا ہے۔ جانے کون ہے؟“ فیصل اپنے کپڑوں کے خراپے ہونے کا خیال کے بغیر نہیں اپنے خوبصورت ایرکنڈیشنڈ بیدروم میں لے آیا اور جیسے ہی اس نے انہیں بیڈ پر لیٹا یا ان کے ہاتھ کا پ گئے۔ دل ٹپ کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹ پکڑنے کے لئے ترسے مگر وہ کوئی بھی تو لفظ ادا نہ کر سکا۔

صفونہ جلدی سے گرم گرم دودھ اور لیٹن ملا کر لے آئے جب تک میں ان کے کپڑے تبدیل کر کے انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

فیصل نے ایرکنڈیشنڈ کپڑوں کو تیز کر دیا۔ ان کے گیلے اور گندے کپڑے تبدیل کر کے اپنا سیلیڈنگ سوٹ پہنایا۔ سیلیڈنگ گاؤں بھی پہنایا تاکہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ مدت انہیں بچائے۔

”آجی! آجی! فیصل ان پر ہکا بے چینی سے انہیں پکار رہا تھا۔ اسے یہ جانتے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ اس

حالت کو کس طرح پہنچے ہیں، تنازعہ اپنے آپ کو مہرائی ہے۔ وہ بے تابانہ پرکار رہا تھا۔ انہیں ہوش میں لانے کی کوشش میں وہ کامیاب ہو ہی گیا۔ انہوں نے اپنی کچھ بھی سہی آنکھیں کھولیں۔

”آجی!“ فیصل کا لہجہ ان کی حالت دیکھ کر ڈھلے لگا تھا۔
”کون ہو تم؟“ وہ بالکل نہ پہچان پارہے تھے۔

”میں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں فیصل۔“
”میرا کوئی بیٹا نہیں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ وہ پوری شدت سے چیخ لگے۔

”ایسا نہ کہیں آجی میں آپ کا بیٹا فیصل ہوں۔ اس وقت آپ میرے گھر پر ہیں۔“ فیصل نے ان کے دماغ پر زور دینا چاہا۔

”فیصل۔ فیصل!“ وہ بڑبڑائے۔
”ہاں میں فیصل ہوں۔“ فیصل نے ان کے کمر اور گال پر وجود کو تھام رکھا تھا۔

”یہ۔ یہ تمہارا گھر ہے اتنا خوبصورت!“ انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

”ہاں اب یہ آپ کا بھی گھر ہے۔ آپ ہاں رہیں گے میرے پاس۔ آپ بہت تلاش کے بعد مجھے ملے ہیں۔ میں آپ کا ستارہ بناؤں گا۔ آپ کا گھر بڑا کر چلا آیا تھا۔ آپ کو بہت دکھ دیتے تھے نا۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ گناہی نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کے لئے یہ محل بنا دیا ہے آجی!“ وہ ان کے کلمہ یاد کر کے رو پڑا تھا۔

”نہیں بنایا۔“ اچانک ہی ان کی آواز لرز گئی۔ سانس بھ گئی۔ ”معافی تو میں مانگے آیا ہوں۔ بیٹھے مجھے معاف۔“ ان کی آواز حلق میں الٹ گئی۔ سانس ٹوٹ گئی تھی اور وہ سارے رشتے توڑ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ بد نصیبی ایسی کہ معافی بھی نہ مانگ سکے۔

صفونہ دودھ دیکر اندر آئی تو فیصل ان کے سر ہانے سر رکھ کر رو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بولی۔
”اوہ! اوہ میرے ہی لئے وہ سمجھ گئی۔“
”مگر یہ شخص تھا کون؟ صفونے بہت سہرادی سے کہا۔
”یہ میرا بد نصیب باپ تھا۔“ فیصل نے ان کے اوپر چادر ڈال دی اور خود بھوٹ بھوٹ کر رو دیا۔



چہلے نوٹ



شکیلہ رفیق

رہی تھی صوف اس لئے کہ تم جو اتنی دیر سے کان کھلے جا رہی ہو! وہ بدستور تغافل سے بولی۔
 ”سبک ہے کھینچ۔ منجھ نے ٹھنڈی سانس بھری....“
 کیوں دیکھو گی تم خود جو کسی سے کم نہیں؟
 ”یہ بات نہیں۔ بلکہ مجھے اس کی ذات سے دلچسپی ہی نہیں
 غدار نے جواب دیا پھر بولی ”آؤ چلیں!“
 ”چلو“ منجھ نے یوں کہا جیسے اس کی امیدوں پر پانی پھر کر
 دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی بدرا چھٹا لگتا تھا اور اس کی خواہش
 تھی عذرا کو بھی وہ اچھا لگے مگر عذرا کے سر دروپیے سے وہ ناپسند
 ہو چکی تھی۔ دونوں مرکز کس روم کی طرف جا رہی تھیں۔ مگر بھی ہوا
 جازم کا نام مل ہی نہ ہوا تھا کہ عذرا کی نظر سامنے کھڑے اس
 شخص پر پڑ گئی جسے دیکھنے کی اسے خواہش نہ تھی مگر اب۔؟
 یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاؤں دھیں جم کر رہ گئے ہوں۔

بدرا اقبال :-

جس کے تذکرے وہ اس روز سے سن رہی تھی۔ جب سے
 اس نے اس کا لچ میں قدم رکھا تھا نہ صرف عام لڑکیوں بلکہ وہ لڑکیا
 بھی اس کے عشق میں مبتلا نظر آتی تھیں جو عرف عالم میں معقرا
 کہلاتی ہیں۔ عذرا نے ان سب کو بیک وقت اٹنی تیز دیدہ بایتہ
 مگر۔

اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھی احمقوں کو
 ہنس میں شامل ہوئی ہو۔ کیونکہ وہ تو حقیقتاً بے حد منفرد تھا۔
 سب سے الگ اور جدا۔ بالوں کا ساخنہ نم۔ عجیب پرک
 شخصیت تھی اس کی۔

کیا غلط کہتی تھی منجھ! اس نے سر ہا اور اسے ہلک جھپٹ

”طے“ غور سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ ورنہ عموماً لڑکیوں کو
 لفٹ نہیں کراتا۔ منجھ نے عذرا سے کہا ”اچھا“
 عذرا نے بغیر اس کی جانب نگاہ اٹھاتے بڑے عام لہجے میں منجھ
 کو جواب دیا پھر پوچھا ”پھر مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟“ اس نے
 مجھ پر بطور خاص زور دیا۔
 ”شاید تم اسے اچھی لگی ہو.... برا! منجھ تو کس قسم کا ہے....
 لڑکیوں سے تو یوں دور جھگٹتا ہے جیسے ان سے الٹی ہو....
 لڑکیاں کبوت خود ہی اسے شہد کی مکھیوں کی طرح کھیرے رہتی
 ہیں۔ اور وہ گردن اڑاتے کبھی ہوں اور کبھی ہاں میں جواب دیا
 کرتا ہے۔“ منجھ کو اس کے بارے میں بڑی معلومات تھیں۔
 ”تیس برس کس نے بتایا؟“ عذرا اب بھی بالکل سرسری انداز
 میں گفتگو کر رہی تھی۔

”یہاں پڑھنے والی لڑکیوں نے“ منجھ بولی۔

”لڑکیوں کو ادھر کوئی کام نہیں؟ بڑی معلومات ہیں اس

کے بارے میں؟“ وہ ہنسی۔

”ابھی دسی.... ان لوگوں نے تو مارے تختے کے اس
 کی سات پشتوں تک کو کھٹکاں ڈالا ہے.... اور اب بھی مزید تحقیق
 میں لگی رہتی ہیں۔“ منجھ نے مزید انکشاف کیا۔

”اچھا! ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟“ عذرا ابھی

لا پر دہائی سے بولی تو اب منجھ نے قہقہے چڑا کر کہا۔

مجھ سے اونٹنے بوٹے سوالات کرنے کی بجائے اگر تم اپنی یہ
 نازک سی گردن گھما کر ایک بار اسے دیکھنے کی زحمت کرو تو ہر سوال
 کا جواب اپنی خود بخود مل جائے گا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے اسے دیکھنے کی.... میں تو اب ہی پوچھ



تخلیق ہو اور — عذرا پھر اسے دیکھنے میں عجز ہو گئی، جو اپنے دوست سے بڑے خوبصورت انداز سے ٹوٹ گئی تھی۔
 ”عجیب کہنی تھی نائیں؟“ بچہ نے اسے یوں دوبارہ معرفت پایا تو پوچھا۔

”ایک ایک لفظ“

یہ اعتراض نہیں بلکہ عشق کی وہ چنگاریاں تھیں جو اس کے دل میں سلگنا شروع ہو گئی تھیں کسی لڑکے کو دیکھنے کے بعد آج تک اس کے دل میں ایسا درد نہ اٹھا تھا۔ مگر بدینہ کو دیکھ کر وہ پریشان سمجھتی ہوئی تھی۔ ہے واقعی ڈسٹر ب کر دینے والی شخصیت اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

”اب چلی؟“ بچہ نے کہا پھر شرفی سے ہنس دیا کہ بولی۔

— ابھی اور“ وہ غلجی کی ہو گئی۔

بغیر دیکھے چلی گئی، بالکل یوں جیسے سحر زدہ ہو گئی ہو۔ وہ کہیں سے ہی من پرست تھی، خوبصورتی سے وہ ہمیشہ ہی مرغوب ہو جایا کرتی تھی جہاں کوئی خوبصورت بچہ نظر آیا خواہ عورت کا ہو یا مرد کا۔ وہ بنا سوچے سمجھے اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتی کچھ ایسا ہی اس وقت بھی ہوا تھا وہ ایک ٹک بدر اقبال کو دیکھے چلی جا رہی تھی وہ تو شکر ہے کہ گالز نے لاچ رکھ لی ورنہ بچہ لگتی نظر دل کے تیر اس وقت اس وقت آ کر پار ہوتے۔

”کیا ہوا بھئی؟“ بچہ نے مسکاکر پوچھا تو پہلے پہل کچھ نہ سمجھتی مگر اب کچھ سمجھ رہی تھی۔

”آں —“ کچھ نہیں..... وہ.... میرا مطلب ہے وہی ہیں نہ وہ؟ وہ جھینپ کر زیر لب بولی

”آف کورس؟“ بچہ نے یوں فرسے کہلیے بدر اقبال اسی کی

”نہیں نہیں۔ چلو چلو۔ اس نے جلدی سے کہا پھر دونوں دلال سے چلی گئیں۔

عشق کے لئے بچانے کی کچھ کہا گیا ہے۔ کسی نے اے غل غل مانع کہا، کوئی اسے زندگی کا حاصل سمجھا، کسی نے آگ کے دیا کی مثال دی، کسی کا دعویٰ تھا کہ آگ دونوں جانب لگتی ہے، غمراہ کو اس آخری بات سے اتفاق تھا۔ اسے پورا احساس تھا کہ جس قسم کے جذبے نے اس کے دل میں الجھائی لی ہے وہ بد اقبال کو بھی مڑور پیکر کر لگا۔ غمراہ دونوں کے معاملہ میں کتنا ہی سنگدل کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات صرت ایک بوند کی بھی پچھلی یکن سلسل چپکن پتھر میں بھی سوراخ کو جتی ہے اور اسے پھر دوسرے کا بد اقبال پر یہ گہرا اور مسلسل احساس ضرور اثر انداز ہوگا۔ اپنے اس بھر پور یقین پر وہ اس روز جیون رہی۔ جب دو ہفتہ بعد ہی بد اقبال جی شائستگی سے اسے مخاطب کر رہا تھا۔

”مس غمراہ۔“

وہ کتاب پر چھٹی بڑی عریضت سے اسے پڑھ رہی تھی مگر ذہن میں اس وقت بد اقبال ہی گھسا بیٹھا تھا، جیسے تدریس صفحہ پر اسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

”جی۔“ بد اقبال نے آواز پر اس نے جھپک کر سر اٹھایا۔ وہ کتاب کے صفحے سے نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ غمراہ نے چند لمحے نا قابل یقین نظروں سے اسے دیکھا پھر ہلکے سے گھاس کے نشاٹ جھاڑتی کھڑی ہوئی۔

”جی نہ مانیے۔“ وہ اس سے بھی زیادہ شائستگی سے بولی۔

”اب سے ایک بات کرنی تھی“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا اپنا بہن تھا کہ غمراہ انکار کر سکی اور اس کی بات سننے اس کے ساتھ چلی گئی۔ بعد میں یہ ایک بات، بہت سی باتوں کا پوشن خیر بن گئی اور وہ جس نے بڑی بے نیازی سے مجھے سوال کیا تھا کہ ایسی کیا خاص بات ہے۔ بد اقبال میں! اب اس خاص بات کا ذکر ہر ایک سے مخفی نہ کیا کرتی تھی۔

جب وہ ذہن و دل ایک دوسرے کو شوشی طور پر تسلیم کر لیں انہیں قریب آگے میں دیر نہیں لگتی کچھ ہی بد اقبال اور غمراہ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ دونوں بہت کم وقت میں ایک دوسرے کے بے حد نزدیک آ گئے تھے۔ غمراہ کا تعلق چونکہ آزاد گھرانے سے تھا۔ لہذا وہ اکثر بد اقبال کے ساتھ کالج کے باہر کچھ لال لیتی تھی اور دونوں گھوڑے پھر بھی نکل جاتے تھے۔

اس عشق کو مزید ہوا بد اقبال رملکش نے دی۔ وہ ایک

نلیٹ میں تنہا رہتا تھا اس کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ اس کے والدین اور زیادہ تر شرف دار گھرانوں میں رملکش پڑھتے۔ اپنی تعلیم کے سلسلے میں وہ ابتدا ہی سے والدین سے جدا رہا تھا۔ اور اب آسے تنہا رہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ اور اب اسے تنہائی میں غمراہ جیسی پرکشش لڑکی کا ساتھ بھی نصیب ہو گیا تھا۔

”تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے اس بھر پور انداز میں متاثر کیا ہے یہ بات وہ کئی بار غمراہ سے کہہ چکا تھا۔ وہ جب بھی یہ جملہ سنتی تو اسے اس کا سر بند ہو جاتا۔ بد اقبال اجمیر لڑکی کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا۔ اسے اس قدر پسند کرتا ہے کہ اسے بے حد غمراہ کے دینے والی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج کل بد اقبال سے زیادہ غمراہ کی گردن میں متاثر تھا۔ لڑکیاں حد سے انہیں دیکھتی ہیں اور لڑکے بد اقبال کی فحشی برائیوں سے غمراہ کا دل برا کرنے کی پوری کوشش کرتے مگر سب کچھ رائیگاں جا رہا تھا۔ دونوں نے کان بہرے کر لئے تھے اور صرت ایک دوسرے کی سنتے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بد اقبال کا اپنا ذاتی ارادہ برپا کرنے کا تھا۔ تمام خوبیاں ہی تو اس میں ہوں گی تھیں۔ دولت مند گھرانے سے تعلق انتہائی روشن مستقبل کا خود اس کی ذات مراد و حاجات کا مکمل نمونہ۔ پھر لڑکیاں کیوں اس پر کشش جو دہ پر واز و ارشاد رہتی ہیں۔ جب کہ وہ لڑکیوں کو اسے کرنے کے لئے بھی نگرانی واقف تھا۔ مختصر ایک بالکل شخصہ اور جس نے غمراہ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ مقابلہ رنگت کے عدا برات میں بد اقبال کا برابر کا روبرو رہتی تھی بلکہ اس کا ملوہ دیکھ کر تو مجھے کا لگان گزرتا تھا۔

یہ دونوں کی خوش فہمی بھی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے پریورے اترے تھے بد اقبال ایک دم سفید تھا اور غمراہ رنگت کی مالک تھی۔

”یہاں میں تم سے مار کھا گئی ہوں بدر“ وہ اکثر بد اقبال سے کہتی۔

”نہیں! باطل لڑکی! اسے کہتے ہیں جھپٹی رنگت۔۔۔ او خیال کے مطابق چہرے کے لئے سب سے خوبصورت رنگت ہے۔۔۔ سفید رنگ میں بھلا وہ بات کہاں۔۔۔“ بد اقبال افسندہ نظروں سے دیکھتا۔

”تم مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہو۔“

”نہیں۔۔۔ تم ہو۔“ وہ کہتی۔

”نہیں تم۔“ یوں تکرار شروع ہو جاتی۔ دراصل اس کا تعلق دونوں ہی اپنی اپنی خوبصورتی کا اعتراف بھی کر رہے تھے۔

ایک عرصہ سے بدر عذرا سے مہر تھا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلے مگر وہ ٹال جاتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اسے بدر پر اعتماد تھا بلکہ اس میں جھجک یوں مالتھی کہ وہ روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھنے والی عورت تھی مگر باہر اسے جو وقت گزارنے کی اجازت تھی۔ اس کا پورا حساب اسے گھر پر دینا ہوتا تھا اور جہاں حساب کتاب ہوتا ہو وہاں خوف اور جھجک لازمی آڑے آتے ہیں بول بھی وہ سمجھتی تھی کہ مئی اس ملک کا معتاد نہ کریں گی کہ وہ کسی کو لینڈ کرتی ہے لیکن اگر انہیں یہ علم ہوا کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ اس کے گھر گئی ہے۔ تب یقیناً اس سے باز پرس ہوگی اور سزاوار بھی پھڑکے گی اور ممکن ہے کہ پابند بھی کر دی جائے۔ اس لئے وہ بدر کے بار بار کہنے پر بھی اس کی بات کو مانجی رہی تھی۔ آخر کار بدر کا امر اجاب حد سے تجاوز کر کے نہ نفعی کہ اسے پہنچا تب اس نے بڑی منت سے اسے ان خدشات سے آگاہ کیا۔

”لا حول ولا قوۃ! کیا دنیاوی باتیں کر رہی ہو تم؟ میں یہ ہرگز ماننے کو یا رہنیں کہ مہاراجہ مئی اتنی معمولی سی بات پر ناراض ہوں گی۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلا یا۔

”میں اپنی مئی کو بہتر سمجھتی ہوں بدر۔“
”ہاں سمجھتی ہوگی.... مگر تم یہ شاید نہیں سمجھتیں کہ یہاں بیٹھ کر بات کرنا بعض اوقات کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں نظروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے.... اور جہاں ہر لمحہ یہ دھڑکا ہو کہ ہمارے سب دیکھ رہے ہیں.... وہاں کیا خاک انسان دل کی بات کرے گا؟ وہ ناگواری سے لولا۔

”میں کہہ رہی ہوں بدر؟“ مئی کی بغیر اجازت جانے کو میں غلط سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ طلب کرنے پر اجازت ملے گی نہیں۔ اس نے لاچار دی سے کہا۔ چند ساعت خاموشی کی نظر ہو گئے۔ پھر بدر اس کے نزدیک ہو گیا اور سمجھانے والے انداز میں لولا۔ ”دیکھو میں تمہیں سمجھانا ہوں.... ضرورت ہی کیا ہے مئی کو بتانے کی؟“

”کیا مطلب؟“ عذرا سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بن گئی۔
”بھتی روز نہیں کبھی بھار تم میرے ساتھ چلی چلا کرو.... گھر

ہر کوئی بھی بہانہ کر دینا۔“
”یہ تم کیا کہہ رہے بدر؟“ وہ حیرت و شغی سے اسے دیکھنے لگی۔
”یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے.... جتنا تم اسے سیریس لے رہی ہو۔“ اب اس کے لیے میں رکھتی تھی۔

”تم سمجھتی کیوں نہیں بدر؟“ وہ اس کا بدلا انداز دیکھ کر قدرے غور شدہ سے بولی۔ مگر وہ مزید خفا ہو گیا۔

”میں سب سمجھتا ہوں، بچہ نہیں ہوں میں، جو تم مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو؟“
”بدر۔ پتیز۔“

”بس بس۔ اپنی یہ منطق اپنے پاس رکھو....“
میں بہر حال اس کا یہی مطلب لوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے اور.... جب اعتماد نہ ہو تو پھر ٹالنا بھی بکا رہے.... اس کے پیچھے میں اتنی عزیمت تھی کہ عذرا ابھرنے کی ہر کر اسے ٹھنکے لگی۔
”بدر.... بھلا تم پر اعتماد نہ ہو گا وہ بھی مجھے۔“

وہ دکھ سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی تب بدر نے زہر پٹے لیے میں کہہ ”پھر کیا بات ہے؟ وہ چپ چاپ اسے ٹھنکے لگی تو وہ فز سے ہنسنا۔ ”یا پھر غور پر اعتماد نہیں؟“

”کاش تم میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔“ وہ چھینپ سی گئی۔ ”اگر تم مئی سے....“

”مئی کو درمیان میں مت لاؤ۔“ بدر نے اس کی بات کا تادی مجھے یقین ہے کہ جب وہ کبھی مجھ سے میں گی تو یقین کر دوں گے کہ میں زیادہ مجھے بھروسے کا قابل سمجھیں گی۔

”تب پھر تم ان سے کیوں نہیں لینے؟ کوئی باری کی ہوئی بات اس نے چہرہ دہرائی۔

”میں نہیں جانتا چکا ہوں عذرا، کہ ابھی وقت نہیں آیا.... جس روز بھی میں اس قابل ہوں اب سے پہلے انہی سے جا کر ملوں گا.... تم یقین کرو عذرا! خانم۔“ مجھے سمجھنے کی کوشش کر دیں.... میں تم سے جوں کی حد تک پیار کرتا ہوں.... کوئی مذاق تو نہیں کر رہا تم سے۔ عذرا کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر انہیں اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

”بدر۔“ الفاظ اس کے گلے میں ٹھنکنے لگے۔ ”یقین کرو میرا مقصد صرف تم سے سیکو ہو کر گفتگو کرنا ہے اور کچھ نہیں.... ہر وہاں بیٹھ کر اتنے خوبصورت عہد و پیمان کرتے ہیں وہ سب اس مشکل فضا میں اپنا حق کھو دیتے ہیں اور تنہائی.... ایک عام سی بات کو بھی کتنا صہین بنا دیتی ہے اس کا اندازہ نہیں ابھی نہیں.... مگر اس وقت ضرور ہو گا جب تم اور میں تنہا.... بالکل اکیلے بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔

”عذرا اچھا!“ اس کے لیے کی اس گھلاوٹ نے ہی عذرا کو گھائل کر رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی آخر اس میں حرج ہی کیا ہے جس طرح وہ پڑھانی کے بعد اور کبھی بھی کلاس چھوڑ کر گھنٹوں بدر سے غور گفتگو کرتی ہے۔ اس طرح اس کے گھر میں بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے کہ کسی کے دیکھ لینے کے خوف سے سبھی نہات مل جائے گی۔ بدر عذرا کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے انکار اس کی موت ہی تو

اس نے مجھ سے بدتر گھر پر جانے کے سلسلے میں مشورہ لینا ضرور سمجھا۔ ”مجھ سے مشورہ کر رہی ہو میں یہ کہوں گی اس کی یہ بات نہ ماننا۔“

”کیوں؟ اس نے جی بھتی لگا ہوں سے اسے دیکھا۔“
 ”میں خود تو اسے دیدہ قریب سے نہیں جانی مگر جہاں اس بارے میں معلومات کا تعلق ہے وہ اتنی اچھی نہیں ہیں۔“ مجھ پر ہمدردی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“
 ”سنئے میں بتا رہا ہوں کہ وہ بظاہر مٹا چھا نظر آتا ہے انا دیکھتا ہوں۔“ مجھ نے بتایا تو وہ جھٹ سے بولی۔
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو مجھ پر اچھے رشتے میں روک روک کی ایک جھلک دیکھنے میں مجبور کر رہی تھی؟“
 ”ہاں ہم درست سمجھتی ہو مگر... اب میں اسے دیکھ نہیں پاتی۔“ اس نے کہا۔
 ”یہ اس لئے کہ... اس نے ہمیں مایوس کر دیا تھا؟“
 ”کے ہر لفظ میں کچھ ایسی کاٹ تھی کہ مجھ نے گھور کر اسے دیکھا کچھ دیر سے جاتے ہوئے بولی۔

”دوست ہونے کے ناتے ہمیں اچھا برا جو سمجھا سکتی ہو سمجھا دیا اب آگے بٹھاری مرضی... بہر حال آئندہ تم سے اس بات نہیں کروں گی اور نہ ہی تم مجھ سے کرنا۔“

”مگر...!۔“ عزرا نے قہقہہ لگایا، بدحواس تو انگریز کی کٹھن ہو گئے۔ پیاری کے لئے اس نے ترس کھا کر سو اسے مجھ کی کسی دلیل میں کوئی وقعت نظر آتی تھی۔ بدراقبال کو کے لئے اسے برائیاں بتانے کے لئے بعض انداز سے ادھلی بھلائی دیتی تھیں اور جلد کے سکھاس پر یوں جے بیٹھا کہ وہ انا زانو دوا منع کرنا بھی مشکل ہو۔ اس کے لئے ایسی ہی اور بوری دلیلیں کیا رکھتی ہیں۔

آج پہلی بار وہ بدراقبال کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آئے جسے فلیٹ کہنا زیادتی تھی کیونکہ وہ فلیٹوں کے تصور سے بالکل متضاد تھا۔ خاصا کشادہ اور خوبصورت طرز کا بنا ہوا فلیٹ تھا۔ میں ایک زمینی شے کی تمام خصوصیات مجوزی موجود تھیں جب کہ کے پیچھے پیچھے فلیٹ کی سبھیاں چڑھ رہی تھیں تو بدراصل کے باعث لوٹکھڑا رہ گیا۔

”مجھے اب شک لگتا ہے کہ تم نے میری بات لی ہے۔“ وہ تالا کھولتے ہوئے مگر مسرور سے انداز میں عزرا کے ساتھ کہا۔
 ”جب اندر جا کر بیٹھ جاؤں گی پھر تو یقین کر لو۔“

”میں... میں سوچوں گی۔“ اس نے دانستہ ٹھہر ٹھہر کر کہا، وہ جھٹ گیا۔

”سوچوں گی۔“ اسے بھی کیا سوچ رہی تھی؟ میں نہیں کھا تو نہیں جانتا تھا کہ وہ پھر مزارات سے ہونٹ داب کر بولا۔ جبکہ تم ہو کھا جانے والی چیز۔“

عزرا ایک دم چنپ کر سرخ ہو گئی۔ اس کی ایسی بیا کی عذرا کو کھل جاتی تھی کہ کبھی کبھی لگتی تھی۔

عزرا نے حامی تو بھر لی تھی مگر ابھی تک بہت زیادہ پیدا کر سکی تھی اس وعدہ کے بعد وہ کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی تھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایسا کر کے وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرے گی۔
 ”... اور کبھی اسے یہ بالکل عام سی بات لگتی۔ مجھ پر پہلے ہی اس کی جانب سے تشویش میں مبتلا تھی اسے کم پایا تو ایک روز اس سے پوچھ ہی بیٹھی۔

”کیا بات ہے آج کل کچھ آپ سیٹ نظر آتی ہو؟“
 ”کچھ بھی نہیں،“ وہ ہنس گئی۔

”مانا کہیں اب کچھ بھی نہیں رہی... مگر کبھی... بہت دور سے دوست تھی اسی ناتے سے بنا دو۔“ مجھ نے کہا تو وہ مشرمدی ہو گئی۔
 ”ایسی بات نہیں ہے مجھ پر!“

”پھر کیا بات ہے؟“ مجھ نے کہا مگر وہ پھر آہیں باہیں کرنے لگی اور مجھ کو بتائی کہ وہ بتا نہیں چاہتی لہذا مزید کچھ نہ پوچھا۔ اس نے پہلے ہی ایک باغدار کے رنگ دیکھ کر اسے سمجھا یا تھا کہ وہ سوچے سمجھ کر بدتر کے قریب ہو۔ پھر جب عزرا نے بدتر کو مجھ کی تنبیہ سے گاہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا تھا۔ ”بے چاری! ناکامی کے بعد اور کیا کہے گی؟“

”کیا مطلب؟“
 ”بھئی۔“ تم کیا سمجھتی ہو اس نے مجھے راغب کرنے کی کوشش نہ ہو گی؟ جبکہ یہاں کی پیشہ ور کیاں بھی چاہتی تھیں۔

”ہاں پسند تو وہ نہیں بہت کرتی تھی۔“ عزرا کو یاد آئے لگا۔
 ”تو میں... بات بالکل عیاں ہے۔ میں نے اسے بھٹکرا دیا

اور اب ناکامی حد تک اسے مل رہی ہے تو وہ نہیں میرے خلاف بھڑکائے گی نہیں تو اور کیا کرے گی؟ بدتر نے کہا تب عزرا کی سمجھ میں بھی آگئی کہ مجھ اور دیگر تمام جماعت لوگ کیا کیوں اس کی محبت کی مخالفت ہیں۔ وہ سکرا کر بدتر کو دیکھنے لگی۔

”مجھ میں آتی بات... بدتر نے پیسے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔“ سکرا طینان و اعتراض کے باوجود وہ جانے کی ہمت

وہ مسکرائی۔

”کیا پتہ؟“

پورے گھر کا جائزہ لینے اور تعریف کرنے بعد دروازے کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئی اور صوفے کی پشت سے گردن ٹکا کر بولی۔

”اب تو یقین آگیا؟“

”اول ہوں۔ اس نے بڑے مزے میں نفی میں گردن ہلاتی۔

”پھر کیسے یقین کرو گے؟“

”جب تمہیں چھو کر دیکھ لوں میں کس طرح یقین کر سکتا ہوں۔ اس نے شرعی سے کہا تو عذر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”ڈرلوک کہیں کی؟“ وہ کیا کیا۔ ”میں سمجھ گیا تھا یہ سننے ہی تمہارا دم نکل جائے گا بہر قوت چڑھا۔“

”جتنی بے فکر ہو کر بیٹھو۔ میں تمہارے اعتماد کو کبھی دھوکہ

نہیں دوں گا عذر جان! بس صحت اپنا یہ خلیں ساتھ میرے

ہاتھ میں دے دو تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ تم میرے گھر میں ہو۔

... جب کہ اس کی اجازت تم پہلے ہی دے چکی ہو اور پہلے بھی کئی

بار یہ خصوصیت ہاتھ میرے ماتحتوں میں آچکے ہیں مگر آج ...

آج تو تم میرے گھر میں ہو عذر! اس نے ایک ایک لفظ کو کچھ

ایسے ادائیگہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا کہ عذر اس کی جانب بڑھا

دیا۔ وہ صوفے سے اتر کر عذر کے مقابل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے

ماتحتوں میں مضبوطی سے تھام کر انھیں بند کر لیں۔

لے ان کے سروں پر پھینکے رہے۔

دونوں چپ تھے۔

گم سم تھے۔

آخر عذر نے ہی اس کو نگہ محبت کو زبان عطائی اور جذبات سے

کاپیتی آواز میں بولی۔

”برہ...!“

”بشنش!۔۔۔“ برہ نے اپنے خصوصیت ہونٹوں کو سکڑ کر کہا

”چپ رہو عذر!۔۔۔“ اپنی یوں کی خاموش بیٹھی تھی۔ میں ابھی اس

جنت سے واپسی کا خواہاں نہیں ہوں! اس نے یوں ہی آنکھیں

موندے ہوئے کہا اور عذر کو اس پر بے تحاشا پیارا لگیا کوئی اسے

اتنا رشتہ کر چاہے گا۔ اس نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

”ابھی چاہت۔۔۔“ وہ جس پر لڑچکا کا گمان ہوئے لگے۔

اس وقت اسے دربر پر اتنا پیارا لڑچکا کہ وہ اس پر سب

کچھ شاعر کی سی تھی مگر وہ اپنے قول کا پکا ٹکڑا اور اس نے اس حد

ایک لڑکے کی بجائے نہ کیا۔ بہت دیر سے اس نے آنکھیں کھولیں

ہو گلابی گلابی رنگ اختیار کر گئی تھیں۔

”تم غلط گھر میں پیدا ہو گئی ہو عذر! اس نے مختصر میں کہا۔

”اچھا وہ کیسے؟“ وہ پرسرست مسکراہٹ سے بولی۔

”تمہارے حسن کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم کسی بادشاہ کے گھر جنم

لیتیں۔۔۔۔۔ یقیناً تم کچھ عجم میں شہزادی رہی ہوگی۔۔۔۔۔ ہنس عذر کا۔

اس نے عقیدت سے کہا تو عذر اس پر کب سے یقین کرنے لگے؟

”یہ تم آؤ آؤ گون پر کب سے یقین کرنے لگے؟“

”ارے عذر! جی! تمہیں پا کر تو سب کچھ قابل یقین ہو گیا

ہے۔ اس نے لمبی سانس لی۔

”اچھا اب میرا ہاتھ چھو دو؟“ عذر نے کہا اور اپنے ہاتھ

کو دیکھا جو بدر کے مضبوط ہتھوں میں دبا ہوا بیس چمکا تھا۔

”ابھی سے ہاتھ چھو رہے تھیں! ابھی تو ابھی بدر کی طرح تھلا

بھی نہیں ہے۔ وہ شکوے سے بولا تو عذر نے کہا۔

”اچھا اب شاعری چھو دو میرا مطلب تھا کہ تم کو بھی یہ ٹھٹھے

رہیں گے یا کچھ چائے دانے بھی پلاؤ گے؟“

”چائے۔۔۔۔۔ ہاں بالکل۔۔۔۔۔ بس ابھی ملتی ہے یقین چائے؟“

اس نے کہا اور عذر کا ہاتھ چھو کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں ہے سانپ؟“ لاؤ میں چائے بنا دیتی ہوں! اس

نے دوپٹے کے کپڑے سے ماتحتوں کا بیسنہ پونچھا اور بدر کو رک دیا۔

”یہ بھی تانے بڑبڑوں والی بات؟“ وہ ہلک کر بولا۔

”مفتول باہیں مت کرو۔“ وہ شٹنا لگی پھر بولی۔ ”میں تو

اس لئے کہہ رہی تھی کہ تمہیں کیا خاک چائے بنانی آتی ہوگی۔

”اسی بات نہیں ہے خاتون! خاک سارے صحت ہے کہ چائے

بنانی جانتے ہو مگر بڑی ممدو چائے بناتے ہو۔

”تو چاد بناؤ؟“ وہ بولی۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ اب تو آپ ہی بنائیں گی؟“

”وہ کیوں؟“

”اس لئے کہ میں اس وقت تمہیں اور خود کو اس روپ میں

دیکھنا چاہتا ہوں! اس کا بڑبڑا ہوا معنی خیر تھا۔

”زیادہ خواب نہ دیکھا کرو؟“

”اب تو اس سے بھی زیادہ رنگین خواب دیکھنے کے حقدار

ہو گئے ہیں عذر! جی!“

”بھلا اس نے کرو۔ چہرہ جلدی سے چائے بنا کر لاؤ؟“ عذر نے

چھٹک کر کہا تو وہ مسخروں کی طرح اٹھ کر بڑبڑا کر بولا۔

”یہ تو فاصلے میں بیروں والا انداز ہے۔۔۔۔۔ پھر تو میں بھی فرباز

شوہر کی طرح ابھی چائے بنا کر لایا۔ پھر عذر کے لاکھ منہ کرنے

کے باوجود چلے اسی نے بنائی۔ اور اپنے اکتھول سے گھڑت گھڑت کر کے پلاتا رہا۔

اس پہلی انوکھی ملاقات کا نشہ عذرا پر دونوں طاری رہا۔ اس کے ذہن میں کبھی کبھار جواز دینے وہاں جانے سے پہلے سر اٹھاتے تھے وہ وہاں سے ہوا کر اٹنے کے بعد موم کی طرح پگھل گئے تھے۔ اور اسے فخر تھا کہ اس نے بدر پر کتنا صحیح اعتبار تھا یہی وجہ تھی کہ جب ایک روز بدر نے دوبارہ اس سے گھر چلنے کو کہا تو وہ بجز رضامندی ہو گئی۔

آج میٹرھیال چڑھتے ہوئے بدر کے قدموں میں اعتماد تھا وہ بھاری بھاری مفتوح قدموں سے اور چڑھ رہا تھا جب کہ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اسے قدم شکستے سے ہیں۔ گھر میں اگر وہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں کبھی بار بیٹھی تھی۔ بدر اس کے مقابلے صوفے کی بجائے نیچے ہی بیٹھ گیا۔

”کیا بد نظیر ہے یہ، اور بیٹھو نا“ اس نے کہا۔
”کچھ خادم ہمیشہ قدموں میں ہی بیٹھتے ہیں، وہ سعادت مند ہیں۔ چھکا تو عذرا اٹھیں دی۔“

”یہ تم تنہائی میں مسخرے کا روپ کیوں دھار لیتے ہو؟“
”بہنیں خوش کرنے کے لئے“ وہ پیار سے بولا۔
”کیوں“ وہ معذور ہو گئی۔

”اس لئے کہ تمہاری خوشی ہی اب میری خوشی اور زندگی ہے۔“
”تم نے میری ہر بات مان کر مجھے مسخ اپنا غلام کر لیا ہے عذرا۔“
”یقین کر دو تمہارے ان حسین قدموں کی آمد سے قبل یہ ملیٹ سب“
”کھہہ ہوتے ہوئے بھی قبرستان کی طرح سونا تھا۔“
”مگر اب! یہاں بہاریں رنصال ہیں.... جانتی ہو کیوں؟ صرف تمہارے اس ساغر وجود کے باعث“

وہ جب بھی ایسی باتیں کرتا اس کے انداز میں عقیدت نمایاں ہو جاتی۔

”بدر“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.... یہ سب تو میرے لئے باعث فخر ہے کہ تم نے سیلوڑوں اور کیوں میں سے میرا چناؤ کیا۔“

”وہ اس لئے کہ صرف تم ہی اس قابل نہیں کہ میری محبت حاصل کر سکو۔ اس نے کہا اور قریب ہو کر عذرا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لے۔

”وعدہ کرو یہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہی رہیں گے؟“
”کیا اب بھی تم اس کی ضرورت سمجھتے ہو؟“
”معاف کرو دو یہ اس نے عذرا کے ہاتھ اپنی حلیٰ ہاتھوں

سے لٹکائے پھر بولا ”یہ نہیں کیوں کبھی کبھی مجھے خوف گھیر لیتا ہے کہ تو مجھ سے چھین جائے گی.... بولو ایسا تو نہ ہو گا عذرا؟“

”کم از کم میرے جیتے جی تو نہیں۔“ وہ مزہ سے بولی تو اس نے عذرا کے ہاتھ اکتھول سے ہٹائے اور انہیں چوم کر بولا ”تم کتنی عظیم ہو عذرا.... عبارات کے لائق.... نہیں تو بوجھنے کو ہی چاہتا ہے.... تمہاری عبادت کرنے کو دل چاہتا ہے“
”کیا کوئی کب رہے ہو؟“ عذرا اکتھول تھیل ہوتے دل کو سنبھال کر بولی۔

”تم سے محبت میرے نزدیک عبارت ہی تو ہے.... تم سے پیار کرنے کو میں عبادت کا درجہ دیتا ہوں“ وہ جذب کے عالم میں کہہ گیا اور عذرا کے لالہ ہاتھ الٹ پٹ کر چھوڑا۔
عذرا سختی پر ڈٹی۔
”بدر۔“

وہ ایک دم ہی جیسے ہوٹل میں آگیا۔ اس کے ہاتھ چھوڑ کر قالین پر ملائیٹ گیا کچھ لمبے پیراں ہی سرک گئے خاموشیاں جب گونجنے لگیں تب عذرا بولی ”میرا خیال ہے اب مجھے چنا چاہیے؟“
”اسی سے؟“ وہ آٹھ کر بیٹھ گیا۔

”پھر کیا کروں؟ تم باتوں کے موڈ میں ہی نظر نہیں آتے“
اس نے کہا تو وہ ایک نعرہ مار کر اس کے قریب آ بیٹھا اور اپنے مخصوص عقیدت مندانہ فقرے دہرانے لگا۔ وہی سب کچھ کہنے لگا جسے سننے کی ہر عورت آرزو مند ہوتی ہے۔ وہ جب ایسی باتیں کرتا تو عذرا جیسے ہواؤں میں پرواز کرنے لگتی۔ اتنا دھیما اور سیلوڑوں اور کیوں کی توجہ کا مرکز۔ اتنی خوبصورت باتیں کرنا والا یوں اس کا دیوانہ ہے۔ یہ بات ہی اسے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اسی لئے جب بدر نے اس کی آنکھوں کا مشرب لگا ہوں سے پیتے ہوئے کہا ”تم غضب کی حسین ہو عذرا! ایمان سے۔“ تب وہ بولی۔

”تم سے کم؟“
”ہاں خیر یہ تو سچ ہے۔“ وہ مسخرے پن پر اتر آیا۔
”آپ کو کس کیوں نہ ہو.... کیونکہ اس وجہات کے بل پر اپنی پسند کی ہر روٹی کو اپنے قدموں میں لا کر ڈال سکتا ہوں اور اس سے جو چاہوں مانگ سکتا ہوں“ اس نے سینہ پھیلا دیا۔ پھر عذرا کے بدلے ہوتے موڈ کو دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”مگر آپ سے تو ہم ہار گئے عذرا جی! آپ کو قدموں میں لانے کی بجائے خود آپ کے قدموں میں بیٹھتے ہیں.... ہم تو خود گرفتار ہیں“

”نہیں نہیں تم تو اپنی ہی تعریف کرو“ وہ جل کر بولی۔

”تم کچھ بول دل ہی دل میں میری ہم خیال ہوگی.... مجھی کیوں نہ ہو مجھے اپنی وجاہت پر غرور.... جس نے تم میری صید کر جا دو گرا کی طرح قابل ہے۔“ وہ پھر پہلنے لگا۔

”اچھا اثرا دمت“ غدار نے نازے کہا پھر جانے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دوسری بار جلنے نے غدار کو مزید سرد کر دیا تھا اس کے بعد تو اکثر یہ ہوتا کہ بدر کے نہکے وہ کہہ دیتی ”آج میں تمہارے گھر چل رہی ہوں“ اور وہ مسخروں کی طرح کہنا ”چلو اٹھنے یہ دن بھی دکھایا۔ درنہ ایک دن وہ بھی تھے کہ ہم اٹھ کر جڑتے تھے اور عمر مرناک پر کھینچے دینی تھیں“ غدار مسکرا دیتی۔

ایک ایسے روز جب کہ موسم بھی خوبصورت تھا اور اس روز غدار بھی روزانہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ جب کہ غدار کا کہنا تھا کہ آج سے قبل بدر بھی اتنا پرکشش لگا ہی نہیں غدار تو بدر اور موسم دونوں ہی کی خوبصورتی سے متاثر ہو رہی تھی اسلئے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر بدر کو متاثر کرنے کے لئے تو صرف غدار کی ہی خوبصورتی کافی تھی اور غدار بھی پورہ تھا۔ اب ان دونوں میں پہلے جیسا تکلف نہ رہا تھا اور بدر کھل کر چڑی بے باکی سے اس کے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا جس میں درپردہ اس کے متناسب جسم کی تعریف بھی شامل ہوتی۔

”میں سچ کہتا ہوں تم اس کائنات کی سب سے بڑی حسین مخلوق ہو۔“ بدر نے کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے کہا جو غدار نے اُسے ہی ایک جانب سمیٹ دیا تھا تاکہ ابراہیم کو آسمان سے پوری طرح محظوظ ہو سکے۔

”اے ارے یہ کیا کیا؟ پردہ کیوں پھیلا دیا باہر اتنا اچھا موسم چورہ ہے۔“ غدار نے بدر سے کہا۔

”موسم تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتا یہ بدر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”نہیں کرو نا! ہٹا دو پردہ“ وہ بچوں کی طرح بولی تو بدر نے کہا۔

”تم یہ نظارہ دیکھنا چاہتے مونا تو اس سے بھی خوبصورت نظارہ نہیں دکھاؤں جو میرے پیڑروم کی کھڑکی سے نظر آتا ہے۔“ بدر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیڑروم میں لے گیا جہاں پردہ پہلے ہی ایک جانب تھا اور سامنے حقیقتاً ایک دلغریب منظر تھا۔

”ہائے۔“ میں مرا جاؤں“ غدار نے سٹھیاں پھینچ کر کہیں

بند کر لیں اور سیڑ پر بیٹھ گئی۔ وہ بچوں کی مانند بادلوں کے حسن

میں کھوئی تھی کہ بدر نے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ

لگے اور پھر ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ دپٹ کی جانب اُدھم

کر کے بولا۔

”میں تمہارے دشمن“

”چلو بڑے ہو بالکل! میرا یہ مطلب سمجھو تو اچھا کیج سچ سچ مرا جاؤں“ وہ زور سے سہٹی۔

”مگر میرا تو یہی ہوتا ہے کہ سچ سچ ہی مرا جاؤں“ بدر کی آواز مچا رہی ہوگی اور اس نے ایک بار پھر غدار کا چہرہ اُدھم کیا اور اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

”بدر....“ غدار افسانہ

”شش....“ بدر نے یوں ہی سرگوشی کی ”کتنی بار تمہیں بتایا

کہ میں یہاں کرنا میرے نزدیک عبادت ہے۔۔۔ پوچھا ہے۔۔۔

مجھے عبادت سے مت روکو“ کندھے پر اس کا دباؤ اور جھجھ

گیا۔ غدار نے متوش سا ہو کر مٹا چا اُسگروہ پوری طرح بدر کے

گرفت میں تھی۔ جو دیوانوں کی طرح کہہ رہا تھا عبادت کرنے دو

غدا جی! اب پڑ مجھے عبادت کرنے دو۔ پھر چونکا تو اسوقت

جب غدار کی سسکیاں جیکبوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ

چند لمحے ہونٹ کا شہر پھر مجرموں کی طرح بولا ”غدار پڑنا مجھے

معاف کر دو۔۔۔ میں.... میں.... میرا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

۔۔۔ میں اس موسم کا سارا قصور ہے جسے دیکھ کر میں بالکل ہو گیا۔

ات! غدار! غدار! مجھے معاف کر دو، مگر غدار روئے کئی تبا

ایک بار پھر اس نے مدغم اور بھانے والے انداز میں کہا۔

”دیکھو غدار.... تم اتنی بار یہاں آئیں.... کبھی میں نے

اپنا وعدہ توڑا؟.... آج بھانے کیسے.... پڑنا غدار! مجھے....

معاف کر دو“ اس نے ہاتھ جوڑ لئے۔

غدار نے سسکیاں روک کر دپٹے کے پورے اُسٹرو پڑنے

جو اتنی ہی تعداد میں پھیر لکل آئے، اور نفرت سے مدد کر دیا۔

”میں کھم تھا تاہوں کر اگلے ماہ ہی تمہاری جی سے ملوں گا۔

۔۔۔ اب.... اب میں تعلیم کے خاتمے کا انتظار بالکل نہ کروں گا۔

وہ کہہ رہا تھا اس کے چہرے پر سچائی کی چھاپ بڑی گہری تھی۔ اور غدار

نے بے بسی ہی ہو کر اس کے شانے پر سر رکھا کر پھر روزانہ دیکھا۔

بدر نے ایک ماہ بعد غدار کی جی سے بات کر کے کو کہا تھا

اور غدار سے یہ ایک ماہ گزارا مشکل ہو گیا۔ ایک ماہ کی ہمت

بدر نے اس لئے مانگی تھی کہ امتحان ہونے والے تھے۔ پھر

جب امتحان ختم ہوئے تو وہ غدار کی جی کے پاس جانے کے بجائے

نجانے کہاں چلا گیا۔ غدار نے اس کے دوستوں سے پوچھا خود

بھی اسے ہر جگہ تلاش کی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا وہ تو یوں کم ہو گیا

تھا جیسے ٹوٹا سا تار چھلی لکیر چھوڑنا نفا میں معدوم ہو جاتا ہے

۔ مگر غدار تو اس کی تلاش میں ہی دیوانی ہو رہی تھی کر لکیر سر کو

ڈوبنے کا بہار ارجان کر آگے چل نکلی تھی، دیوانہ پن رنگ ضرور

لا تا ہے۔ آخر کار اسے علم ہو گیا کہ وہ امتحان ختم ہونے ہی گاؤں

چلا گیا ہے.... اور جن لوگوں نے اسے یہ اطلاع بہم پہنچائی
انہی سے یہ علم بھی ہوا کہ پروانہ نہیں جھوٹا تھا۔ بدر اقبال :-
جسے غدر نے اُنا قیت کا درجہ دے رکھا تھا محض ایک سطحی
انسان تھا اس کی اتنی بڑی لغزش کے باوجود غدر اسے اُنا قیت
حیثیت یوں دیتی تھی کہ وہ ایک عزیز ارادی اور چاہک نعل تھا
اور پھر جب محبوب سے پیار عبادت کا درجہ رکھتا تو تب تو سب
کچھ جانتا تھا پر اب ؛ بدر آخری امتحان دے کر جا چکا تھا۔
اور اس کی ولایت کا اب کوئی ارکان نہ تھا۔ غدر کو حاصل کرنے
کے لئے بدر نے کتنی عیاری سے ابتداء سے لے کر آخر تک جو حال
سنا تھا اس کا بالوں اب کھل چکا تھا۔ لیکن غدر ایسی لڑکی نہ تھی
جو ایسے مواقع پر انس رہا کر کھڑی رہے وہ مسلسل بدر اقبال کے
تلاش میں تھی آخر اسے اس کا پتہ چل گیا۔

جب وہ بدر کے گاؤں میں داخل ہوئی تھی تو اس کے
کندے پر ایک چھوٹا بنگ بنگا ہوا تھا جس میں بمشکل ایک جوڑا
اسکتا تھا۔ تانگے والے نے اسے اس کی حوصلی کے سامنے
اتار دیا اور وہ اندر چلی گئی۔ بدر کی ماں سے متعارف ہوئی جو
ایک سیدھی سادھی عورت تھی۔ ادھر ادھر کی چند رسمی باتوں کے
کے بعد وہ بدر کی ماں سے کہنے لگی ۔ دراصل بدر کا نتیجہ آ گیا ہے
.... میں اسے وہی بتانے آئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ماں غرضی سے کھڑی ہو گئی۔ پاس ہو گیا
میرا بیٹا۔"

"ہاں ہاں بالکل.... آپ کا بیٹا تو مر امتحان میں پاس ہو جاتا
ہے۔ ماں! اس کے بول پر بدر نہر نہ تھی۔

"اگر تیرا احسان ہے.... مولیٰ کا شکریہ"۔ ماں نے اپنے بھائی
کہاں ہے وہ میں خود اسے یہ خود اسے یہ خود بخوبی سناتا
چاہتی ہوں۔"

"وہ کنزیت کی طرف گیا ہے۔ میں نے کل کا پانی تھا۔ کہا
تھا کہ پاس لگی ہے تازہ پانی پینے کو جی چاہ رہا ہے۔" ماں نے
بتایا اور پھر جیسے کچھ یاد کر کے بولی۔
"میں سناں تو منگوا لوں۔ بیٹی اب تم منہ
میٹھا کر کے جانا۔"

"ہاں ضرور.... آپ مٹھائی منگو کر رکھتے۔ جب تک
میں بدر کو لے کر آتی ہوں۔" اس نے کہا پھر زیر لب بولی۔ پیاس
بجھانے لگے ہیں خواہ مخواہ۔

آتے جاتے لوگوں سے کنزیت کا پتہ پوچھتی غدا جلی جا
رہی تھی کہ ایک سنان ہی جگہ کھیتوں کے درمیان سے جانی پہچانی
آواز اور جیسے اس کے کانوں سے اُٹھتا۔

"چھوٹے بالور۔ آپ تو میرے بدر جیتا ہیں۔" لڑکی
نے سسکی بھری اور اس سے پہلے کہ قیامت ایک بار بھر آئی۔

غدر اب وہ دل کو کھپتی پھیلا گئی بدر کے سر پر جو دھڑکی۔ لڑکی نے
سہمی ہوئی نظروں سے غدر کو دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کاہلی آواز
میں بولی "میرا.... کو.... کو...." غدر نے نہیں ہے ہم صاحب۔"
"میں جانتی ہوں۔" غدر اگمانے کیسے کہہ پائی۔
"غدا...." بدر نے سسکی کی بھرتی سے غدا کو مرکز ہونے
کی طرح غدر کو سینے لگا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
"ہوں تو بدر اقبال صاحب۔" آپ تو پھر زیادہ ہی پیار
ہوتے جا رہے ہیں.... کیوں؟
مگر آپ شاید بھول گئے کہ آپ نے مجھ سے بھی کچھ
عہد و پیمان کئے تھے۔"

"ہاں وہی غدر۔ جس کی محبت کو آپ نے سجدے کے
تھے.... آپ کو بتانے آئی ہے کہ وہ گاؤں کی بھری بھالی شاد
نہیں.... شہر کی باشعور غدر ہے.... جو اپنا حق لینا جانتی ہے،
مگر بدر۔! میں شیریں، لیلی، سسی، بہر اور سوہنی نہیں ہوں اور
زادہ کے ذائق میں تو پنے والی پرانی غدر ہوں.... بلکہ مجھے اپنے
دور کی غدر سمجھتے.... نئی غدر.... نئے دور کی وہ مجھ پر جو محبوب
کے ذائق میں تو پنے کی بجائے اس کے وصل کی خواہش مند ہوتے
ہے.... اور اگر محبوب بیوفا ہو تو نصیبوں کو کون سے کسے بجاتے
یا تو اپنا حق چھین لیتی ہے یا پھر انتقام اس کے سر پر بھوت بن کر
سوار ہو جاتا ہے.... بدر اقبال۔! ہمیں اپنی دھابت پر بڑا
گھنہ بڑھانا، اور اسی گھنہ کے سہارے تم عبادت جیسے مقدس
نام پر مزید لڑکیوں کو برا بد کرنا چاہتے ہو نا؟ تو لو.... میں آج اس
عزیز کو ختم کئے دیتی ہوں۔ تمہارے ناز کے پر ہی جلا دیں ہوں۔
لو.... بدر اقبال صاحب لو...."

غدر کی حالت بالکلوں کی سی ہو گئی۔ پھر اس نے اس کے
دلیرانگی کے عالم میں اپنی بھینچی ہوئی مٹھی کھولی اور تیزاب کے
چھینٹے بدر کے چہرے کو لہو بہان کر گئے۔

شادان نے بھی پھینکی مٹھیوں سے یہ سب دیکھا اور بابا
پکار کر لڑکھڑائی کا بیانیہ دور تک بھاگتی چلی گئی۔ غدر نے
بے حد اطمینان سے یہ سب دیکھا اور پیچہ سکون سے مڑی اور رخ
پر جانے ہوئے تانگے کو گٹھ دینے لگی۔ بدر کی خبیثی اور کرہیں
آسمان تک جاری تھیں اور وہ یوں شانت واپس جاری تھی
جیسے عبادت کا کام تو آج اس نے کیا ہو۔

صد سیک چٹش لپ

اختر جان



میں معاملہ مت بڑھاؤ۔

”میرا خیال ہے شک ہے کہ میں بے کار عدالت میں کھینچ کھینچ پھروں گی، اگر بغیر مقدمہ لڑنے صلح صفائی ہو جائے تو اچھا۔“ آپ نے بھی میاں دل توڑ دیا جو انسان چاہو کہ میری بھاتی پر چڑھ کر بیٹھا میں اسے بے مساف کر دوں۔ وہ تو اڑن پڑن کے لوگ اندر آئے میرے چھوٹے بچے جاگ گئے، سب نے خالم کو گھیر لیا، وہ تو چاقو سینے میں اتار چکا تھا مگر زندگی ہی بے غیرت تھی۔“ اس نے رقتہ ہٹا کر گلے سے لپک کر ترک بندھی ہوئی پیشیاں دکھائیں۔ ”وکیل صاحبہ عورت ہی عورت کا دکھ سمجھ سکتی ہے۔ اگر آپ نے بھی میری مدد نہ کی تو سمجھ لوں گی کہ انصاف دنیا سے اچھ کیا ہے۔“

”تجس نہیں گھبراؤ مت تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔“
وکالت کے ان پانچ سالوں کے دوران مجھے کہیں لپٹنے عورت مرنے کا احساس نہ ہوا تھا۔ میں عورتوں کی دنیا سے کٹ سی گئی تھی، عورتیں مجھے جھپٹتی تھیں، کنزرت اور تنگ نظر معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں خلوص کے بجائے حسد ہوتا ہے، اس کے برعکس مردوں کی ذہانت، وسیع النظری، خود اعتمادی اور خلوص کی میں قائل تھی۔ مردوں میں بیٹھ کر مجھے کبھی اپنے عورت ہونے کا خیال نہیں آیا اور عورتوں میں بیٹھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ان میں سے نہیں ہوں شاید اس لئے کہ میں ان کی دھیمی کی باتیں بھی نہیں کر سکتی۔ اور آج یہ اچھنی عورت میرے پاس صرف اس لئے آئی ہے کہ میں عورت ہوں۔ مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہوئی میری سنوائی غیرت جاگ اٹھی میں نے فحشہ کر لیا کہ میں اس عورت سے کچھ لے لوں اس کا مقدمہ لڑوں گی۔

مرد کا جو یہ بلوہ میرے سامنے لائی ہے، وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا اس لئے کہ مجھے مردوں کے متعلق بڑی قوت نہیں ہے۔ لیکن یہ عورت جس کے پاس دس سال کی گھر بیوہ زندگی۔ مسلسل غربانی۔ محنت اور مشقت کا تجربہ ہے۔ جو سات چور کی ماں ہے، مجھے مرد کا حقیقی پہلو دکھانے آئی ہے۔ اس مرد کا جو شراب پیتا ہے، جو اکھیندا ہے اور جو بیوی کی جان لینے سے بھی باز نہیں کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ حسد کا ہی سوال نہیں ہے۔ یہ ساری مظلوم اور مجبور عورتوں کا سوال ہے۔

”حسینہ تم آرام سے بیٹھو میں تمہارے لئے چائے منگوائی ہوں۔ پھر تم مجھے اپنے بارے میں اچھی طرح بتانا میں تمہاری مدد کروں گی۔“

وہ چائے پی رہی تھی اور میں اس کی سرخ سرخ آنکھوں

”وکیل صاحبہ میں آپ کے پاس اس لئے آئی

ہوں کہ کوئی مرد وکیل میرے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ میں نے چوک کر دیکھا۔ سیاہ رقعہ میں اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے۔ آنکھیں سرخ، سوجھے ہوئے پیوٹے اور تھمتے ہوئے کال۔ نفرت اور غصے کی تیز آگ میں اس کا سارا وجود جل رہا تھا۔

”میں سیدھی ہسپتال سے آ رہی ہوں۔ آج نمبر سے دن بات کرنے کے قابل ہوئی ہوں۔“ میں نے اسے ہنسنے کا اشارہ کیا۔ ”ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ تو خدا کو زندگی منظور تھی ورنہ آپ نے پرسوں اخبار میں یہ پڑھا ہوتا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو جان سے مار ڈالا۔ آپ سوچتی ہوں گی کہ کوئی بد چلی آواز؟“ وہ چپ سے آئی تھی برابر بولنے جاری تھی۔ مجھے اس نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔

”اعینہ ان سے بیٹھو۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”حسینہ۔“

”پڑھی کبھی معلوم ہوتی ہو؟“

”میسٹرک پاس۔“

”شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟“

”دس سال۔“

”کتنے بچے ہیں؟“

”سات۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔“

”میاں کیا کرتا ہے؟“

”کیا کرتا ہے۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور ہے فزیزہ سوز روپے ماہوار تنخواہ ہے کمیشن الگ۔ مگر ساری تنخواہ چرس اور شیشا کی نذر ہو جاتی ہے۔ وہ تو میرے ماں باپ کو اللہ جنت نصیب کرے۔ چہیز میں مشین دے گئے تھے، کپڑے سی سی گزرا رہے ہیں۔ اس پر بھی یہ حالت ہے جب پیسے نہ ہوں میرے سر پر تھلے کہ سوار ہو جاتا ہے۔ لاپیسے دے۔ اگر نہیں دیتی تو مار مار کر ادھوا کر دیتا ہے۔ میرے جسم پر کوئی ایسی گد نہیں جہاں میل نہ پڑا ہو۔ کیلچے پر پتھر رکھ کر اس کے بال بچوں کو پال رہی ہوں، کیا کروں۔ مانتا ہی چیز ہے۔“

”تم چاہتی کیا ہو میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”آپ... آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ اسے پھانسی پر

بھی چڑھا سکتی ہیں۔ پولیس میں رپورٹ ہو چکی ہے۔ ایک بیان

بھی دے چکی ہوں۔ دو وکیلوں کے پاس بھی تھی مگر وہی ذات اور انصاف۔ تو یہ کیجئے سب نے یہی کہا کہ صلح صفائی کر لو۔ پولیس

میں غم اور مصیبت کے سائے میں گزاری ہوئی زندگی دیکھ ہی
 سکتی جیسے تپتی و پھر جس میں انگاروں پر پلٹتے پلٹتے پیروں میں
 آبلے پڑ جاتے ہیں۔
 جب حسینہ سیاہ کر آئی تھی تو پھولوں سے لدی ہوئی موٹر
 میں بیٹھ کر اسے بہت خوش ہوئی۔ اسے موٹر بہت پسند آئی اور
 جب اس نے کچھ ٹھٹھ کی آڑ میں سے موٹر چلانے والے کو دیکھا
 تو اسے وہ بھی اچھا لگا۔

جب اس کا رشتہ آیا تھا تو رینگے اس کی ماں کو مبارک باد
 دی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اس کی اپنی موٹر ہے۔ خوب آمدنی ہے
 اور اماں نے اپنی میزک پاس خوب ضرورت بنی آٹھویں درجے
 تک پڑھے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دی۔ بخاندان اولوں
 نے بھی پاکر آجکل دولت مند، خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکیوں
 کے لئے بھی رشتے نہیں ملتے ہیں۔ حسینہ بری نہیں ہے کہ کوئی
 شہزادہ یا بیٹے آئے گا۔ یہی مناسب ہے کہ ہاں کر دو۔ سب
 کی رائے سے ماں نے ہاں کر دی۔

حسینہ نے شادی سے پہلے بشیر کی موٹر کے بارے میں بہت
 کچھ سنا تھا۔ بیاہلوں کی دنیا میں اپنے شہزادے کے ساتھ بیٹھ کر
 اس نے موٹر میں سیر بھی کی تھی اور اب وہ مستقبل میں ان سب
 جگہوں کی سیر کا خواب دیکھ رہی تھی جن کا نام ہی سنا تھا میری،
 نتھیا کلی اور کاغان۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں بشیر کے ساتھ ان
 سب جگہوں پر بھی آئی تھی اور اردو فلموں کے خوبصورت
 رومانوی مناظر میں خود کو بیرون کی جگہ اور بشیر کو میری کی جگہ بار بار
 دیکھ چکی تھی۔

شادی کے بعد جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ موٹر بشیر کی
 نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف اسے چلانے پر نوکر ہے تو اسے دکھ
 ہوا لیکن پھر اس نے اپنے شوہر کی طرف بیاہ سے دیکھ کر سوچا تھا
 ”بیران کی نہ یہ سارے دن رہتی تو ان کے پاس ہی ہے اسلئے
 ایک طرح سے ان کی ہی ہوئی۔“

بیاہ کو ایک سال گزر گیا بشیر نے کبھی حسینہ کو موٹر میں سیر
 نہ کرائی۔ اگر کوئی تجویز دیا تو البتہ ہسپتال تک چھوڑ آیا اور سواری
 ملے ہی یہ کہہ کر چلا گیا کہ تم میں آجانا۔ اور ایک دن جب وہ
 محل کی عورتوں کے ساتھ پیدل راجہ بازار جاری تھی بشیر کی کار
 اس کے بالکل قریب سے گزری۔ وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس میں کئی
 خوبصورت عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک تو بالکل ساتھ والی سیدیت
 پر بھی خوب بناؤ سنگھار کئے حسینہ کے دل میں کچھ کا سا لگا ہوا
 لہو شام کو اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر اور حسب معمول

بار بار بھانک کر بشیر کا انتظار بھی نہ کیا۔ وہ گھر آ کر سارے وقت
 روتی رہی۔ رات کو جب بشیر گھر لوٹا تو اس نے پوچھا ”کیسی طبیعت
 ہے؟“ حسینہ جس لاوے کو سال بھر سے سینے میں دبائے بیٹھی
 تھی وہ ابل پڑا۔ ”مہینیں میری طبیعت سے کیا، بہتاری میری شوہر
 میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ بہتاری بلا سے مروں یا جیوں؟“
 ”آج مہینے کیا ہو گیا ہے؟“

”اب تم کو سنا کرتی تھی آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا
 بی۔ سنو رہی عورتیں ساتھ لے گھوم رہے تھے۔“

وہ غصے سے چیخ پڑا۔ گھوم رہا تھا۔ بہتاری مطلب کیا می
 وہ سواریاں تھیں شریف سیکس کسی جگہ شادی میں جاری تھیں
 پیسے سے کسے بیٹھی تھیں۔

”بس بس رہنے دو۔ ایک تو بہتارے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔
 کیا بناؤ سنگھار کیا تھا۔“

”مہلہ اتو مارا چل گیا ہے۔ اگر صورت دیکھ کر سواریاں
 نہٹھیا یا کروں تو بہتارے لئے یہ نوٹ کہاں سے لاؤں؟ اس نے
 سہس کر پوٹہ حسینہ کی گود میں بھینکا اور بولا۔

”اب کل سے کوئی اچھڑے پڑے ہوئے خوبصورت عورت
 ٹیکسی کے پاس آئی تو صاف انکار کروں گا کہ میں نہیں بٹھا تا میری

دل کی بات کو بھولنے والا
 کے توجہ دل کا انداز زندگی کی حقیقتوں
 کے توجہ دل کی حقیقتوں و مشہور افادہ انداز

شکیلہ رفیق

کے منتخب آفسانوں کا پہلا مجموعہ

ہفت کا دھواں

آئینہ طاعت ○ جلد ○ سفید کافز

خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار ○ کراچی ۱

گھر والی خفا ہوتی ہے۔ بھوکے مریں گے تو دیکھا جائے گا۔
 حیدرہ میں بڑی وہ سارا غصہ بھول گئی اس نے نوٹ گئے
 اور پھر شکی اور متلاشی لگا ہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ کر بولی: میں
 تو نصف گریہ یعنی تم اتنی سی بات کا بیچ بیچا رہا مان گئے۔
 جب تک نئی نئی شادی تھی لڑائی جھگڑے میں بھی لطف
 آتا تھا مگر رفتہ رفتہ نوک جھونک تو تنکار میں بدل گئی۔

حیدرہ کی باتیں بشیر کو عذاب جان معلوم ہونے لگیں۔ وہ
 صفائی پیش کرنے کے بجائے ضد میں آجاتا اور فوراً یہ کہہ کر گھر سے
 نکل جاتا کہ "تفریح کرنے جا رہا ہوں" رات کو دیر سے واپس آتا۔
 ایک دفعہ حیدرہ کو اس کے غم سے بولا: وہ کڑوی مسکراہٹ سے
 بولا "اب لوگ ولایت پیتے ہیں۔ میں دسی بھی نہ ہوں۔ سارا دن میکی
 چلا چلا کر تھک جاتا ہوں۔ تم صبح سے شام تک پلنگ توڑتی ہو۔
 نہیں کیا نہیں کتنا تھک جاتا ہوں۔ اگر دو گھنٹہ پی لینے سے
 تھکن اتر جاتی ہے تو کیا حرج ہے؟"

رفتہ رفتہ بشیر نے بہت زیادہ مینا شروع کر دیا۔ گھر میں
 کھانے والے دو پیٹ اور بڑھ گئے۔ حیدرہ جب پیسے مانگتی یا
 پوچھ کرئی تو کالی کالوچ کی نوبت آجاتی اور ایک دن تو شہین
 بشیر نے پاس پڑی ہوئی چوٹے کی کٹڑی اٹھالی اور حیدرہ کو اتنا مارا
 کہ وہ اودھوٹی ہو گئی۔

حیدرہ کو جب ہوش آیا تو بشیر کا نقشہ بھی اتر چکا تھا۔ وہ
 نادم اور شرمسار دکھائی دیتا تھا۔ اس روز وہ جلدی لگے واپس آگیا
 اور حیدرہ کے لئے جاپا نی پ اسٹک اور گلابی پود کا ڈبہ بھی لیکر
 آیا۔ مگر حیدرہ کے آتشو سی طرح نہ رکے۔ اس نے اپنی مری ہوئی مال
 تک کر غصے میں پرا بھلا کہا۔ اے اپنی بھو بھی کا بیٹا خالد یا دا یا حیدرہ
 سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ سارا ٹھیکہ لے جھڑپا تھا۔ بشیر کی
 شکایت کے سامنے اس کے شہسپے کی کیا حیثیت تھی۔ حالانکہ ٹھیکہ خالد کا
 تھا اور نوٹش کی نہیں ہے۔ کاش اس کا بیٹا خالد سے ہو جاتا۔ وہ بڑا
 سا ٹھیکہ لے کر نئی خوشی بکری کر کے گھر آگیا کرتا۔ اس کے ٹھیکہ کا ہڈی
 آٹھ آنے کا ہوتا تھا لیکن بکری خوب ہوتی تھی۔ خالد اُسے کتنا چاہتا
 تھا۔ اگر کبھی غصہ ہی آتا تو وہ ساتھ کھینے کی محبت کا ہی پاس کرتا۔
 خاندان کا ڈر نہ ہوتا۔ وہ صرف اس کی بیوی ہی نہیں مانوں کی بیوی بھی
 ہوتی۔ مجال نہ تھی کہ کڑی نظر سے کیفیت۔ مگر اس کے مقتدر میں بشیر
 کے جوتے اور ڈنڈے نہ ہی لکھتے۔

پہلے تو حیدرہ صبح ویکار کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتی تھی
 مگر اب تو مرد و خوت زوہ بہت کڑی نظر سے نہ جانے کیا کر بیٹھے۔

شرابی اور پاگل لٹا کیساں ڈر موتا ہے۔
 جب بچوں کی بڑھتی ہوئی فوج کا پیٹ بھرنا اور دن دکھانا
 دشوار ہو گیا تو حیدرہ نے اپنی جہیز میں آئی ہوئی مٹھن کو زندگی کا
 سہارا بنالیا۔ تھوڑی سی محنت سے وہ اچھے خاصے کڑے بننے لگی۔
 پھر گھر کے قریب ہی دستکاری کا اسکول تھا۔ وہاں حاکم کرکھائی اور
 سلاخی کا کام بھی سیکھا اس لئے اس کی ابھی خاصی گزر رہی تھی۔

بشیر کو ہر وقت آوارہ اور شرابی دوست گھر سے ہٹتے تھے
 آدھی رات کو جب وہ لٹے میں پور گھر کو تھوٹا تھوٹا بات بات پر غصہ
 آتا۔ اگر حیدرہ فوراً بھی نہ کہتی تو وہ ڈنڈا اٹھالیتا۔ ڈنڈا کتنی۔ اچھی
 چیز ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ڈنڈے کی زبان ساری دنیا سمجھتی ہے۔
 جس کی لاشی اس کی بھینس ہی نہیں بلکہ حس کے ہاتھ میں ڈنڈا اس کے
 ہاتھ میں کرے۔ نئے میں اس کی باتوں کو دہونے کی بڑبھڑ کر وہ چپ
 ہو جاتی تھی۔ جب کبھی بشیر کے پاس پیسے نہ ہوتے وہ حیدرہ سے
 مانگتا۔ حیدرہ آگ کو لا کر جاتی۔ صاف انکار کر دیتی۔ شرم نہیں آتی۔
 جان مار کے رو پیسے لاتی ہوں تو میرا کھانا دبا کے لیتے ہو۔ سارا
 دن میں چلا چلا کر ٹوٹ جاتی ہے۔ یاد وہ الگ دہو کرتے ہیں۔ بشیر
 آج سے باہر ہو جاتا۔ توڑ کر پھینک دوں گا تیری مٹھن کو، بڑی آئی
 مٹھن والی۔ وہ صوف جاتی ہے۔ حیدرہ جانتی تھی کہ وہ بائبر دل ہے
 وہ مٹھن نہیں توڑ سکتا۔ اے معلوم تھا کہ سات بچوں کی فوج اسی
 مٹھن کے سہارے چل رہی ہے۔

سارے دن سلاخی پائی کا کام کر کے وہ اتنی تھک جاتی تھی
 کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ رات کو جلدی سے بڑکسو جائے جو کچھ وہ
 سوکھا گھر ہو گا کھلا کھل کر بچوں کو سلا دیتی اور پھر خود بچے کی نو پر
 نظر سے جائے دروازے کی کٹڑی پر کان لگائے بیٹھ رہتی۔ اس
 کا سارا جسم ٹوٹ رہا ہوتا۔ نیند اور تھکن سے بوجھل کر کھول کھول
 مل کر وہ آدھی رات گزار دیتی کبھی کبھی اسے ڈر گناشا بدلتا وہ
 نہ لگے لیکن وہ ضرور آجاتا خواہ آدھی رات گزر جائے مگر وہ گھر
 ضرور واپس آتا۔ اور اگر وہ جلدی دروازہ بند کھولے گی تو دروازہ
 پیٹ پیٹ کر سارا محلہ سربراہ اٹھ جائے گا۔ اگر سوال جواب کی نوبت
 آتی تو پھر ڈنڈا اس کے پاس ہے ہی۔ وہ کسی بار اٹھ کر چھوٹے
 سے آگن میں جاتی۔ سردیوں میں بشیر سے لٹنے میں ہوا بھی لگ جاتی
 اور جسم کا در در ٹھہر جاتا۔ مگر ڈوسس کے دروازے کی کٹڑی پر
 اسے اکثر پناہ دہن دینے کا گمان ہوتا۔ زندگی گزر رہی تھی۔ وہ اپنے سب
 باتوں کی عادی ہو چکی تھی مگر اس رات بشیر کے منہ سے دوسری شے
 بات سن حیدرہ بیچ بڑی۔ وہ حیدرہ جو شراب پیئے، بھوکھیلے اور لگا

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک دن جب میں عدالت جا کر تیار تھی اچانک حسینہ داخل ہوئی۔ وہ بہت پریشان نظر آتی تھی۔
”کیا بات ہے حسینہ بیٹھو“

وہ بیٹھتی ہی اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”حسینہ کیا بات ہے؟“ میں پریشان ہو گئی جب ذرا رو کر جی ہلکا ہوا تو وہ اسلوب پتھر کر بولی۔

”جس روز وہ جیل گیا، میں اسی روز اپنے گھر لوٹ آئی بھانج نے جینا دو بھر کر دیا تھا اپنے گھر آئی تو بچہ آباؤ کے رہنے لگے۔ جیسے جیسے دن گزرا رات رات ہوتے ہی مجھ میں بیچا میں کرتے ایک گھر میں داخل ہونے لگا۔ آج تین دن ہو گئے مگر قسم لے لیجے جو نیند آئی ہو خواہ آدھی رات کو ہی آنا مگر ایسا نہ ہو کہ وہ کسی رات گھر واپس نہ آیا ہو۔ مرنے کی حالت کی میں ہوتی تھی اور ہی فوت ہوتی ہے۔ دھڑاس نہ رہتی ہے۔“ میں نے تعجب سے دیکھا۔

”سچ وکیل صاحبہ! میرا بھی قصور تھا۔ وہ دن بھر کا تنہا بارالوٹا اور میں آتے ہی جھٹکا اتر دیا کر دیتی تھی۔ وہ بچوں کے لئے کھلنے لانا تھا، مٹھائی لانا تھا۔ صبح جاتے ہوئے سب بچے کو گلے سے لگا کر لیا کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہی ماسے لگا کر کیا مجال کسی بچے پر کبھی ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ اور مجھے بھی نشے کی جون میں جب ہی مارتا جب میں جھٹکتی ممتی روز جب چاب اکڑ سو جاتا تھا“ پھر فرار ہوئی ”اور اگر کبھی ڈنڈا اٹھا لیتا تو پھر پکڑی میں دن جو ٹوں پر تیل لٹا کر دیتا اور پوچھتا کہ اب تو درد نہیں ہوتا؟“ میں میں گریا وہ ہی کراہتی تو وہ ہاتھ پر دبانے بیٹھ جاتا۔ بار بار معافی مانگتا۔ وکیل صاحبہ! اس کے دوستوں نے بگاڑا۔ نہیں نہیں اسے تو بس اس کے کام نے کہیں کا نہ رکھا میں اتنی چھوٹی سی مشین چلا کرتی تھک جاتی ہوں پھر بھلا وہ اتنی بڑی اور خطرناک مشین چلا کر نہ تھکا ہوگا۔ سارا دن کفن چڑھنا رہتا تھا۔ رات کو گیارہ بجے منگیسی بند کرنا تھا“

میں آنکھیں پھیلائے اس کی صورت تک دیکھتی۔ وہ ایک خاص اول سے بننا یاں بنایا کر بولی۔ سچ تو مجھے اس کے ہاتھ کی مار بھی جھلی لگتی تھی۔ یہی دن خدمت گزارا تھی۔ پھر پڑوس کی عورتیں ایک سہاروی کرتی تھیں اور وکیل صاحبہ اس رات جو اس نے چاٹو لگا لا تو وہ واقعی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ اگر وہ واقعی اپنے سینے میں بھی بھونک لیتا تو اسے بہتر نہ جانتا کہ وہ کہا کر رہا ہے۔ اور یہی دوسری شادی کی بات تو یہ تو وہ مجھے سناتے کو کرتا تھا۔ دھمکی دیتا تھا۔ میں سات بچوں کی ماں ہوں۔ بھلا کوئی

میرا ہاتھ دیکھ کر گھر سے باہر نکال سکتا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں بلا کا غور تھا اور پھر وہ مغرور سر میرے قدموں پر جھک گیا۔ وہ بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔

”وکیل صاحبہ! اللہ کے بعد بس آپ کا آسرا ہے آپ کا

احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ آپ ہی میری مدد کر رہی ہیں عورت ہی عورت کا دلچھتہ کتنی ہے۔ وکیل صاحبہ آپ بہت قابل ہیں۔ بہت عقلمند ہیں اب کوئی ایسی ترکیب نکالے کہ وہ جیل سے چھوٹ جائے۔ وکیل صاحبہ اس مقدمے میں جتنا خرچ ہوگا، میں پورا کروں گی۔ خدا کی قسم میں اپنا دیوار گناہ اپنی مشین سب کچھ بیچ دوں گی بس آپ کسی طرح اسے جیل سے چھڑا لیجئے۔“

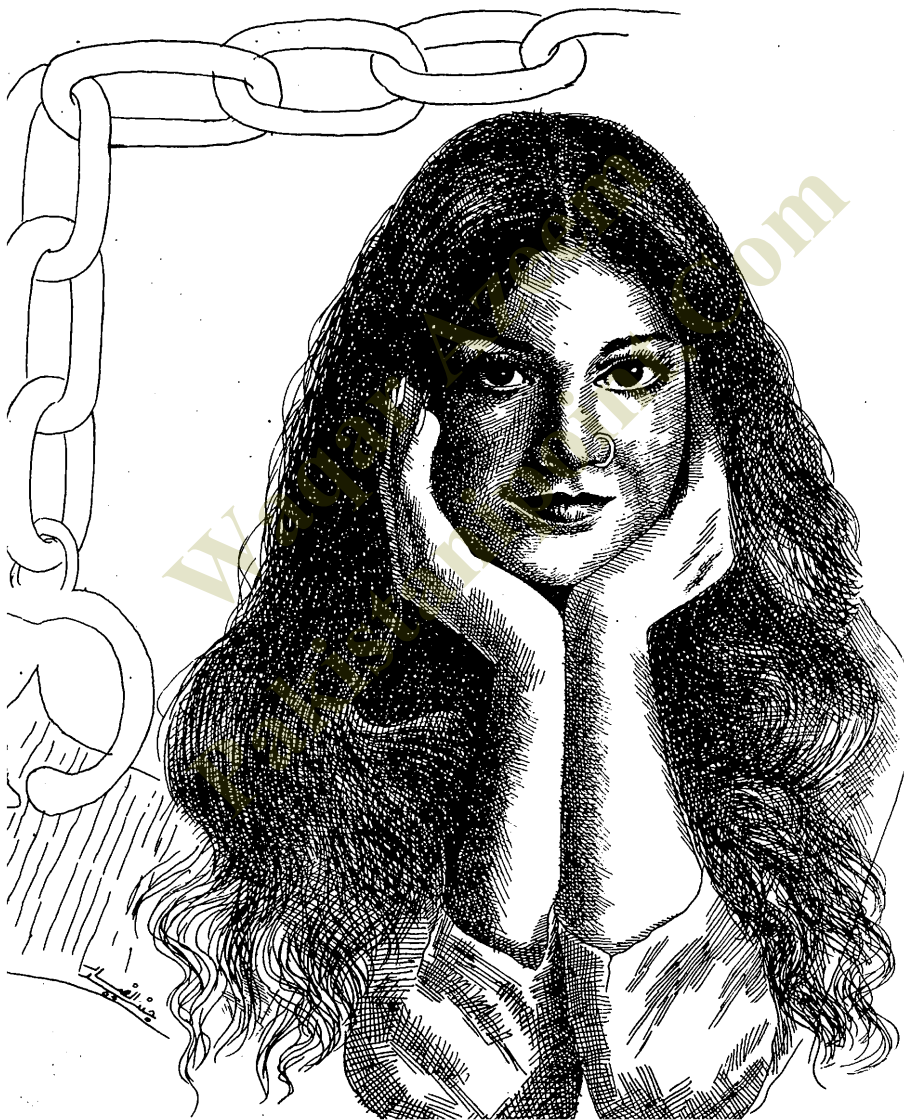
”حسینہ! یہ تم کہا کہہ رہی ہو؟ تم تو اسے پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں نے تمہاری خاطر نیا دن رات ایک کر دیا اور اب تم جا رہی ہو میں عدالت میں جا کر جھوٹ بولوں“ وکیل صاحبہ! میرے بچے بھوکے مرنے لگے ہیں

اپنے بچوں سے کیا کہوں۔ آج تین دن سے وہ اپنے باپ کے لئے تنہا ہے۔ بس ایک بار وہ لوٹ آئے خدا کی قسم میں اب ساری زندگی نہیں اردوں گی۔ اس کی آنکھوں کی مار سمجھو گی“ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ خدا کے لئے آپ میری مدد کیجئے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرے میان کو جیل سے چھڑوا دیجئے۔ خدا جانے اس کا جیل میں کیا حال ہوگا۔ ڈھنگ سے کھانے کو بھی نہ ملتا ہوگا۔ سوکھ کر کانٹا پہلے ہی ہو رہا تھا۔ ہائے اسپتال میں بھی میں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ خدا کے لئے اسے جیل سے رہا کر دیجئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا“

میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے قدموں پر سے ہٹایا ”حسینہ مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اب تم کوئی دوسرا وکیل تلاش کرو“

دشتِ بے خواب کے رنگ

رضیہ فرحت



”ہوں“

”شہلا سے تمہاری بنتی کیسے ہے؟“

”کیوں؟“

”تم سے تو وہ بہت مختلف ہے“ مینا کچھ سوچ

کر بولی، ”امیر زادہ کی ہے نئے ماڈل کی گاڑی میں پھرتی ہے خود کو لیے دیتے رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے اس کا اپنا کچھ بھی نہیں... ساری نمائش ہی نمائش ہے“

میں چپ چاپ سنتی رہی۔

”ویسے امیروں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے سولے نمائش

کے کیوں جی؟“ وہ شاید میری تائید حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ویسے تھوڑا بہت تعلق

میرا بھی اس طبقے سے تھا۔ بابا کافی جائیداد کے مالک تھے۔ لیکن

میں نے ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ اور شاید میری سلوگی ہی مینا کو اپیل

کر گئی وہ تو میری گرویدہ ہی ہو گئی اور کچھ بھی ایک اچھی دوست

مل گئی۔ مینا ہمیشہ کالج بس پر ہی آیا کرتی تھی۔

کتنی ہی مرتبہ میں نے اسے اپنی کار میں بیٹھنے کی پیش کش

کی لیکن وہ مانی نہیں۔

”ابھی جاؤ مینا“

”نہیں جی“ میرے بھی کچھ اصول ہیں میں اپنے اصول

کسی ہیئت پر قربان نہیں کر سکتی“

”کیسے اصول؟“

”جب اپنی گاڑی ہوگی میں اسی میں بیٹھوں گی“ غرض

مینا کی باتیں بڑی عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ کالج کی لڑکیاں

اکثر اپنے رومانس کے قصے سنایا کرتیں۔ اپنے چاہنے والوں

اور منگیتروں کے قصے، بس ایسا لگتا تھا وہ بلیٹی ہیں اور سارے

لڑکے ان کے پیچھے مجبوں بنے پھرتے ہیں۔

اور ایک مرتبہ مینا نے مجھ سے کہہ ہی دیا۔ ”کیا یہ

حقیقت ہے جی“

”کیا۔!“

”جی کہ ان لڑکیوں کے پیچھے مجبوں کی تعداد بے انتہا ہے“

”کہہ نہیں سکتی“ میں نے دامن بچانا چاہا۔

”آج کل کے لڑکے تو فیشن کے طور پر عشق کرتے ہیں“

”لیکن کہیں کہیں سچی محبت بھی ہوتی ہے“

”شاید“

وہ جلنے کہاں کھو گئی۔

”ہوں ہے؟“

”مینا پال“

”غیر مسلم ہے“

”نہیں مسلمان ہے“

اور شہلا نے تعجب سے میری طرف دیکھا نام تو کچھ اور

چٹکی کھا رہا ہے۔

”مینا کے والد نو مسلم ہیں“ میں نے وضاحت کی اور

اسی وقت مینا ہمارے قریب سے گزری۔ خاصی دراز قد

بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ گندمی رنگت تیکھے نقوش۔

”ہلو مینا“

”ہلو جی“ وہ مسکرائی مینا مجھے جھیلے کے بجائے جی ہی

کہتی تھی۔

”یہ میری دوست شہلا ہیں“

”ہلو شہلا“ مینا نے ہاتھ بڑھایا۔ شہلا نے مصافحہ

کیا لیکن گر جوشی نام کو نہیں تھی۔

”کالج پسند آیا؟“

”کچھ کچھ“ مینا مسکرائی۔

”وہ کیوں؟“ شہلا کو تعجب ہوا۔ چونکہ یہ کالج تو

لڑکیوں کے بہترین کالج میں شمار ہوتا تھا۔

”بس امی کی ضد تھی میں اس کالج میں پڑھوں“ مینا

نے وضاحت کی۔ ویسے سب کالج ایک سے ہوتے ہیں“

پھر وہ ایک طرف بڑھ گئی۔ گلابی رنگ کے پرنٹڈ شلوار قمیض

میں ملبوس، گلے میں دوپٹہ ڈالے گھنیرے بالوں کا بڑا بانٹا

ہوئے مینا شہلا کو اپیل نہ کر سکی۔ وہ خود بہت اظہارِ اذدن

تھی۔ دہلی تہی نازک خوبصورت لڑکی تھی۔ نئی طرز کے ٹرائیڈ

بالوں اور خوبصورت لباس والی امیر شہلا کو مینا سر سے

سے پسند نہیں آئی۔

”سر سچری ہے؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے“ میں نے شہلا کے منہ میں ہل

ملائی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ لڑکی مجھے اچھی لگی تھی۔

ظاہر و باطن ایک سا، صاف گوا اور سادگی پسند... رنگت و رنگ

ہماری دوستی ہوتی گئی۔ ویسے وہ دوست بنانے کی قابل ہیں

تھی۔ لیکن میرے قریب آتی گئی۔

”جیسی“

”اے کہیں تھیں محبت تو نہیں ہو گئی ہے؟ میں نے ہنس کر اس کا بازو جھنجھڑا۔

”ابھی تو نہیں ہوئی؟ وہ ہنس پڑی۔

”کرتے کا راز وہ ہے؟ ہاں انسان بہت بڑا انسان“ بہت پیسے والا؟

”نہیں“

”کوئی سہیل ہے؟“

”نہیں۔۔ نہیں۔۔“ وہ جھنجھائی۔ ”امارت کا تذکرہ

مرت کرو ایسا انسان جو عورت کو لونڈی نہیں سمجھے عورت کو مساوی درجہ دے انسان سمجھ اور“

”ایک بات پوچھوں میں؟“

”پوچھو“ وہ چونک پڑی۔

”تمہاری امی نے مجرت کی شادی کی ہوگی؟“

”نہیں“ وہ کوہلا گئی۔

”پھر یہ ہندو مسلم میرج؟“

”تھیں بھی تو ہو گئی تھیں“ وہ طنز یہ مسکرائی۔ ”میں

تو تھیں اور لڑکیوں سے مختلف جھتی تھی وہ جو میری طرف اشارہ کر کے کھسم کھسم کرتی ہیں اگر میری ماں کی خاطر ایک انسان

نے اپنا مذہب قربان کر دیا۔ ایک ٹھکانی ہوئی عورت کو پناہ دی تو کیا کر لیا؟ پھر ہمارا مذہب تو بہت اچھا ہے

ہر ایک کے لیے بگنائش ہے یہاں؟ وہ مسکرائی لیکن سسکاہٹ سے پھیکا پن عیاں تھا۔

”معاف کرنا میں تھیں دکھ ہوا؟“

”نہیں تو؟“

”میرے والد مکمل انسان ہیں۔ میں ان کا بہت احترام

کرتی ہوں گو وہ ایک معمولی انسان ہیں۔ ان کی چھٹی تھی، کر لینے کی دکان ہے۔۔۔ لیکن۔۔“

”پھر میں نے جو کہانی سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

”میں نے کہا کہ عالتشہ پڑھی کبھی خاتون تھیں۔ بہت

دیر در گھر آنے سے متعلق تھیں۔ ان کے یہاں

پردہ بھی سخت تھا۔ ان کی تربیت بے حد مذہبی ماحول

میں ہوئی تھی۔ اپنی پسند کی شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ اپنی جوانی میں وہ خاصی خوب صورت رہی ہوں گی

کسی رئیس زادے نے آتے جاتے ان کی جھک دیکھ لی

پہلے تو عالتشہ کر شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ جب مطلب

پورا نہ ہو سکا تو اغوا کر لیا۔ دو دن بعد جب وہ اپنے گھر واپس آئیں تو گھر میں کھرام مچ چکا تھا۔ والدین نے

ان کی بے گناہی کا یقین نہیں کیا۔ وہ جی سمجھتے رہے

عالتشہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ ان کی اچھی طرح باز پرس کی

گئی۔ مار پیٹ کے علاوہ دو دن جھوکا بھی رکھا گیا۔

عورت کے لیے انصاف کیوں نہیں ہے؟ کسی دور میں

بھی نہیں والدین بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ انصاف نہیں

کرتے پھر عالتشہ کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ

کر دی گئی۔ وہاں بھی کسی نے پھونک دیا۔ عالتشہ گھر سے

بھاگ گئی تھی۔ شوہر نے بیوی کی صفائی پر یقین نہیں کیا۔

طلاق دے دی۔ گھر سے دھکے دے کر نکال دیا۔ عالتشہ

کہاں جاتی؟ والدین کے دروازے بھی اس پر بند تھے۔

”اسی درمیان میں پال کا خیال آیا۔ بچپن میں وہ

ان کے پڑوسی رہ چکے تھے۔ ریش پال اور وہ اچھے کھلا

کرتے تھے۔ ریش کی والدہ بھی عالتشہ سے پیار کرتی تھیں

وہ ریش پال کے گھر گئیں۔ ان کے گھر والوں نے عالتشہ کو

پناہ دی۔ اور یہ ریش پال کی انسانیت تھی ایک ٹھکانی

ہوئی عورت کو سہارا دیا۔ عالتشہ کی خاطر اپنے خاندان کو

چھوڑا، اپنے مذہب کو چھوڑا اور رشید پال بن کر اس نے

میری ماں کی جھولی کو خوشیوں سے بھر دیا اور تھیں شاید یہ

سن کر تعجب بھی ہو رشید پال میرے حقیقی والد نہیں ہیں۔

میں تو عالتشہ کے پہلے شوہر کی اولاد ہے۔ ابھی وہ موجود ہیں

نہیں آئی تھی کہ عالتشہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی۔

یہ تو رشید کی اعلیٰ طرفی ہے اس نے میں کو اپنی بیٹی کی طرح

پرورش کی شفقت پوری دی اور۔۔۔“

میں کا یہ انکشاف کتنا درد انگیز تھا اور میں نے رت

آميز آواز میں کہا۔

”جی میں نے ہند کر لیا ہے میں وکیل بنوں گی عورت

کی وکالت کروں گی۔ عورت کو انصاف نہیں ملتا ہے عورت

کے لیے کوئی قانون نہیں ہے۔ عورت انصاف کے لیے

درد برد بھگتی ہے۔۔۔“

اور پھر میں اے کرنے کے بعد ہم لوگوں نے کالج

چھوڑ دیا۔ میری تو شادی ہو گئی اور میں نے لا ر کالج میں

داخلہ لے لیا۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے

جدا ہو گئیں۔

عزاتین ذاتجیفس ۷۶

نہ ہو سکی۔ ویسے بھی ملاقات کر کے میں اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر وہ عمران کے ساتھ شرمندہ ہی ہوئی وہ اس کا لباس تو ضرور ہے لیکن وہ تو دوستوں کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔

”میں ان کو کوئی انسان نہیں ملا صرف عمران ملا ہے۔“ شاہد نے مجھے چھیڑا۔

میں چپ رہی۔ شاید عمران ہی وہ انسان ہو ہوتا ہے پھر لوے۔

”میں نے شاہد کو جو شکر دیا ہے ہو ہی نہیں سکتا“

”تم موتیں اتنی خوش فہم کیوں ہوتی ہو؟ شاہد بولے۔

”دنیا میں سب کچھ ممکن ہے“

”لیکن میتا عمران سے شادی نہیں کر سکتی“ میں نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔

اچانک دو سال بعد میتا نے مجھے پھر نظر آنی ایک سہیل

میں، اس وقت میرا کچھ بیاہ تھا اولدیں اس کے ساتھ ہی فیملی

وارد ہیں وہ رہی تھی۔ ریکان وہاں ایڈمرٹ تھا۔ اور اس

کا علاج ہو رہا تھا۔ اس روز شام کے وقت میں ہارمڈے

میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ ریکان کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ وہ

اندر کمرے میں سو رہا تھا۔ میں میکینون پڑھنے میں مصروف

تھی کہ دور سے مجھے میتا آتی ہوئی نظر آتی۔ اتنے عرصہ

بعد میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ کچھ اور ڈبلی اور اسماٹ ہو گئی تھی۔ ہیرا سائل تبدیل

کر لیا تھا۔ بولنے کٹ ہیرا سائل میں وہ ذرا کم عمر نظر آ رہی

تھی۔ شکاری قبض میں ملبوس وہ بڑی تروتازہ اور جوان نظر

آ رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو مجھے مقابل دیکھ

کر کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

”ہلو صبی تم یہاں، خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی خیریت ہے“ میں مسکرائی۔ بیٹا بیچا ہے

اس لیے یہاں آنا پڑا اور تم خدا بخواتم“

”وہ... وہ عمران صاحب بیچا۔ میں فیملی وارد ہیں

ایڈمرٹ ہیں؟ وہ ہڑبڑا کر بولی۔

”اوہ“ میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ چھا گئی اور

مجھے اپنے میاں کے اندیشے صبح معلوم ہوئے تھے۔ میتا نے

عمران کا ساتھ اب تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ جلی سی ہو گئی اس

کے ہاتھوں میں انگس کے پھولوں کا بڑا پیاداسا گلہ تھوٹا تھا۔

”کس کے لیے ہیں؟“ میں مسکرائی۔

”وہ عمران صاحب کو انگوٹس کے پھول بہت پسند ہیں“

وہ آہستہ سے بولی پھر وہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی اور میں پچھنے

پر مجبور ہو گئی کہیں وہ بھنگ تو نہیں گئی ہے؟

پھر وہ مجھ سے روزانہ ملنے لگی۔ میں روزانہ شام کو

برآمدے میں کرسی ڈالے اس کی منتظر ہوتی وہ روزانہ شام کو

عمران کی عیادت کے لیے آتی روزانہ ہی اس کے ہاتھوں میں

پھولوں کا گلہ دے ہوتا۔ عیتد یا محبت کے اظہار کا یہ طریقہ

نوب تھا۔ وہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی پھر

عمران کے کمرے کی طرف چلی جاتی۔ ایک ترمہ وہ عمران سے مل

کر واپس جا رہی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔

”میتا“

”ہوں“ جیسے وہ چونک پڑی۔

”اندر آ جاؤ“ میں مسکرائی۔ کمرے میں بیٹھ کر کچھ باتیں

کریں پرانی یادیں تازہ کریں گے“

وہ بادل بخواسہ اندر چلی آئی۔

”اب عمران کیسے ہیں؟“

”خدا کا شکر ہے۔ اب ان کی صحت بہتر ہے“

”میں سوچ رہی تھی مطلب کی بات کیسے شروع کروں؟“

”میتا ایک بات پوچھوں“

”پوچھ سکتی ہو؟ وہ شاید مجھ کو گئی تھی۔ میں کیا پوچھتا

چاہتی ہوں۔

”عمران متاوا وہ انسان تو نہیں جس کی باتیں تلاش تھی“

میں نے دھڑک پوچھ لیا۔

”بہت تو وہی“ وہ بغیر جھجکے کے بولی۔

”پھر اسے کب تک آزماؤ گی؟“ میں مسکرائی۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک پڑی۔

”آخر تم اس انسان سے شادی کب کرو گی؟“

”یہ تو ممکن ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ میں حیران رہ گئی۔

”وہ شادی شدہ ہے۔“

”تمہیں معلوم نہیں تھا؟“

”معلوم تھا۔“

”پھر؟“ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف

دیکھا۔

” پھر کیا ہو سکتا ہے ؟ “ مینا افسردہ ہو گئی ۔
 ” وہ تم سے بیاہ کرنا نہیں چاہتا ؟ “
 ” چاہتا ہے “ مینا نے سر آہ بھری ۔

” تم نے کیا سوچا ہے ؟ “
 ” کیا سچوں ؟ “ میت اداس ہو گئی ۔ اس نے مرد
 آہ بھری ” اس کی بیوی ایک وفا دار عورت ہے ، اجڈ
 جاہل گنوار سی لیکن اس نے شوہر کے ساتھ وفا کی ہے ۔
 ایسی عورت کے ساتھ نا انصافی نہیں ہونی چاہیے “

پھر مینا نے جو قصہ بتایا وہ کچھ اس طرح کا تھا ۔ عمران
 کی بیوی ان کی عمر ادھے اور عمران شادی کے وقت کلرک
 تھے اس عورت نے اپنے تمام زیورات بیچ کر اپنے شوہر
 کو بڑھایا ۔ لندن بھیجا بیسٹری بڑھانے والا کہ وہ اس وقت
 نو بچوں کی ماں بن چکی تھی ۔ اس نے اپنی اور بچوں کی گذر
 اوقات سلائی اور عزت مشقت کر کے کی ، شوہر کو نلے میں
 اس نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں ۔ اس کا مخراس کو ملنا
 چاہیے میں اس میں حصہ دار نہیں بن سکتی ۔ عمران جو لوگوں کو
 انصاف دلانے کے لیے لڑتے ہیں انہیں اپنے ہی گھر میں ،
 بے انصافی نہیں کرنی چاہیے “

” میں نے موضوع بدل کر کہا “ غالباً تم اب بھی عمران
 کی زیر نگرانی کام کر رہی ہو ؟ “
 ” نہیں “

” پھر ؟ “ میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا ۔
 ” وہ چنکی “ جمی آخر وہ میرا حسن ہے میں اسے یکے
 بھول جاؤں ؟ میں اس کی عیادت کو آجاتی ہوں ۔ اکثر ہم مل
 لیتے ہیں ہنس بول کر تھوڑا سا وقت ساتھ گزار لیتے ہیں ۔
 مجھے اور کچھ نہیں چل رہی ہے “
 ” لیکن میت اسنو تو تو میں نے سمجھانے کی کوشش کی
 ” تمہارے آگے کسی زندگی بڑی ہے ۔ عمران کو تو اپنی منزل
 مل گئی ہے ۔ اس کی بیوی بچے ہیں وہ مطمئن ہے تم بھی اپنی
 منزل تلاش کر لو “

” میں منزل سے بھٹک گئی ہوں جمی “ وہ جذباتی
 سی ہو گئی ” بھٹکے ہوئے راہی واپس نہیں آتے منزل نہ ہی
 منزل کی آرزو سی “
 ” وہ اٹھ کر چلی گئی مزید سننے کی اس میں تاب نہیں تھی
 پھر ایک ہفتہ بعد ہی میں وہاں سے چلی آئی ۔ ریحان

تندرست ہو گیا تھا اس کے بعد مینا سے میری ملاقات
 نہ ہو سکی ۔
 کچھ عرصہ گزر گیا اور رفتہ رفتہ میں اسے بھولتی گئی
 لیکن ایک عرصہ بعد اچانک وہ ایک بیاہ میں نظر آ گئی وہ
 بارات کے ساتھ آتی تھی اور میں لڑکی والوں کی طرف سے
 مدعو تھی وہ اب تک اسی طرح جوان اور خوبصورت نظر آ
 رہی تھی ۔ بنائسی ساٹھی میں ملبوس بہترین میک اپ کیا
 ہوا تھا ۔
 ” ہلو مینا “ میں اس کے قریب گئی ۔
 ” ہلو جیسی “ وہ بڑی گڑبڑی سے مجھ سے مل گئی ۔
 ” کیسی ہو ؟ منزل مل گئی ؟ “ میں نے چھوٹے ہی
 پوچھا وہ افسردہ ہو گئی ۔
 ” کم کر وہ منزل کو منزل کہاں غٹی ہے ؟ “ وہ حیرت
 سے بولی پھر اس نے بتایا وہ بیسٹر عمران کے بیٹے کی بار
 کے ساتھ آئی ہے ۔ میں نے اسے مبارکباد دی تو وہ کھیا
 گئی ۔ !
 ” ٹھیک ہے وہ میرا بیٹا نہیں ہے لیکن عمران کا تو
 بیٹا ہے اور مجھے عزیز ہے ۔ عمران میرا اتنا خیال رکھتے ہیں
 اپنے بیٹے کے بیاہ میں مجھے بطور خاص مدعو کیا ہے “
 ” یہی اعزاز تمہارے لیے کافی ہے “ میں نے طنز کیا ۔
 ” شاید وہ روہانی ہو گئی “

پھر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ہم اور باتیں نہ کر
 سکے ۔ وہ بھی جلد ہی میرے پاس سے اٹھ گئی ۔
 مینا کے بارے میں سوچ کر میں دکھی ہو گئی ۔ جب
 شاہد سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے ” تمہاری دوست دلوانی ہے
 جب عمران اس سے شادی کا خواہشمند ہے تو کیوں نہیں
 کر لیتی ۔ شادی آخر تمہارے مذہب نے اجازت دی ہے ورنہ
 چار بیویاں رکھ سکتا ہے “

” آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا “ میں لڑکھائی
 ” عمران اگر دوسرا بیاہ کرے گا تو اس کی بیوی ناراض
 ہوگی ۔ میت کسی عورت کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا نہیں چاہتی
 وہ تو خود عورتوں کو انصاف دلواتی ہے ایسی بے انصافی کیسے
 کر سکتی ہے ؟ “
 ” تو پھر عمران پر لعنت بھیج کر کسی اور سے بیاہ کر
 لے “ شاہد چپ کر بولے ۔

شخص ہے اور میدنا سر بھری ہے آخر اس نے عمران سے شادی کیوں نہیں کی؟ صرف اس کی اس پر زندگی گزارنا کہاں کی عقلیت ہی ہے۔ عمران بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔

”جیسی کامیتا سر دآہ کے کربولی۔ اب وہ مجھے فون بھی نہیں کرتے ہیں فون کدوں تو ٹال جاتے ہیں۔ کبھی ملاقات ہو جائے تو کدوں لے لے ہیں۔ اب تو وہ مجھے پہچانتے بھی نہیں، میں نے سر دآہ بھری، سوچتی ہوں میں نے ایک انسان کی تلاش کی تھی انسان تو مجھے ملا لیکن میں نے خود اسے کھو دیا اب میں اسے کیوں درخس دوں؟“

میں کیا سمجھاتی تھی اچھا اسے؟ وقت گزر چکا تھا وقت کی ڈور سدا اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ میں جو عورتوں کے لیے انصاف مان لکھتی رہی خود انصاف سے محروم رہی۔

”یہ بھی ممکن نہیں وہ شاید عمران سے محبت کرتی ہے“

”محبت و محبت سب کچھ اس ہے،“ شاہد طیش سے بولے۔۔۔ عمران نے اسے بے وقوف بنا رکھا ہے بڑا اکیلا آدمی ہے۔“

پھر شاہد بڑبڑانے لگے ”تم عورتیں خواہ کتنا ہی بڑا جاؤ کٹر بن جاؤ کٹر بن جاؤ لیکن ہوتی ہو سر بھری“

”بس بس چپ ہو جائیے،“ میں نے شاہد کو ٹوکا۔

ماہ و سال گزرتے تھے میرا بیٹا ریمان اب جوان ہو چکا تھا۔ اور اسے قانون پڑھنے کا شوق تھا وہ وکیل بننا چاہتا تھا۔ ہم اس کے واسطے کے سلسلے میں لا ر کالج گئے تو وہیں مینا سے ملے پھر پڑ ہو گئی۔ اب وہ بالکل بدل گئی تھی۔ پہلی سی جوانی اور شگفتگی باقی نہیں رہی تھی وہ وقت سے پہلے عمر رسیدہ ہو گئی تھی۔ اب وہ بے حس و ادب سے تھی۔ لا ر کالج میں وہ پروفیسر تھی مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

”جی جی،“ وہ بہت محبت سے ملی پھر غصہ پنے آئیں لے گئی ہم لوگ چلتے چلتے رہے اور ادھر ادھر کی غپ نشپ کرتے رہے وہ ہماری کامیاب زندگی پر مبارک باد دیتی رہی جب شاہد ریمان کو کمر دیاں سے چلے گئے تو میں نے۔۔۔

... پوچھ لیا۔

”عمران کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں؟“ اس نے سر دآہ بھری۔

”اور کتنے بچوں کی شادیاں کر لیں؟“ میں نے طنز کیا۔

”ایک بیٹا اور دو بیٹیاں“

”تمہیں مدعو کیا تھا ان کی شادیوں میں؟“

”نہیں؟“ وہ اداس ہو گئی۔

”کیوں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”بس ان کا کہنا ہے اب میں تمکے اس بھتے میں ہوں،“

کہ یہ سب کچھ ذریعہ نہیں دیتا کہ کوئی لڑکی میری دوست ہو میری اولاد جو ان ہو سکتی ہے میں ہوا اور داماد والا بن چکا ہوں ان لوگوں کے دل میں میرا بہت احترام ہے اگر میں تم سے ملتا رہوں گا تو ان لوگوں کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔

اس لیے بہتر ہے ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں

میں حیران رہ گئی۔ شاہد ٹھیک کہتے تھے عمران بڑا اکیلا

خواتین ڈائجسٹ کی اسٹیلر

ماہنامہ حنا کی مدیرہ

آج کی مشہور افسانہ نگار ناول نگار

رطبہ جہا
کانیا ناول

آنگن کا چاند

چھپ چکا ہے

کراچی کے سول ایجنٹ فرن ۱۲۳۳۵
پنجاب بک ہاؤس۔ نزد اردو بازار کراچی

شمارِ پیر کے مدیت

پروین یوسف شاہی



ڈاکٹر صاحب، کوئی روم میں بلا رہے

ہیں

سمیٹنے آکر ڈاکٹر صدف سے کہا۔ وہ مریضہ کا معائنہ کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔ اور پھر مریضہ کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ چائے کا وقت تو ہو گیا ہے مگر یہ اس کی عادت تھی کہ سب مریضوں کو فارغ کر کے ہی چائے کے لیے اٹھتی۔ مریضوں سے فارغ ہو کر وہ چائے کے لیے گئی تو سب ہی چائے پی رہے تھے۔ صدف کو دیکھتے ہی ڈاکٹر شہاب کرسی سے اٹھ گئے۔

”آئیے آئیے صدف آپ کو سنے ڈاکٹر شرجیل سے ملائیں جو بیرون ملک سے بے شمار دگر باں لے کر حال ہی میں اپنے وطن واپس آئے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جوان نسل کے یہ نمائندے ہیں کہ ہو کر نہیں رہ گئے انھیں یہاں دیکھ کر مجھے واقعی بے حد خوش ہو رہی ہے“ ڈاکٹر شہاب نے خوش دلی سے کہا۔

”ڈاکٹر شرجیل یہ ہیں صدف ہمارے ہسپتال کی بے حد مستعد ڈاکٹر“

ڈاکٹر شہاب نے ستائش بھری نظروں سے صدف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شرجیل اور صدف ڈاکٹر شہاب کی باتوں پر کان دھرے بنا بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھ جاتے تھے۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔

”ڈاکٹر صاحب آپ نے ان کا ایک دوسرے سے کچھ اس طرح تعارف کروایا ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بے حد متاثر نظر آ رہے ہیں“

ڈاکٹر اسد نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان کی محویت ٹوٹی۔ صدف جھینپ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور ڈاکٹر شرجیل بھی بغیر کچھ کہنے سنے چائے کی پیالی پر جھک گیا۔ فضا ایک دم ہی خاموش ہو گئی۔ ویسے تو یہ کوئی خوشی کی تقریب نہ تھی۔

ڈاکٹر شہاب کا تبادلوں اور اپنٹنڈی ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ ڈاکٹر شرجیل آئے تھے۔ ڈاکٹر شہاب پچھلے چار سال سے اس ہسپتال کے ایجنارج تھے۔ بے حد با اصول، محنتی اور نرم دل تھے۔ بے حد خوش گفتار تھے۔ تمام عملہ ان سے بے حد خوش تھا۔ اب ان کے تبادلوں سے سب ہی اداس ہو رہے تھے۔ ان کی الوداعی پارٹیاں تو ہو چکی تھیں۔ وہ آج جانے والے تھے۔ پسوں ڈاکٹر شرجیل کو چارج بھی سونپ چکے تھے۔ صدف بوجہ زکام بخار چار پانچ روز سے چھٹی پر تھی۔ اس نے ڈاکٹر شرجیل سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔

”مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی جگہ بہت قابل اور لائق شخص کو سونپ کر جا رہا ہوں“ یقیناً آپ انھیں مجھ سے بہتر لائیں گے، ڈاکٹر شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کی کمی تو ہمیشہ محسوس ہوگی۔ میں نے اپنا باؤس جاب بھی نہیں مکمل کیا ہے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے“ ڈاکٹر شہاب نے کہا۔

”ان تین سالوں میں“ میں نے جو کچھ آپ سے سیکھا ہے وہ مستقبل میں یقیناً میرے لیے شعل راہ ہوگا“ ڈاکٹر صدف نے کہا۔

”یہ تو سب آپ لوگوں کی قدر دانی اور مہربانی ہے جس کا میں دل سے ممنون ہوں اگر آپ کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو میں اس سیکسویں سے کبھی کام نہ کر سکتا۔ آپ لوگ غور و خوض ہی دل پر بوجھ نہ بنائیں۔ زندگی رچی تو انشا اللہ کبھی نہ بوجھ اور ایک محور پر گھومتے ہوں گے کیونکہ دنیا گول ہے“ ڈاکٹر شہاب نے زندگی سے بھرپور فہمہ لگایا۔

”ڈاکٹر صاحب سچ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ جیسی مہربان ہستی کو کیسے الوداع کہیں اور ڈاکٹر شرجیل کا خیر مقدم کیسے کریں“ صدف نے ایک نظر ڈاکٹر شرجیل پر ڈالتے ہوئے کہا۔

صَدَف کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر اس کو تو صَدَف
 بے حد پسند تھی۔ مگر یہ الگ بات تھی کہ صَدَف کبھی بھی
 کسی سے بے تکلف نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت رکھ رکھاؤ
 سے رہتی اور خاصی عقلمند اور اس کے اسی انداز نے سب
 کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھادی تھی۔ ڈاکٹر

مجھے کسی غیر مقدم کی ضرورت بھی نہیں میں تو ایک
 ڈیوٹی پر یہاں آیا ہوں۔ مجھے تو بس اپنی ڈیوٹی سے غرض
 ہے یا سٹر جیل نے بے حد رکھائی سے کہا۔ وہ مخاطب تو
 صَدَف سے تھا مگر اس کا یہ انداز کسی کو بھی نہ بھایا
 ڈاکٹر اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیونکہ وہ سب ہی



شہر جیل کے سرد رویے کو ڈاکٹر شہاب نے بھی محسوس کیا تھا۔

”آپ لوگوں کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا۔ اور آپ سب کی جانفشانی اور مستعدی دیکھ کر میں فوجوانوں سے بہت پر امید ہوں۔ امید ہے آپ مستقبل میں بھی اسی جانفشانی اور مستعدی کو اپنا شعار بنائیں گے، ڈاکٹر شہاب کے بچے جس بے پناہ متانت اور شفقت تھے۔ وہ چالیس پندرہ سال کے تھے مگر دیکھتے ہیں بے حد سمارٹ جانی د چوبند، باوقار، ان کا رویہ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ تو بہت ہی مشفقانہ تھا۔ اسی وجہ سے سب ہی ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر شہاب کے سامنے ڈاکٹر شہر جیل کی شخصیت تو کچھ بھی نہ تھی۔ تیس اکتیس سال کے بے حد مجیدہ جوان سال ڈاکٹر بھلا وہ سب کے دل میں ڈاکٹر شہاب جیسا مقام کیسے پاسکتا تھا۔ جبکہ اس نے خود ہی سب پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ڈیڑھ برس آگے۔ اسے اپنے کام سے کام ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر شہاب اپنے تمام اشیانہ کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ ان ہی ان کے کھوں کو اپنا دکھ جان کر باٹ لیا کرتے تھے ان کی بیوی ایذا بھی بہت ہی مخصوص خاتون تھیں۔ ہسپتال کا تمام عملہ ایک خاندان کے افراد کی مانند تھا۔ اسی لیے تو ان کی ہر ایک محسوس کر رہا تھا۔ سب کو ایک آس تھی کہ شاید نئے ڈاکٹر بھی ایسے ہوں ان کا تمام الدل ثابت ہوں مگر شہر جیل کو دیکھ کر سب ہی مایوس ہو گئے۔

چلے کے بعد ڈاکٹر شہاب کو خدا حافظ کہہ کر ڈاکٹر صدف اپنے کمرے میں جا کر کچھ مریضوں میں مصروف ہو گئی۔ مگر دماغ حاضر نہ تھا۔ آج پورے چھ سال بعد شہر جیل کو دیکھا تھا کیسی اجنبیت تھی اس کی نگاہوں میں، جیسے وہ صدف کو بالکل نہ پہچانتا ہو۔ وہ سردی اجنبی نظریں جھونے نے صدف کے رنگ و پے میں ایک سردی لہر دوڑادی تھی اچھے خاصے پرفضا کمرے میں بھی صدف کو اپنا دم گھٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

شہر جیل میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ہماری زندگی میں ایسا مقام بھی آئے گا کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان کر لوں نظریں چرائیں گے۔ جیسے ہم بالکل غیر ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں۔

وہ سب مریضوں کو دیکھ کر ناراض تھی۔ تنہا تھی۔ میز پر سر رکھتی تھی۔ اس کے گھٹنے اور دراز بالوں کی ٹوٹی سی پھوٹی میز پر پڑی تھی۔ بالوں پر نظر پڑی تو اس کے ہونٹوں پر تحیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے چوٹی پوچھی کیا اور کرسی سے ٹپک لگائی۔ یادوں کے پڑے پر ماضی کی خوبصورت پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

”شہر جیل بھائی خدا کے لیے میرے بال چھوڑ دیں“ صدف نے چیختے ہوئے کہا۔

”چھوڑ دوں گا، ایسی کون سی قیامت آگئی ہے بھائیوں چیخ نہی ہو۔ ذرا صبر کرو دنپنے تو دو یہ شہر جیل نے اس کے بال کھینچے ہوئے کہا۔

”میری جان نکل رہی ہے اور آپ مجھے صبر کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اگر کوئی آپ کے بال اس طرح کھینچے تو پھر پوچھوں گا“

”تو کیا تمھاری جان ان مٹھی بھر بالوں میں ہے؟“ شہر جیل نے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

”پھینچو، شہر جیل بھائی کو منٹ کریں“ صدف نے زور سے اپنی چھوٹی کو پرکار۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ دوسرے کمرے سے عمیرا بیگم بھاگی ہوئی آئیں۔

”شہر جیل کچھ تو عقل کرو، کیوں ہر وقت اسے پریشان کرتے رہتے ہو؟“ امی میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ اسے یوں ہی چھینچنے کا شوق ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس کے چھینچنے پر آپ بھاگی جلی آئیں گی۔ میں تو اس کے لیے صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ کالج سے کس کے ساتھ آئی ہو گی؟

”جیسے روزنہ آتی ہے، خوا خواہ اس پر رعب نہ ڈالا کرو، جاؤ اپنا کام کرو؟“

”امی آپ اس سے پوچھتے تو یہی کہہ کیسے آتی ہے؟“ پھینچو میں آج بس میں نہیں آتی۔ کالج بس کافی دقت لیتی ہے۔ میرا اسٹ ہو رہے ہیں۔ شیکلو کی گاڑی میں آگئی۔ میرا وقت بچ گیا۔ آپ میری جاسوسی کیوں کرتے پھرتے ہیں؟“ صدف نے ناگوار سے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ ہمیں اس سے کیا بتم کیوں خوا خواہ جاسوسی کرتے ہو؟“ عمیرا بیگم نے صدف کی طرف لڑائی

کی...!

”میں کیوں کرتا ہوں، تمہاری وہ شکیلہ اور اس کا بھائی کرتے ہوں گے“ شرجیل نے جملے کٹے انداز میں کہا۔
 ”شرجیل بھائی اگر آئندہ اس کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ جو منہ میں آتا ہے بولے چلے جاتے ہیں میرا شکیلہ کے بھائی سے بھلا کیا واسطہ، شرم تو نہیں آتی میرے ساتھ کسی غیر کا نام لیتے ہوئے“ صدف نے غصے سے کہا اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”سواری، صدف واقعی ہیں نے غلط بات کہہ دی؟“ شرجیل نے بے حد مصالحتی انداز میں کہا، مگر کوئی کھوا آئندہ میں کبھی نہیں اس کی کار میں نہ دیکھوں؟“ شرجیل نے پھر کہا۔

”پھر لڑنے لگے ہو، آؤ پہلے کہہ کر نا کھا لو، ورنہ تمہاری لڑائی میں کھانا پھر ٹھنڈا ہو جائے گا،“ منیر ابیگم نے باورچی خانے سے ہی لڑکاڑو دونوں باورچی خانے میں ہی چلے گئے کیسے اچھے تھے وہ دن بڑی سی کوٹھی میں سب اکٹھے ہی رہا کرتے تھے... کوٹھی کے ساتھ ہی ایک انیکسی بھٹی۔ جس میں منیر ابیگم رتی تھیں۔ شرجیل دو سال کا تھا جب اس کے والد عبدالحق کا انیکسیلنٹ میں انتقال ہو گیا۔... منوہر کی اچانک اور بے وقت موت سے منیر ابیگم پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ان کے ذہن کو ایسا جھجکا لگا تھا کہ ان کے ناول میں ہونے میں بھی کافی دقت لگا۔ وہ کم صم سی ہو کر رہ گئی تھیں... سوچیں کہ ان کی خوشیوں کی عمر اس قدر کم کیوں تھی۔ ابھی تو وہ جی بھر کر شہنے بھی نہ پالی تھیں کہ ان کی آنکھوں کو نہ ختم ہونے والی برسات مل گئی۔ بہار کے چند دنوں کے صلے میں عمر بھر کی خزاں ان کے مقدر میں لکھ دی گئی۔

ان کے شوہر عبدالحق کے بے پناہ پیار و محبت کے لحات ایک خوبصورت خواب سے زیادہ نہ تھے۔ اندوہا زندگی کے خوبصورت شب و روز و رفاقت کے تین انول سالوں کا شفعہ شرجیل کے روپ میں منیر ابیگم کے پاس چھوڑ کر وہ لاہری ملک عدم ہوئے۔ جلال سال غیرا بیگم کے مقدر میں تنہائیاں تھیں کاتب تقدیر نے خان بہادر صاحب کلاٹلی بیٹی کی قسمت آسنوؤں سے لکھی تھی... والدین اولاد کو جنم دیتے ہیں مگر کرم دینے پر قادر نہیں ہوتے۔ اور نہ خان بہادر صاحب تو زمانے کی خوشیاں ہی تو لیک

”امی جان میں آپ کو بتا دوں کہ اگر یہ آئندہ شکیلہ کے ساتھ آئی اور اس کا بھائی کا ٹی چلا رہا ہو تو میں نے راستے میں ہی گاڑی رکھ کر اسے کار سے اتروا لینا ہے۔ پھر کالج میں اگر اس کی بے عزتی ہو گئی تو مجھے کچھ نہ کہیں گا۔ مجھے ایک آنکھ نہیں بھانا اس کی سہیلی کا بھائی۔ جس وقت اس کی طرف دیکھتا ہے تو دل چاہتا ہے اس کی آنکھیں نکال لیں“ شرجیل نے بے حد غصے سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

”صدف بیٹی آئندہ تم بھی محتاط رہنا میں اسے بھی ٹھکانے کی کوشش کروں گی۔ بھانے یہ تم پر اس قدر ب کیوں ڈالتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ گزرتا ہے۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں آپ کا سایہ سر نہیں میں اکیلے کیا کروں۔ بھانے اس کا غصہ مجھے کون سے دن دکھائے۔ صدف تم در خیال رکھنا؟“ منیر ابیگم نے حدافروہ ہو رہی تھیں۔

”چھو آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ میں آئندہ کبھی شکیلہ کے ساتھ نہیں آؤں گی۔ میں نے شرجیل بھائی کی بات کا برا تو نہیں مانا۔ بھانے کیا سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو لالٹ صاحب کہیں گے؟“

صدف نے مسکراتے ہوئے منیر ابیگم کے گلے میں بائیں ڈالتے ہوئے پیار سے کہا تو بچانے کیسے شرجیل ایک دم ہی دوسرے کمرے سے نکل آیا۔

”مجھے ڈانٹ دوانے کے لیے کیسے کیسے مسکرا لیں؟ ہو رہی ہے کیسے کھن لگا ہے جا رہے ہیں۔ مختصر یہ میری ماں ہے بھانے کوئی حویہ کا رگڑ نہیں ہوگا؟“ شرجیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو صدف کی جان میں جان آئی۔ وہ شرجیل کے غصے سے بہت گھبرا رہی تھی۔

”شرجیل اب کہاں جا رہے ہو، کھانا کھا لو؟“ امی بیٹ لوجا ہی کرنے جا رہا ہوں باورچی خانے میں؟“ شرجیل نے کہا۔

”کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا؟“ صدف نے کہا۔
 ”تھا کیا ہے؟ کالج کی کینیٹین سے خوب پھوش کر گئی ہو، تھیں کھانے کی کیا پرواہ؟“ شرجیل پھر بھی چھپڑنے سے باز نہ آیا۔

”جی روزانہ دس بیس روپے کینیٹین کے لیے مجھے آپ ہی عنایت کرتے ہیں نا؟“ صدف نے کہا۔

بیان تھی۔

صدف نیز بیگم کے بڑے بھائی صلاح الدین کی بیٹی تھی۔
ابھی صدف دوسال کی تھی کہ اس کی والدہ عذرا بیگم کا دوسری زوجگی میں انتقال ہو گیا۔ صلاح الدین کی تو ایک سال بعد ہی والدین نے دوسری شادی کر لی۔ رابعہ بیگم نے عذرا بیگم کی جگہ لی۔ صلاح الدین کا بیوی مل گئی، مگر معصوم صدف آغوشِ مادر سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔
شروع شروع میں تو شوہر کے خیال سے رابعہ بیگم صدف کو پسپا کرتی رہیں۔ مگر سال بھر بعد ہی جب فرح پیدا ہوئی، تو ان کی توجہ اپنی بیٹی کی طرف ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے فریا، عطا اور پھر علی اور جن پیدا ہوئے تو وہ اپنے ہی بچوں میں کم ہو کر صدف سے قطعی لاپرواہ ہو گئیں۔ اور صدف دن بہ دن اپنی چھوٹی نیرا بیگم سے قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔

ششربل صدف سے تین سال بڑا تھا۔ وہ بھی صدف کے ساتھ خوب خوش رہتا۔ عذرا بیگم کی وفات کے بعد تو نیرا بیگم نے صدف کو یوں اپنی مستحق آغوش میں سمیٹ لیا تھا، جیسے صدف اپنی کی بیٹی ہو۔ انہیں اپنی بھابی عذرا بیگم سے بھی بہت محبت تھی۔ وہ ان کی ماموں زاد بھی تھی۔ انہیں صدف میں عذرا کا ہی عکس نظر آتا۔ وہ بھی انہیں ششربل سے کم پیاری نہ تھی۔
ششربل اور صدف کا شادانہ تعلقی ریکارڈ نیرا بیگم کی صحیح رہنمائی اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ ششربل میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ صدف نے بھی ایف ایس سی میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ بی ایس سی میں داخلہ لینا چاہتی تھی مگر ششربل بصرہ تھکا کر ڈاکٹری کرے۔
”بی ایس سی کرنے کا کیا فائدہ ڈاکٹری پڑھو!“
ششربل کہتا۔

”ششربل بھائی ڈاکٹری بہت مشکل ہے میں آپ جتنا نہیں پڑھ سکتی ہر ج میرا تو دم نکل جاتے گا۔ اتنی مونی کتا ہیں پڑھتے پڑھتے“ ششربل کی ڈاکٹری کی کتا ہیں دیکھتے ہوئے وہ ہنست ہار دیتی۔
”کم ہمت۔“ بی ایس سی کے لئے تو پڑھنا ہی پڑے گا۔ کوئی مقصد ہی تو ہیں پاس کرنے سے رہا۔ اگر عمت کرنی ہی ہے تو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کرو اور ہاں سب اور پھر جب تم ڈاکٹری پڑھ لو گی تو ایک دم یہ سب لڑائی جھگڑے بند۔ دونوں مل کر کوئٹہ کا علاج کیا کریں گے“ ششربل اسے سمجھاتا۔
”مرد رہی کوئی مل کر علاج کرنے دے گا۔ یہاں آنے پر ہی امی ایسے گھوڑی ہیں جیسے کھا ہی تو جاویں گی“ صدف نے کہا۔

کی جھولی میں ڈال دیتے۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن لویں دھکی نہ ہوتی۔ مگر مقرر کے کچھ کو کون بھٹکا سکتا ہے۔
شادی کے تین سال بعد ششربل کو سینے سے لگاٹے وہ سسکتی ہوئی باپ کی دلیہ پر والدین آگئیں۔ سب نے خان صاحب کو بچھا کر نیکلہ بیگم کی دوسری شادی کر دیں تیس سال کی عمر میں بیوہ ہونا معمولی بات نہیں۔ ابھی ان کی تمام عمر بچی ہے۔ جذبات سے کام نہ لیں۔ مگر خان بہادر صاحب کو تو بیٹی کی دوسری شادی ایک گالی سے کم نہیں لگتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بیس اتنا گیا گورا نہیں کہ بیٹی اور نواسے کے اخراجات کا بوجھ نہ اٹھا سکوں، نیکلہ بیگم کے عقد ثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

نیکلہ بیگم خود بھی دوسری شادی کے حق میں نہ تھیں ان کی زندگی کی واحد امید ششربل تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس ہی مقیم تھیں۔
ششربل نے دو تین سال تو وہ سب کے ساتھ ہی رہیں۔ مگر ان کی والدہ مبارک بیگم نے غصے سے کہا کہ نیکلہ بیگم کی دل لگی کا کوئی نہ کوئی سامان تو ہونا ہی چاہیئے۔ مگر پھر تو ماشاء اللہ یہ سب کالرج ہے ہونا بھی چاہیئے ان کا حق ہے۔ مگر اس طرح اس گھر میں نیکلہ بیگم کی حیثیت بالکل جہان کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بالکل بے حیثیت، ایسی جگہ ہونی چاہیئے جسے وہ اپنے شوق و خواہش سے بنائیں نہ لواریں۔ مگر رستی میں ابھی رہیں تاکہ زندہ رہنے کا کچھ توا جواز ہو۔ ان کے جیمہ کا سب سامان چول کا توں بند بڑا تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ بہت کڑھیں وہ جہانوں کی طرح رہ رہی تھیں۔

مال تھیں بیٹی کا فم اچھی طرح محسوس کرتی تھیں۔ انہوں نے انیکسی نیکلہ بیگم کو دے دی اور تجویز کیا کہ وہ اگر الگ رہنا چاہیں تو شوق سے اسے اپنے ذوق و شوق کے مطابق آراستہ کریں۔ ان کے اس فیصلے سے نیکلہ بیگم کو کوئی زندگی مل گئی۔ شروع میں تو انہوں نے اسکی آراش میں کوئی خاص ڈیجی نہ لی۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اس میں اپنے گھر کی سی ڈیجی لینے لگیں۔ گھر کی عبادت کے لیے بانا ر کا کچھ بھی رکھائیں۔ گھر کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور خوبصورت بنانے میں لگی رہیں۔ اور جب ششربل کی حیرت انگیز ترقی کے ساتھ وہ بیوہ بن گئیں تو ان کے لئے بہت اہمیت رکھتے۔ صدف اور ششربل میں تو ان کے

”یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ شریفل نے سفیدگی سے

پوچھا۔

”کونسا سلسلہ؟ صدف نے معصومیت سے کہا۔

”بھئی کبھی گھومنے کا۔ بہنیں سے لے کر اب تک تو یہاں آئے پر کبھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر اب کیا ہو گیا۔ کیا خاص فرق آ گیا ہے ہم میں؟“ شریفل نے کہا

”میری چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی سب کی نظر میں کھٹکتی ہیں۔“ صدف نے پر غم آنکھوں سے شریفل کی طرف دیکھا۔ صدف کو سدا جھلانے اور ستانے والا شریفل اس کے آنسو دیکھ کر ٹرپ اٹھا۔

”بزدل ان آنسوؤں کو دہیں روک لو ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا ذرا ذرا سی بات پر بیٹھ جاتی ہوں آنسو بہانے۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ ذرا بہت سے کام لو۔ بہنیں ڈاکٹری پڑھنا ہے؟ ہتھاراکوئی بہانہ قابل قبول نہیں؟“ شریفل نے پھر رعب ڈالا۔

صدف سر جھکا کر رہ گئی اور یوں اس کی خواہش کا احترام کرنے ہوئے صدف نے پہلی بار بھیجی تھیں آنکھوں سے اپنے باپ سے ایک درخواست کی۔ صلاح الدین نے اسے میڈیکل میں داخلہ دلوا دیا۔ شریفل مطمئن ہو گیا۔ صدف عالمہ جناح میڈیکل کالج میں داخل ہو گئی۔ میڈیکل کی پڑھائی کافی زیادہ تھی۔ جب کبھی وہ پڑھتے پڑھتے تنگ جاتی کرتا ہیں اٹھائے شریفل کے پاس چلی جاتی۔

”شریف جانی خدا کی قسم جہانے آپ نے کونے جہان کا بدلہ لیا ہے۔ مجھ سے نہیں پڑھی جاتی، یقیناً میں ٹیل ہو جاؤں گی۔“ وہ جھنجھلا کر کہتی۔

”کوئی بات نہیں پانچ سال کے بچے اٹھ سال میں ڈاکٹر بن جاؤ گی۔ دیر آئیہ درست آئیہ وہ شریفل بے حد اطمینان سے کہتا تو وہ جل ہی تو جاتی۔

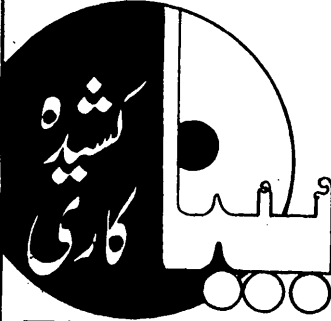
”بندر کھیں ابھی کالی زبان۔ خدا نہ کرے جو میں کبھی نیل ہوں۔ انشاء اللہ پانچ سال میں ہی ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔“ وہ تن کر بڑے وثوق سے کہتی۔

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ“ شریفل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی اور جب کبھی شریفل اسے رات دن کتا یوں میں عرق دیکھتا تو کہتا۔

”صدف اتنا نہ پڑھا کرو۔ دماغ خراب ہو جائے گا۔ اور یہ جو گڑبھر کی لمبی چوٹی ہے ناچو ہیا کی دم جتنی رہ جائے گی۔“ وہ اس کی چوٹی کو زور سے پیچ کر کہتا۔

”اچھا ہے آپ کو جہین آجائے گا۔ آپ فروع دن سے ہی

خواتین کے لئے
ایک حسین
تحفہ



مرتبہ
خیال فرمیں

نے دوزخ کے تقاضے

بیگز، شوار کے پینٹ، میگزین، تکیے، کرسی
مذکورہ پر لاگو ہونے کے لئے ہر ایک کے ذمہ داری
ہے۔ بھول چار سوتی کی کڑی کا دینا ہی ارادہ
سب کچھ جوئے کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے

غصہ صبر مردوق اور غصہ کا تھوڑا بچھی ہوئی

قیمت ۲۲ روپے

اسی اشتہار کے حوالے سے منظرانے پر ناک فروغ سمان

مکتبہ

خواتین ڈائجسٹ

آرٹو بازار —

پریشان کرنا تھا۔ اچھا ہے کچھ دنوں میں امن رہے۔
میرا بیگم سادگی سے کہیں تو صدمت خاموش رہ جاتی۔ وہ
پھوپھی سے کیا کہتی۔

” بلا سے اسے پریشان کرنا تھا تاتھا مگر یہاں تو تھا۔
اس گھر میں رونق تو تھی۔ اب تو دن گزارے نہیں گزرتے۔“
اپنی دنوں صلاح الدین نے میرا بیگم سے کہا۔

” صدمت کے رشتے تو اتنے ہی دہشت ہیں مگر میں ٹالنا رہا۔“

مگر اب جو رشتہ آیا ہے مانے والا نہیں رالیا کا بھی یہی خیال ہے
لو کا بہت اچھا ہے انجیئر ہے بہت ہی معزز اور شریف لوگ
ہیں۔ ان کے تینوں بیٹے بیٹے شادی شدہ ہیں۔ یہ سب سے
چھوٹا ہے۔ ہمارا کیا خیال ہے میں تو سوچتا ہوں کہ سگنی کر دیں۔“

” بھائی جان آپ کو اختیار ہے آپ کی بیٹی ہے ویسے بری
’نقص راتے تو یہ ہے کہ اسے ڈاکٹری پڑھ لینے دیں۔ بچی کا شوق
ہے، صدمت سے مشورہ ضرور کر لیں۔“ میرا بیگم نے بے حد سچے
ہوتے بیٹے سے کہا۔

” ڈاکٹری تو ابھی تین سال بقایا ہیں وہ اتنا انتظار نہیں
کریں گے۔ دیے ان کا کہنا ہے صدمت اگر پڑھنا چاہے تو پڑھتی
رہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ لو کا بہتیں لاہور ہی میں ملازم ہے۔
آپ سے یہیں، فرج بھی تیزی سے بڑی ہو رہی ہے۔ اب اس کی بات
طے ہو جائے تو ان کی بھی نگر کر دیں۔ خیریتا اور حنا کے متعلق بھی
سوچنا ہے۔“ صلاح الدین نے بتایا۔

” بھائی جان آپ فرج کی کر دیں۔ ایف اے کر چکی ہے
صدمت کو اطمینان سے پڑھنے دیں۔“

” رالیا نہیں ناتی۔ کہتی ہے لوگ کہیں گے اپنی بیٹی کی کر دی
صدمت سوتیلی ہے نا اس لئے اس کے متعلق نہیں سوچا۔ اس پر
بات آجائے گی۔ بات تو اس کی بھی معقول ہے۔“

” آپ کو اختیار ہے بھائی جان میں تو صرف صدمت کے
پڑھائی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ صدمت سے معزز پوچھ لیں کیونکہ
اتنے ذہین بچوں کا اس طرح سے پڑھائی چھوڑنا ٹھیک نہیں ہوتا۔
بعض اوقات ذہن پر بھی اثر ہو جاتا ہے۔“

” صدمت کی راتے تو مقدم ہے۔ رالیا نے تسلی کر لی ہے۔
صدمت کو کوئی اعتراض نہیں۔“ صلاح الدین نے بتایا تو میرا بیگم
بھی مطمئن ہو گئیں اور یوں شرچیل کے آنے سے پہلے ہی صدمت کا
رشتہ طے ہو گیا۔

میرے بالوں کے دشمن ہیں۔ آپ تو چاہتے ہی یہی ہیں، صدمت جسے
دل سے کہتی۔

” نہیں یہ بات نہیں۔ مجھے تو ہمارے یہ کالے ناگ بہت
اچھے لگتے ہیں۔“ شرچیل کی آنکھوں میں خوبصورت سے رنگ اتر
آئے۔

” آپ کو اچھے لگتے ہیں؟ صدمت چونک کر اسے دیکھتی تو وہ
ہنس دیتا۔

” لمبے بال ہیں نا کھینچنے میں لطف آتا ہے۔ بس اس لئے
اچھے لگتے ہیں۔“

” آپ سے زیادہ تو میرے بالوں کا کوئی دشمن نہیں۔ کوئی
مزدور نہیں۔ میرے بالوں کو ہاتھ لگانے کی کسی دن اس طرح کھینچتے
کھینچتے میری ہوتی ہی آپ کے ہاتھ میں رہ جاتے گی۔ شرچیل بھائی سے
چھوڑیں نا میرے بال۔“ صدمت چیخ کر کہتی

” دف اس قدر نہ جینا کر دیا کل دف کی طرح ذرا ہاتھ لگایا
تو بچ اٹھا۔ ابھی اتنی بھائی چلی آئیں گی کہ مستقبل قریب کی ڈاکٹر بنیں
سے زیادہ شوگر کیوں بھاری ہے۔“

” آپ نے مجھے پھر دف کہا۔“ صدمت نے غصے سے کہا۔
” تو پھر اور کیا کہوں۔“ صدمت کی تو کوئی غولی تم میں ہے
نہیں۔ جانتی ہو صدمت کا کیا مطلب ہوتا ہے۔“ سیپ خاموش
چپ چاپ۔ خوبصورت۔ راز داں۔ نرم تو سر وقت دف کی طرح
بجی نہتی ہو۔ یہ کہتے ہوئے شرچیل ہنستا ہوا چلا جاتا۔

” آپ بھی شرچیل نہیں۔“ سر۔“ میں وہ دانت پٹیتے
ہوئے کہتی۔

یہ زمانہ بھی منہ سے کھیلے ہی گزر گیا۔ شرچیل نے ڈاکٹری کا فائنل
کا امتحان دے دیا اور صدمت نے فرسٹ پوزیشن لے کر دونوں ہی
فارغ تھے۔ شرچیل کے ایک چچا اور پھوپھی کرانچی میں رہتے تھے۔
پھوپھی بار بار اسے بلا جی تھیں۔ اب فارغ تھا۔ میرا بیگم نے کہا،
” بیٹا! پھر مصروف ہو جاؤ گے کچھ دنوں کے لئے گھوم پھر آؤ۔۔۔۔“
اس نے تو ایک ڈیڑھ ماہ میری نفریح میں گزارا۔ مگر صدمت اس
کی عدم موجودگی میں بلانی بلانی پھرتی۔ اسے تو یوں لگتا جیسے
سارے گھر کی رونق بلکہ ساری دنیا کی رونق ہی شرچیل کے دم
سے تھک

” چھپو شرچیل بھائی کب واپس آئیں گے؟ وہ اکثر میرا بیگم
سے پوچھتی رہتی۔

بیادیت بعد تو دو حیاں لگے اس کے چچا بھی وہیں ہیں
پھوپھی بھی۔ جب دل بھر جائے گا آجائے گا۔ نہیں تو بہت ہی

بعض کسی اطلاع کے شرچیل بالکل اچانک ہی آگیا۔ میرا بیگم

اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئیں۔ یہ تو ان کا دل ہی جانتا تھا کہ انہوں نے شہزاد کی جدائی میں یہ پہلا سہ دن کیسے گزارے ہیں۔ شرجیل کو اتنے دنوں کے لئے بیچ کر انہوں نے بہت حوصلے کا ثبوت دیا تھا۔ بظاہر تو وہ خاموش تھیں مگر دل تھکا کہ اندر ہی اندر دوڑتا چلا جاتا تھا پھر بھی سوچیں کہ انہیں شرجیل کو یوں اپنے ساتھ نہیں لگائے کہتا رہا ہے۔ اولاد کی خواہش زندگی ہوتی ہے وہ والدین سے چپکے تو نہیں رہ سکتے۔ مگر وہ بے پاری بھی کیا کرتیں۔ ان کے توجہ سے کا واحد سہارا ہی یہی بیٹا تھا۔

”یادِ وحدت کئی سرائل سے آئے ہیں۔ بھائی جان نے
صدف کا شہرہ ایک کبوتر سے ملے کر دیا ہے۔ وہ نوک آج بھی
آتے ہوئے تھے۔ ابھی نہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں“
نیرا بیکم نے بتایا۔
لدو ستر بیل کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا۔ ماں کے
الفاظ نہیں تھے نوک دار بھلا تھا جوان واحد میں اس کے دل
روح کی انگلیاں تھا وہ وہی سر مست کام کر رہا گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ مینر ایٹم نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔ ہل بھر پہلے چمکتا ہوا شمر جیل سببانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس کے ذرا اوسان درست ہوئے تو وہ اٹھ گیا۔

”بیٹے کیا ہوا ہے؟“ نیز ایگم نے پھر پوچھا، شرمیل کی غیر معمولی حالت اس نے چھپی نہ رکھی، وہ تڑپ اٹھیں، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شرمیل اخلاقی پابندیوں کی پرواہ کئے بغیر دروازہ کھول کر باہر داخل ہوا، کمرے میں کچھ اندھیرا سا ہو رہا تھا، صدف خاموش بیٹھی تھی، اس کے پاس پھولوں کے ہار اور کمرے پرلے تھے۔ شرمیل نے ہر کمرے کی چلائی، تو صدف نے چونک کر دیکھا، شرمیل کو سونے دیکھ کر حیران رہ گئی، وہ اس کی دایسے سے قطعاً غلام تھی، ”کس کا سوگ منا رہی ہو؟“ شرمیل نے قدرے سختی سے پوچھا۔

”یکس کا مزار ہے؟ اس نے ہاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

صدق خالی خالی نظروں سے شرمیل کو دیکھ رہی تھی۔ پڑمڑہ تھی۔ بالکل مر جھانی گئی کی مانند۔ شرمیل کو اپنے سخت الفاظ کا احساس ہوا۔ وہ بھی کیڑا کتا اس کا اپنا دل بھی تو خون ہو جائے تھا۔ لکڑے لکڑے سے کرتا۔ مگر صدق کی حالت پر اس کا اپنا دل سے کہنے لگا۔

”صدف بہاں کیوں بیٹھی ہو؟ چلو ہمیں امی مل رہی ہیں“
اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تو صدف کی غامض
آنکھوں میں آنسو بھر اُٹے۔

اس کے ساتھ نیرانیم کے پاس چلی گئی۔

سارک حکیم کی وفات کے بعد تو وہ بہت ہی تنہا ہو گئی تھیں۔ ماں کے دم سے وہ اپنے آپ کو بہت ہی محفوظ خیال کرتی تھیں۔ سارک حکیم کو بھی ان کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔ دن میں کوئی بھی بار انہیں کام چکر لگا کر نہیں۔ وہ نیزا حکیم کو تنہا رہنے ہی پسند دیتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد اتنا خیال کون کرتا تھا جیسا کہ بہت اچھی نہیں مگر اپنی اپنی گھر واری اور بچوں میں ابھی ہوئی برے عالمی صلاح الدین تو یہی گھر میں تھے مگر دونوں چھوٹے بھائیوں کی ذرا فاصلے پر اپنی الگ الگ کوشیاں تھیں۔ ان کی اپنی مصروفیات تھیں۔ آنا جانا تو رہتا ہی تھا مگر ان میں بات کہاں ہو سکتی تھی۔ نیزا حکیم کی دنیا تو شریں کے دم سے یاد تھی۔ مدت سے رونق تھی۔ دونوں کی پھر صحابہ نیزا حکیم کی زندگی میں بھی ایک لہر دوڑا دی اور وہ محبت بھری نظروں سے دروں کی یکساں کو دیکھا کرتیں۔ اب شریں کی عدم موجودگی میں وہ رونق بھی ختم ہو گئی تھی۔ مدت گھنٹوں سوچ بھی کے پاس اگر میری رہ کرئی۔ یا نیزا حکیم ان ب کے پاس جا بیٹھیں۔ مگر دل تھا کہ بیٹے کی مدد میں بے حد اس تھا۔ اب یوں اچانک شریں کو آئے دیکھا تو ان کو خوشی سینماں مشکل ہو گیا۔

”اسنے کی اطلاع تو دی ہوئی!“

”امی جان بس یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل اداس ہو گیا۔ بغیر میٹ ریزور کرائے چلا گیا۔ ساری رات یوں ہی اٹھوں بیٹھوں کے زاری مگر آپ کو کچھ کرسا رہی تھکاوٹ جانی رہی پہنچ اسبے بہت یاد آئیں ایک دن بھی ادرگرا ناما شغل ہو گیا۔ مٹر جیل نظر پلٹیں ہیں رکھے۔ لٹوؤں پر پڑی۔“ امی بے لادو میرے کانے غوغا میں مگھائے ہیں آپ نے توبہت بڑا اہتمام کیا ہے اس لک لک و منہ میں ڈالتے مورتے کہا۔

”بے ایمان تم نے مجھے آنے کی اطلاع دی تھی جو میں اہتمام کرتی۔ یکے مڑے ڈیڑھ ماہ مل کے بغیر گزار آئے۔۔۔۔۔
اب انہی یاد آتی کہ کپٹ ریڈ زور کو لانے کی بھی ضرورت محسوس

الہن میں تھیں۔

”صدف میں عزتوں کی بڑی اچھی کیٹ لایا ہوں منوگی، شریل نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا۔

”نہیں میرا دل نہیں چاہتا، صدف نے کہا۔

دل کے چاہتے نہ چاہتے سے اس کا کیا تعلق، گانے تو کانوں سے سنے جاتے ہیں چلو اٹھو، شریل کا ایک دم ہی پرانا موڈ عود کو گیا صدف چپ چاپ اٹھ گئی۔

”اگر اس رشتے سے اس قدر ناخوش تھیں تو انکار کر دینا چاہیے تھا۔ یوں اپنے آپ کو سزا دیے گا کیا فائدہ، شریل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شریل بھئی اس رشتے کی بات نہیں، دراصل میں ذہنی طور پر شادی کے لئے بالکل تیار تھیں۔ میں کسی سے بھی ایجنٹ نہ کر سکتی کاش آپ نے مجھے یوں ڈاکڑی کے لئے آمادہ نہ کیا ہوتا۔“

”کاش کبھی تم نے میری رتی کینیت جلنے کی بھی کوشش کی ہوتی، تبھی کیا معلوم میری اس وقت کیا حالت ہو رہی ہے۔ میری ٹیک نیٹی پر شک کر کے خواہ مخواہ ہی مجھے مورد الزام نہ ٹھہرائی رکھو۔“

شریل نے پہلی بار ذرا انسانیت سے بات کی۔ اس کا لہجہ بہت ہی دھیمہ تھا آواز میں اندر دگی گھٹی تھی، صدف نے اسے حیرت سے دیکھا ”کیا واقعی آپ کو میری حالت پر دکھ ہو رہا ہے۔“

”نہیں اس وقت سے ایک ٹک کر رہا ہوں، شریل نے ذرا تنہی سے کہا۔

”شریل بھائی! بھلا آپ سے کوئی کیا بات کرے غصہ تو اب کی ناک پر دھرا رہتا ہے، کبھی تو کسی بات کا سیدھا جواب دے دیا کروں، صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم سوال ہی ایسے بے نیکی کرتی ہو، اپنا سر پھوڑ لینے کو دلے چاہتا ہے۔“

”کیا واقعی آپ کو میری حالت پر دکھ ہو رہا ہے؟“

”جواب آپ کی کہیں میں اپنی قسمت پر اٹھو بہا رہا ہوں کیر ہمارے لیجر کیا کروں گا، میں تو مہنار سے لیجر جینے کا قصور بھی نہیں کر سکتا، یہ ڈیڑھ ماہ جس مشکل سے گزار رہے ہیں ہی جانتا ہوں ہم

دیں اپنے دل سے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ کبھی ہمارے لیجر کو پیسے جاؤں گا نہیں، اسی لئے تو مجبور کر کے کہیں ڈاکڑی کی طرف گھسیٹا، تم کچھ دیر ان پکڑوں سے آزاد ہو، محفوظ ہو سکنا تو میں کچھ خیر سے مستقبل بنا سکوں اور اس قابل ہو سکوں کہ ماموں جان کے پاس انکا کرنے کا کوئی جواز ہی نہ ہو، شریل نے بہت ہی سنجیدگی سے اسے

سب کچھ بتا دیا۔

میرا بیگم تو شریل کی حالت دیکھ کر ہی سوچوں میں غرق تھیں۔

تفکر میں مبتلا تھیں، اپنے آپ کو ملات کر رہی تھیں کہ انہوں نے شریل کے جذبہ کو سمجھا کتنا تھا، انہیں اگر ذرا سچی اندازہ ہوتا تو وہ مزدور بھائی کے سامنے دامن پھیلاتی، اگر ناکام بھی ہوئی تو بھی انہیں کم از کم اپنے آپ سے گلہ تو نہ ہوتا کہ انہوں نے بیٹی کی خوشی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ وہ بے حد پریشان تھیں، اب جو صدف کو اس حالت میں دیکھا تو تڑپ کر اسے پلٹنے لگا گیا۔

”صدف میری بچی تمہیں کیا ہو رہا ہے، کیا شریل نے کچھ کہا ہے؟“ انہوں نے پیار سے پوچھا۔

صدف نے نفی میں سر ہلایا اور دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں، شریل بغور صدف کو دیکھ رہا تھا۔

”ابھی میرے کچھ کہنے سے اس کی کبھی یہ حالت نہیں ہوتی، یہ تو آپ لوگوں کی ستانی ہوتی ہے۔“ شریل نے دکھ سے کہا۔

”میں نے بھائی جان سے کہا تھا کہ صدف سے مزور مشورہ لیں، ذہین بچی ہے اس طرح پر بھائی چھوڑنے سے اس کے ذہن پر اثر پڑے گا۔ کیا راجعہ بھیجانی ہے تم سے پوچھا نہیں تھا۔“

میرا بیگم ان دونوں کی حالت سے بخوبی واقف ہو گئی تھیں۔ مگر وہ کوئی بات بھی زبان سے نکالنا نہیں چاہتی تھیں، اس لئے دانستہ پر بھائی کی آڑ لے رہی تھیں۔

”نچھو مجھے خبر نہیں میرا دماغ بالکل کام نہیں کرتا، یہ سب کیا ہو رہا ہے، صدف نے روتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں ہو رہا، اگر تم نہیں چاہتی تو مجھ سے ہو گا، میں ابھی ناما جان کے پاس جاتا ہوں، شریل نے ذرا تیز آوازیں کہا۔

”شریل خدا کے لئے تم کچھ نہ بولنا، میرا بیگم نے کہا۔

”آپ بھی نہ بولیں میں کبھی نہ بولوں اور یہ بھی نہ بولے تو پھر بولے کون؟ یہ بھی تو بادیں، شریل نے ماں سے پوچھا۔

”بیٹے! کاش میں کچھ بول سکتی۔“

”آپ ماموں جان سے یہ تو کہہ سکتی ہیں اسے ڈاکڑی مکمل کرنے دیں، پھر عمل کر انسانیت کی خدمت کریں گے، ہاں بھر کے لئے شریل نے ماں کی طرف دیکھا، انہیں اپنی ہی طرف دیکھتا ہوا اس کی نظریں جھک گئیں۔ اپنے جذبے کی تعمیر پر وہ حقیقت سے سیکھا بے حد بولنے والا شریل بھی دم بھر کے لئے ہلکا سا لگا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میرا بیگم بجز ریشمے کو دیکھ رہی تھیں، اس دم انہیں اپنے بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا، ان کا دل جا دکھ رہا کہ ان کی فرخواری پوری کر دیں، مگر وہ مستعد مجبور تھیں، بھائی نے توان سے مشورہ مانگا تھا صلاح کی تھی، اب اگر وہ ان سے کچھ کہتی تو وہ کہتے اگر ایسا خیال تھا تو پیچھے کہا ہوتا، وہ سخت

صدمت حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ شریل کی کہہ رہا ہے۔ وہ جو شروع دن سے اسے سنا تاڑتا چلا آیا ہے۔ مگر اپنے روپے کے باوجود اسے ہمیشہ ہی عزیز رہا۔ اس کے دل میں تو شریل کا ہی کس تھا۔ اس کے بغیر اس کی اپنی زندگی سوئی تھی اگر شریل کا جود درمیان میں نہ ہوتا تو شاید آج یوں لٹی لٹی سی رہتی صرف پڑھائی کا کام ہوتا زندہ رہنے کا کوئی توجہ نہ ہوتا۔ مگر اب شریل کو کھڑک دیکھا محال تھا۔ زندگی عذاب تھی۔ مگر وہ یہ سب کس سے کہتی تھی تو اس کی اپنی سوچیں تھیں۔ وہ شریل کے خیالات سے لاعلم تھی۔ آج جب یہ سب کچھ شریل کے منہ سے سنا تو اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ انکھیں چپک چپک کر شریل کو اس کی نظر دل کیلئے یقینی پرے پناہ پیارا کر رہا تھا۔

"اب انکھیں چپک چپک کر مجھ سے اور کس بات کے تصدیق چاہتی ہو۔ کیا میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔ بالکل بدصوبہ۔ اسی لئے تو کہتے ہو کہ مہربانی ساری عقل ان بالوں نے کھائی ہے۔ کھوپڑی تو بالکل خالی ہو گئی ہے۔ اسنے بے بالوں کو آخر خوراک بھی تو چاہیے؟"

صدمت کے تو بصورت کھلے بال شریل کے ہاتھوں میں تھے صدمت نے کوئی اعتراض نہ کیا اور نرمی شریل نے پہلے کی مانند بالوں کو کھینچا بلکہ بے حد احترام و پیار سے انکھوں سے لگایا۔

"صدمت تیرے گیسوؤں کے یہ مقدس اندھیرے مجھے ہر روشنی سے زیادہ پیارے ہیں۔"

وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ صدمت بھی کسی بحر میں گم تھی۔

"میں آج ہی ناخبرانہ سے بات کروں گا نہیں میرا ہاتھ دینا ہو گا۔" شریل اس سے کہتا رہا اور وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ کس قدر خوبصورت تھے وہ طے کاش وہ اس کی ساری زندگی پر محیط ہو جاتے تو وہ آج اس قدر تنہا نہ ہوتی؟

• ڈاکٹر صاحب تین بج گئے ہیں؟

آپانے آکر کہا تو وہ چونکی وہ کہاں کھو گئی تھی۔ مہنی کے گھڑاؤں میں یا غلازادوں میں۔ اس نے تو اپنی زندگی مریضوں کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اپنی تنہائیوں کو شریل کی یادوں سے آباد کر رکھا ہے۔ آج شریل اس قدر اچھی بن کر سامنے کیوں آگیا۔ آیا چلی گئی۔ اس نے پھر کرسی کی پشت پر سر ٹپک دیا۔ یادیں تھیں کہ برکھا کے بادلوں کی مانند اس کی چلی آ رہی تھیں۔ وہ کتنی بے رحم ہو رہی تھی۔ ان بادلوں نے اسے کتنا بے بس کر دیا تھا۔ وہ بری طرح ان کے حصار میں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ کل کے واقعات ہوں۔ اسے یاد آیا کہ پھر دوسرے روز دادا جان کے پاس اس کی

طبی ہوئی۔ اس کے ابو پھر بھی سوتیلی ماں رابعہ گیم۔ شریل بھی موجود تھے۔ کیسا مشکل مرحلہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پل مراط پر سے گزر رہی ہو۔ خان بہادری صاحب نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بہت شفقت سے پوچھا۔

"صدمت کیا اس رشتے کے متعلق تم سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ خان بہادری صاحب نے دوبارہ پوچھا۔ صدمت خاموش تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ "بیٹی کیا تم اس رشتے سے ناخوش ہو؟" مگر وہ تو کچھ بھی نہ بول سکی۔

"اباجان یہ رشتہ کسی کی مرضی سے طے ہوا ہے۔ رابعہ گیم نے خود اس کی مرضی معلوم کی ہے آپ سے کسی نے غلط کہا ہے؟"

صلاح الدین نے ایک نظر شریل پر ڈالی۔

"جی اباجان میں نے خود صدمت بیٹی سے پوچھ کر ہی آپ کو بتایا تھا۔ رابعہ گیم نے بہت صفائی سے جھوٹ بولا۔ اس پر صدمت نے بھیگی انکھیں اٹھا کر رابعہ گیم کو دیکھا۔ اتنا بڑا جھوٹ۔ رابعہ گیم کی آنکھوں میں الجھا تھی۔

"میرا بھرم دکھ لو ورنہ بہت سکی ہوگی۔ اتنے سالوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ لوگ سوتیلی ماں کو کبھی بھی قابلِ اعتماد نہ مانیں گے۔" رابعہ گیم بالکل زرد ہو رہی تھیں۔

انہوں نے تو اس سلسلے میں صدمت سے بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یقیناً صدمت اور شریل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں جب کہ وہ اپنی بیٹی فخر کا رشتہ شریل سے کرنے کی خواہش مند تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ فخر ہوم ان کی نظر دل کے سامنے رہے۔ دیے بھی شریل بہترین اوصاف کا مالک تھا گھر کا بچہ۔ دیکھا جھالا۔ ان کے سامنے پلو پڑھا جاتی اچھی طرح وہ غیر کو گھونگر جان سکتی تھیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی شریل کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ یہاں پر وہ صرف ماں نہ رہی تھیں بلکہ انہوں نے خود مرضی کو اپنا شعار بنالیا۔ روایتی سوتیلی ماں کا سانڈا زاپایا اور بے زبان صدمت سے مشورہ کے بغیر ہی اس کی طرف سے منظوری دے دی۔ صلاح الدین نے کبھی بھی اپنی بیوی کی نیت پر شک نہیں کیا تھا وہ سوتیل بھی نہ کہتے تھے کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

صدمت نے رابعہ گیم کو دیکھا اور پھر صلاح الدین کا سرخ ہوتا چہرہ۔ وہ جانتی تھی کہ صلاح الدین غصے کے بہت تیز ہیں۔ سب کے سامنے رابعہ گیم کو کس طرح ذلیل کر دیں۔ اگرچہ رابعہ گیم نے اسے کبھی بھی پیار نہیں دیا۔ مگر کچھ کہا بھی نہ تھا۔ ہمیشہ اس سے لاتعلقی ہی رہیں۔ مگر پچھلے دوسالوں سے پچھلی کے

گھر جانے اور شریوں سے گھل مل کر باتیں کرنے پر اسے بری طرح گھوڑا کرتی۔ ان کی نظروں سے صدف سہم ہایا کرتی تھی۔ ان آنکھوں میں ماں کا پیار یا ملامت نہ ہونی بلکہ عیب طرح کی نفرت ہو کر تھی۔ بھڑک آج وہی نظروں میں ان کے سامنے تھیں مگر ان میں نفرت یا حقارت نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسا جھٹکا تھا کہ ”میرا بھرم رکھ لو“ سامنے ہی شریوں تھا نا۔ ”جواب دونا۔ آنا جان کیا پوچھ رہے ہیں؟“ صلاح الدین کے لیے میں تدریس سنتی تھی آواز بھی آؤ تھی تھی۔

”پوچھا مگر میں تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں“ صدف نے مشکل کہا۔

”میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم تعلیم بعد میں بھی جاری رکھ سکتی ہو“ صلاح الدین نے اطمینان سے کہا اور یوں یہ غفلت برخواست ہو گئی۔ سب ہی اٹھ گئے۔ خان بہادر صاحب اور صلاح الدین نے شریوں کو شہر ہرنے کے لئے کہا۔

صدف اپنے کمرے میں آکر بیٹھا لی گئی۔ وہ بار بار سوچ رہی تھی کہ والدہ بگم نے جھوٹ کیوں بولا؟ میں ان پر بوجھ کب سے جوہ اس قدر مجھ سے چھٹکارا پانے کی خواہش مند ہیں انہوں نے کبھی مجھے ماں کی شفقت نہیں دی۔ چاہت نہیں دی، میرا خیال نہیں کیا اور میرا اس سلسلے میں وہ ماں کا رد اور اکر کرنے کے لئے کیوں آگے بڑھیں۔ اتنا برا جھوٹ بول کر میری زندگی کی ہر خوشی مجھ سے چھین لینے کا اختیار انہیں کس نے دیا؟ مجھے تو ماں کی شفقت چھپچھو کی گود میں ملی۔ کاشش آجا جانے اس سلسلے میں والدہ بگم پر اعتبار نہ کیا ہوتا۔ یہ سب چھپچھو کے ذریعے ہوتا تو وہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولتیں۔ خود جھوٹ بول کر مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا۔ اب میں اگر ان کی ایسا ہی نظریں نظر انداز کر کے کہہ دیتی کہ یہ سب جھوٹ ہے تو ان کی کیا عزت رہ جاتی۔

”اس ٹیٹ میں اتنا برا جھوٹ۔ ان کے بچوں پر کیا اثر ہوتا۔ اس آئی او جیجکٹ پر وقت اپنی ضرورت اور درجے کو کیوں بھول جاتا ہے۔“ صدف خود سے باتیں کر رہی تھی اور جب شریوں کا سراپا لگا ہوں میں آکا تو وہ سک اٹھی۔

”شریوں مجھے معاف کر دینا۔ میں بالکل مجبور ہو گئی ہوں میں بیلا اور کیا کہتی۔ ہمت کر کے یہ تو کہہ دیا کہ میں ڈاکٹری مکمل کرنا چاہتی ہوں مگر کسی نے میری سزا کب۔ کاشش آج اپنی ماں زندہ ہوئی تو مجھے یوں برباد ہوئے نہ دیکھ سکتی۔ اب میں اپنا دکھ کسی سے کہوں۔“

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ شریوں کی آواز کرے میں گئی۔

”اب یہاں بیٹھی آنسو بہا رہی ہو۔ میری بربادی پر شاد دیا نہ بچو“

مجھے بول عزت کر داکر تم بھی کبھی چین سے نہ رہو گی۔ صدف مجھے بتاؤ وہ جھوٹ تھا جو تم نے مجھ سے کہا تھا یا یہ جھوٹ ہے جو تم نے مانا مجھ سے کہا۔“ شریوں نے حد غصے میں تھا۔

”شریوں میں آپ جھوٹ نہیں بولی کبھی کوئی جھٹکا اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ خدا کی قسم کسی نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا صدف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”تو پھر مانا جان کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“ آپ نے ابو اور امی کی حالت نہیں دیکھی تھی وہ دادا جان کے سامنے کیسے مجرم بنے کھڑے تھے۔ مجھ سے سب برداشت نہیں ہو سکا۔ میری سوچی ماں نے مجھ سے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا۔ مگر میں ان کو ڈھیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”وہ تمہارے اپنے ہیں ناں۔ ان کے دکھ معلوم سے کیوں برداشت ہوں گے۔ دادا پر لگانے کے لئے تو میں رہ گیا ہوں جس نے تمہیں ٹوٹ کر چلا۔ عزت تو میری تھی بہتیں یہ سب اپنے مبارک ہوں میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں۔“ شریوں کے لیے میں غصہ اور مایوسی دونوں ہی تھے۔

”آپ میری مجبور یوں کو نہیں سمجھتے تو چکے آنسو بہاتی رہی۔“ خدا کے لئے صدفوں پر اتنا فقرہ زور پانا۔ مجھے نفرت ہے ان مجبور یوں سے۔ سب بولنا سکھو۔ صدف بہلاؤ مجھے ان باتوں سے۔ میری تو آنکھیں ہی آج کھلی ہیں۔ بے وقوف ہیں ہی تھا تو ہیں اپنا جانا رہا۔ اس جذبے نے مجھ سے سب کے سامنے رسوا کر دیا۔ تم تو افراد کر کے سرخرو ہو گئیں۔ مجھے کس جرم کی سزا دی ہے۔ بولو صدف کو نے جنم کا بدلہ لیا ہے۔“

شریوں نے صدف کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر غصے سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے والدہ بگم نے شریوں کو صدف کے کمرے سے نکلتا دیکھا اور پھر آنسو بہاتی صدف کا سراپا پل بھر کے لئے ان کی نظروں میں لہرایا۔ مگر انہوں نے کھڑکی کا پردہ چھوڑ دیا۔ بن ماں کی بچی پر انہیں رحم بھی نہ کیا۔ اپنی ماں ہوتی تو اس کا پیچھے ل جاتا مگر نہ وہ اس معصوم کو کس جرم کی سزا دے رہی ہیں یا سزا اپنے سونچے پن کی شکن کی خاطر اس کی خوشیوں کی قاتل بن گئی تھی۔

صدف نے ہمیشہ ہی انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا تھا سناٹا کیوں ان کے دل میں صدف کے لئے تھوڑی سی جگہ بھی پیدا نہ ہو تھی۔ وہ پانچ بچوں کی ماں تھیں۔ تین بیٹیوں کی ماں اگر ان تینوں کے صدف سے بھی اپنی مادری میں سمیت لیں تو ان کی حیثیت میں کی توہ آجاتی مگر ان کے مرتبے میں اضافہ ہوتا مگر صدف کیا ان کی آنکھوں میں پیار کی نرمی تھی۔ دل میں محبت کی گرمی تھی۔

مگر غیر دیکھنے صدق کی بر مبروری کا ستر باب کر دیا تھا۔ ان کی خوش
محبت اس کے لئے دانتھی۔

صلاح الدین مطمئن تھے کہ دوسری شادی کر لے کے ماحود
ان کے گھر میں سویتی ماں کا کوئی رول نہیں۔ وہ رالعبیک کے شکر گزار
تھے کہ ان کی اعلیٰ ظرفی نے انہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ انہیں یہ معلوم
کر رالعبیک کا دل صدق کی بخت سے پھر خالی ہے۔ انہوں نے ردائی
سویتی ماں کا ایسا رول ادا کیا ہے۔ صدق پر ایسا کاری دار کیا ہے کہ
وہ ساری عمر خوشیوں کو ترسے گی۔ شرجیل اور صدق دونوں ہی
بے ہیں تھے۔ بڑا ہے تھے مگر نہ بھالے وہ کسی ماں میں جو بالکل
بے حس نہیں۔ رالعبیک نے سب کچھ جانتے بوجھتے سب کو دھی کر دیا تھا
نیرایم کو سدا کی دھی تھیں۔ تیس سال کی عمر میں یہ وہ ہوئی تھیں اور رولوں
کے دن ہوئی کی نظر ہو گئے۔ نئے شرجیل کو سینے سے لگائے انہوں نے
پہلی زندگی گزار دی۔ اب وقت آیا تھا کہ وہ بھی خوشی کے دن دیکھیں
بھلا باپ سے کتنی کہ رالعبیک نے یہ چھو چلا دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی
نہ شرجیل ناخوش ہے تو نیرایم خوش نہیں رہ سکتی۔ صدق بڑا
ہی ہے تو نیرایم خوش کیسے ہو سکتی ہیں۔ رالعبیک نے نیوں کو دھی
دیا تھا مگر نیرایم تھا لکھنوی تھا۔ وہ چپ چاپ ان کے ترپنے کا
نا شاد دیکھ رہی تھیں۔

شرجیل نے اسی وقت ماں سے کہا "امی میں ہمیشہ کے لئے
ہاں سے جا رہا ہوں اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ گی
یہ یہاں ایک پل نہیں رولوں گا"

نیرایم نے بیٹے کو دیکھا تو دل تڑپ اٹھا۔
"بیٹے آیا جان نے اسی کوئی بات کہہ دی جو یوں چراغ پا ہو
ہے ہو۔ کوئی بھلا اپنا گھر چھوڑ کر بھی کہیں جا نہیں۔ بڑے بزرگ
نوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہی دیا کرتے ہیں۔" نیرایم نے شرجیل
سجھایا۔

"اب کو معلوم ہے ماموں جان نے کیا کہا، کہنے لگے ہمارے
رول پرل رہے ہو اور ہماری ہی عزت کے دشمن ہو گئے ہو۔
ہیں صدق کو بہرے کے یا اس کے متعلق جھوٹی باتیں کرنے کا کیا
ہے؟ اہی میں اب یہاں نہیں رولوں گا،" شرجیل بے حد
میں تھا۔

"میں تو تمہیں منع کر رہی تھی کہ اس معاملے میں نہ بڑو۔
معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں بڑوں کے سمجھانے کے۔ تم کو غواغواہ
عذابانی ہو گئے"

پس اسی لئے جا رہا ہوں نہ یہاں رولوں گا اور نہ ہی عذابانی

منزل کا درد بھانے کیا کر بیٹھوں۔ برا غصہ۔ اس سے تو بہتر تھا
کہ میں کسی فن پتہ پر پنا پڑھتا۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں"

"شرجیل کیا پاؤں ہیں۔ اتنی سی بات کے لئے عمر کے اس
دور میں ہیں۔ وہ بڑا ہو جاؤں دنیا کیا کہے گی۔ بیٹے رشتے نانتے
تو مقتدر کی بات ہے اس کے لئے اس قدر رنج نہیں کیا کرتے؟"

"مجھے رشتے رشتے کا رنج نہیں۔ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔
بہت اچھا کیا انہوں نے مجھے میری حیثیت باد دلا دی۔ میری ادنیٰ
کی پہچان کرادی۔ آج باپ نے سب کچھ غصے میں کہہ دیا۔ کل
پہلی بھی یہی کہہ دیتی۔ میں ہی پاگل تھا جو سائے کے پیچھے بھاگتا رہا۔
غیر رولوں کو اپنا جانا۔ امی جان کیا آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گی؟"
کہاں جاؤ گے؟" نیرایم نے نہایت سناست سے پوچھا
"کہیں بھی"

"تم چلے جاؤ۔ جب غصہ بھٹکا ہو جائے تو آ جانا۔ اگر زندگی
رہی تو ای دہلیز پر بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی؟" نیرایم کے
آنسو تھے۔

"میں یہاں کبھی نہ آؤں گا،" شرجیل نے غصے سے کہا
"خدا کے لئے گھر بھیڑو کہ جائیں یہ صدق بخانے کے ہے
باہر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اب برداشت نہ کر سکی تو اندر
کرے ہی آگئی۔

"آپ سے کسی نے کہا کہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی
کر نہی؟" شرجیل پھر کرا۔

"بھچو آج آپ کے بغیر نہیں رہ سکیں گی۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا
تو" صدق نے کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ انہیں بھی تمہاری طرح باقی سب لوگ مجھ
سے زیادہ عزیز ہیں۔ اگر مجھ سے محبت ہوئی تو میرے ساتھ نہ چلیں۔
میرا تو یہاں ہی کبھی نہیں میں ہی غیر رولوں کو اپنا جاتا رہا۔ سائے کے
پیچھے بھاگتا رہا۔" شرجیل کی آنکھیں صدق پر لگی تھیں۔

"نصو میرا ہے مزا اچھو کہ یوں دے رہے ہیں۔ مجھے
ای جان سے مار ڈالنے نا،" صدق نے اس کے رستے میں آتے
ہوئے کہا۔

"میں نہیں جان سے ماروں گا۔ کاش ایسا کر سکتا دشمن جاں۔
اس نے ہاتھ سے اسے اپنے رستے سے ایک طرف کرتے ہوئے
عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"امی جان ایک بار مجھ سے ملیں؟"
"مجھے جو کہنا تھا کہ چلی؟" نیرایم کے آنسو بھی خشک ہو
چکے تھے وہ پھر فی اندبے ص جامد ساکت پیشی خالی خالی نظر آ رہے

بیٹے کو دیکھ رہی تھیں، شرجیل چھوٹا سا مٹھا کھٹائے کرے سے نکل گیا۔
 صدف گیسٹ ٹمک بھاگتی اس کے پیچھے گئی۔

”شرجیل بھائی رک جائیے۔ سرجیل خدا اراد رک جائیے۔ پھپھو کو کچھ ہو جائے گا۔“ سگر شرجیل نے ایک نہ سنی۔

”کیا سا کتنا تھوہ بھی کتنا درد رہا تھا شرجیل نے اپنی جانے والی اٹل ٹارٹاں کو۔ وہ خود بے چاری کسی کشتی میں تھی۔ اس دکھ کا اندازہ کر کے آج بھی صدف کی آنکھیں پھینکے لگیں۔ وہ اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ ڈاکٹر نشاط دیکرے میں داخل ہوئی اور صدف کو دہاں پیٹھے دیکھ کر میران ہو گئی۔“

”صدف کیا آج گھر نہیں گئی؟ ڈاکٹر شہاب نے اچھی تعریف کی کہ تم سب سے ناز تو کر ہسپتال میں ہی بیٹھی رہ گئیں۔ بھتیجی جازج رہے ہیں۔ میری آج شام کی ڈیوٹی ہے،“ ڈاکٹر نشاط نے کہا تو صدف چونک کر آنسو پیتی ہوئی کرسی سے اٹھ گئی۔

”کیا ہوا ہے؟ پھپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ نشاط نے تشویش سے پوچھا۔

”ٹھیک ہی ہوں گی آج میری اپنی طبیعت کچھ نا ساز ہے۔“ صدف نے مشکل مسکراتے ہوئے کہا۔

”لفیظ دشنام کیا بات ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم نے جب سے ڈاکٹر شرجیل کو دیکھا ہے۔ اس وقت سے کم تم کسی ہو گئی ہو بغیر تو ہے؟“ نشاط نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بشرات سے کہا۔

”غیر ذی تو نہیں ہے؟“ صدف مسکرا دی۔

”ارے کیا سچ واقعی اس سے اس قدر متاثر ہو گئی ہو؟“ نشاط نے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا تو صدف نے برا نہیں مانا۔

”صدف میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں ناں؟“ آنکھوں میں تو پتیلیج رنگین پسینے لہرا رہے ہیں۔ ارے وہ مہتارام بنوں مہتاری خاں کھرچھو کر چلا گیا تھا، اس کا کیا بے گا۔ یہ پتھر میں چونک کے لگ گئی؟“ نشاط شروع ہو رہی تھی۔ بھتیجی بس کرو۔ اب بولے ہی چلی جاؤ گی۔ آؤ اپنی کرسی سنبھالو۔ بے چارے مرلیض انتظار میں ہوں گے؟“

صدف نے جان چھوڑی اپنی چاہی۔

”پہلے مجھے اس مرلیض کی تشخیص تو کرنے دو پھر کسی اور سے بات کروں گی؟“

”نشاط واقعی ایسی کوئی بات نہیں، ویسے ہی آج ذرا طبیعت اداں ہو رہی ہے۔“

بائی دی دے بیا دسی کا دورہ ڈاکٹر شرجیل کو دیکھ کر پڑا ہے۔ نشاط نے کہہ دیا کہ ہو گیا ہے نہیں کبھی تو سنجیدگی سے بات

کیا کر دو؟

”ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سکوپ خاص ہے وہ ابھی تک مل میرا ہے تم نے شاید نوٹ نہیں کیا وہ بھی تمہیں ایک ٹمک دیکھے جا رہا تھا۔ بالکل مہتاری طرح میں تو اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ شاید تم دونوں ابھی یکساں گھوڑے کر کم پھیلے جن میں ایک تھے۔ مہتاری نوعیت سب نے ہی نوٹ کی۔ اس نے تو ڈاکٹر محمد نے تم دونوں کو جوڑا کیا۔ سب ہی تم دونوں کو دیکھ رہے تھے آئندہ عطا لڑ رہنا۔“

”دیے صدف شرجیل میں متاثر کرنے والی تو کوئی بات نہیں۔“ نشاط نے شروع سے کہا۔

”جناب من قیمتی مشورہ دل کا شکریہ! اب آپ اپنا کام شروع کیجئے؟“

یہ کہتے ہوئے صدف اپنا پرس اٹھائے کرے سے باہر نکلی گھر پر بلنڈر ڈالی تو پشیمان سی ہو گئی۔ آج تو یقیناً پھپھو کو منہ نہ دینی میں بھی کتنی بے خوف ہوں۔ ان کو دیکھ کر سب کچھ ہی بھول گئی یہی نہ یاد رہا کہ وہ تو اس روز سے ایسے گھر سے گئے کہ لٹ کر بہاری خبر تک نہ لی کہ کس حال میں ہیں جیسے بھی ہیں کہ مر گئے۔ ایک مہینہ تو پھپھو مہمیر سے انتظار کرتی رہیں مگر ان کو تک ٹمک، ماتے نہیں وہ بھی سدا کی دھمی۔ صابر خاموش طبع دن رات گیسٹ پر نظر میں جاتے ہی پتھر پتھر سے نظر میں آتے۔ صدف ان کے غم کو جانتی تھی۔ ان کے دکھ کو سمجھتی تھی۔

”صدف اللہ تعالیٰ نے پوچھا بھی کہ؟“ شرجیل کہاں گیا ہے نظر نہیں آ رہا۔“

”اپنے دوست کے پاس راولپنڈی گیا ہے آجائے گا۔“ نیرنگ نے یہ کہہ کر بھائی کو ٹال دیا۔ وہ خواہ مخواہ انہیں ان کی زیادتی کا آہٹا دلا تا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ سہمی تھیں کہ آجائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انہیں جگ ہنسائی منظور رہتی۔ وہ نہ تو صدف سے متعلق کچھ کہہ سکتی تھیں اور نہ ہی بھائی کے رویے کا شکوہ کرنا چاہتی تھیں۔

انہیں معلوم تھا کہ صلاح الدین نے ہمیشہ اسے اپنے بھل کی طرز جانا ہے۔ اگر غصے میں کچھ کہہ دیا تو اس کا یہ مطلب ہو کہ انہیں انہیں اس سے پیار نہیں یا وہ خود امان فراموش بن کر ان کی غائب پڑ پائی پھیر دے۔ انہیں معلوم تھا کہ شرجیل کو صدف کے رش کا بہت دکھ ہے اور انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ صدف بھی بہ دھکی ہو رہی ہے مگر ان کے دکھ کا مائیکریم کے پاس کوئی علاج نہ انہوں نے اپنے لب ہی لے لے تھے۔ دس پندرہ روز گزر گئے۔ شرجی کی کوئی اطلاع نہ آئی۔ اس کا زلٹ بھی لگیا مگر اس کا کوئی پتہ نہ اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس روز نیرنگ مہمیر پھوٹ

احساس ہو رہا تھا کہ اس روز انہوں نے غلطی میں آکر شریں کو ناحق اس قدر سخت الفاظ کہے۔ اسے دکھ دیا، اس کی عزت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ یہاں رکا۔ اسے رکا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کم لطف دہ نہیں تھا۔ صلاح الدین سوچ رہے تھے کہ کم لطف تو وہ خود تھے جو اپنے بچے کو ایسے سخت الفاظ کہے۔ ان کے جذبات سے بے خبر وہ کہہ دیا کہ باہر بیٹھ کر سوچتے رہے، حالانکہ انہیں یہ اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ بچپن سے ایک ساتھ رہنے سے آپس میں دلی وابستگی بھی ہو سکتی تھی جو ان کی عمر کا عین تقاضا تھا۔ کسی کو چاہنا لگتا تو نہیں۔ ان کی اپنی شادی بھی کر لینی تھی۔

مذرا بیگم ان کے ماموں کی بیٹی تھیں یہ علیحدہ بات تھی کہ ان کی زندگی نے وفاداری کی سبب بزرگوں نے تو کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ پھر وہ اپنے بچوں کی خوشیوں کے قاتل کیوں بن گئے۔ غدا بیگم کی نشانی کو بول دکھلے کے حوالے کیوں کر دیا۔ وہ سخت مضطرب تھے۔ میرا بیگم بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ غلاؤں میں دیکھا کرتیں۔ صلاح الدین ان کا ہر طرح خیال رکھتے، ویسے بھی وہ انہیں بے حد عزیز تھیں۔ انہیں اپنی بہن سے گھر تھا کہ اس نے انہیں لایم کیوں رکھا۔

”میرا شریں غیر تو نہیں تھا جو تم نے سب کچھ مجھ سے چھپایا۔ شریں جیسے بیٹے کو اپنا دادا بنانا تو میرے لئے باعث فخر تھا میں فرح کے لئے سوچ رہا تھا۔ تم نے تو صدمہ کوں میں کر دیا تھا۔ غلطی میری تھی مجھے صدمہ کے معاملے میں رالعب بیگم پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رالعب بیگم اس قدر بھی جھوٹ بول سکتی ہیں۔ قبر میں میری غدار کی روح بھی بے چین ہو رہی ہوگی۔ اگر مجھے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو آج ہی اسے علیحدہ کر دیتا۔ رالعب نے ہمارے خاندان کی خوشیوں کو ڈس لیا ہے۔ میرا میری بیٹی کا حوصلہ کھینچ کر اس نے سوتیلی ماں کا بھی بھرم رکھ لیا۔ کیا ایسے لوگ سزا کے مستحق ہوتے ہیں؟ رالعب نے فخرتہ صفت صدمہ کو اپنے سوتیلے بن کا نشانہ بنا لیا ہے میں اب اپنے ظلم کا ازالہ کیے کروں اپنے بیٹے کو کہاں تلاش کروں وہ اپنے چچا جھوٹی کسی کے پاس ہیں گیا۔ میرا مجھے کوئی راہ دکھاؤ۔ میں کیا کروں“ صلاح الدین ایسی باتیں کرتے کرتے رو دیتے۔

”صدمہ میری بیٹی جو تم جا ہو گی وہی ہوگا تم شوق سے جتنا چاہو پڑھو۔ زندگی کے آخری لمحے تک شریں کا انتظار کرو۔ اب مہربانی عرضی اور انظار میں کے غلات نہیں کوئی تجور نہ کرے گا تمہارا انتظار میں انتظار بھی شامل ہے اور دعا میں بھی۔ خدا جلد میری دعاؤں کو قبولیت بخشے“

صلاح الدین اپنی بیٹی کو ساتھ لگا کر سبک اٹھتے وقت

”شریں میں تمہیں کہاں تلاش کروں۔ میری جان خود ہی واپس آجاتی۔ درخت تمہاری ماں مر جائے گی۔ میں نے شہر ہر کی جلدانی برداشت کر لی مگر بیٹے تمہاری جلدانی برداشت نہیں کر سکیں گی۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کھاؤ۔ واپس آجاتا۔ میرے ضبط کو نہ آزمادو“ وہ خود سے غولام رہیں۔ رات کی انتہا یوں ہو سکتی رہیں۔ ان کا ضبط رنگ لایا انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ موت و حیات کے کشمکش میں تھیں۔ صدمہ انہیں دیکھ کر رو رو کر لمکان ہوتی جا رہی تھی۔

”پھنچو مجھے صدمہ کر دیں۔ شریں میری وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں میں تصور دار ہوں“

صدمہ کو بید تیز بخار نے اپنی پلٹ میں لے لیا۔ میرا بیگم بھی ہسپتال میں تھیں اور صدمہ بھی..... صلاح الدین حیران تھے تیز بخار کی حالت میں صدمہ کے منہ سے نکلے ہوئے فقروں نے انہیں سوچ میں ڈال دیا تھا۔ شریں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ انہوں نے اعلان کر دئے۔ اخبار میں ماں کی بیماری کا دیباچہ کوئی خبر نہ لے سکی۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ بے جا ہوا جا رہا تھا۔

میرا بیگم بہت پریشان ہو گئی تھیں صدمہ کا بخار بہت تیز تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ سب ذہنی صدمے اور سوچ و دیکھاری شدت سے ہوا ہے۔

صلاح الدین بیٹی اور بہن کو دیکھنے تو مجرم سے بن جاتے۔ پھر انہوں نے رالعب بیگم سے کید کرید کر پوچھا۔ شاید انہیں کچھ خبر ہو..... رالعب بیگم بھی اپنی جگہ خود کو مجرم جان رہی تھیں۔ اپنی زیادتی کا احساس تو انہیں کسی روز ہو گیا تھا جس روز سب کے سامنے صدمہ نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ان کے جھوٹ کا بھرم رکھا تھا۔ واقعی وہ فراق دل تھی۔ رالعب بیگم کو یہ اندازہ نہ تھا کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں گے رالعب بیگم جانتی تھیں کہ اگر وہ سب کچھ سچ صلاح الدین کو بتا دیتی گی تو ان کی عزت و دوکڑی کی بھی ذرہ جاسے گی مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا تو صلاح الدین کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لئے رالعب بیگم نے ظلم و کاست سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ صدمہ اور شریں کی دلی وابستگی کا ذکر بھی دینی زبان سے کر دیا۔

سب کچھ جان کر صلاح الدین نے اپنا سر پیٹ لیا کہ ان کے گھر میں اتنا برا ڈرامہ ہوتا رہا۔ گھر کی سیاست سے قطعاً وہ لاعلم رالعب بیگم کو عظیم جان کر اس کے شکوک و گمان ہوتے رہے۔ انہیں اب

کب کسی کے روکے سے رکھا ہے وہ تو اپنی مدھر چال میں روال رہتا ہے۔ کوئی دوسرے ہانپے۔ اس نے ڈاکڑی کا کورس مکمل کر لیا۔ اس کی ڈانسز جہم ہو گئی۔ چھوٹی غنیمتوں پہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ صدف نے میز ایگم کو اپنے ساتھ جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ میز ایگم تو صرف صدف کے دم سے ہی زندہ تھیں۔ دروازہ جیل کے جانے کے بعد ان کی زندگی میں کبارہ گیا تھا۔ لاہور سے مکمل کرنے گھر میں میز ایگم کی حالت یکدم بہتر ہو گئی تھی۔ میز ایگم اکثر کہتیں: "صدف بیٹی دل چاہتا ہے اپنی زندگی میں تہاری شادی کروں۔ اس التعلق کو دیکھنے کی حسرت تو شاید اپنے ساتھ قبر میں لے ہی جاؤں گی" میز ایگم دکھ سے کہتیں تو صدف تڑپ اٹھتی۔

"بھچھو ایسی دل جلانے والی باتیں نہ کیا کریں۔ ہم دونوں کی قسمت میں انصاف ہے کریں گے خدا آپ کو تو میری ہی عمر دے لے" میز ایگم صدف کی طرف سے فکرمند تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی سے بھی بار بار کہا تھا کہ "اے گئے ہوئے تو چھ سال ہو گئے۔ کوئی خبر نہیں۔ آپ صدف کی فکر کریں۔ تنہا کب تک رہے گی۔ یہ تو نادان ہے سوچنا تو نہیں ہی ہے"

صلاح الدین کو بھی اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ صدف کی تنہائی کا احساس تھا مگر چپ تھے۔ صدف کی مرضی کے بغیر کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا صدف کہیں اور شادی کے لئے رضامند ہوگی۔ میز ایگم اسے اکثر بھگاتیں۔

"صدف نے اس کی خاطر جو کچھ لے لیا ہے۔ وہ بے ایمان بننے کہاں میس کر رہا ہوگا اسے تو کبھی ماں کا بھی خیال نہیں آیا۔ مردوں کی محبت کا کیا اعتبار ان کی محبت تو دودھ کے ابال کی مانند ہوتی ہے۔ جوش سٹنڈر پڑا فتم۔ آنکھ اوجھل بہاڑا اوجھل۔ صورت نظریے دور ہوئی دل سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ مہر و ہماری طرح محبت کو جان کا روگ نہیں بناتے۔ میری ماں تو اب بھائی صاحب کو اجازت دے دو۔ میں بھی تہاری ماں ہوں۔ میرا بھی تم پر کچھ حق ہے اب غیر سے ستائیں اٹھائیں سلی کی ہوگی ہو۔" میز ایگم اسے اکثر پیار سے سمجھاتیں۔

"بھچھو کوئی مژدری۔ تو نہیں کرسب کی شادیاں ہی ہوں۔ میں نے تو بڑی زندگی آپ کے نام لگا دی ہے اپنی پیاری سے بھچھو کے نام" صدف ان کے گلے میں ہانپیں ڈال کر پیار سے کہتی تو میز ایگم کی آنکھوں میں شریں کے خیال سے آنسو آجاتے۔ "خدا یا شریں کو سنا میری عزت کے جلد واپس لا۔ میرے بچوں کا

دامن خوشیوں سے بھر دے" ان کے دل سے دعا نکلتی۔ وہ ہر دم دعائیں مانگتیں۔ ماہ و سال کا بچہ چلتا رہا اور آج شریں اس کے سامنے تھا مگر کیسا اجنبی سا۔ آنکھوں میں اجنبیت و غیرت نابھ تھی۔ وہ سب سوچتے ہوئے گاڑی سے اتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ میز ایگم پریشان سی ہو رہی تھیں۔

"صدف آج کیا ہو گیا اتنی دیر کیوں کر دی"

میرے انتظار میں آپ نے بھی کھانا نہیں کھا یا بھچھو صاف پیاری میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ کھانے کے لئے سب انتظار نہ کیا کریں۔ آپ کو وقت پر کھانا کھا لینا چاہیے۔ میرا کیا ہے ابھی کٹی ہوں۔ کھا لے بغیر بھی رہ سکتی ہوں" صدف نے کہا۔

میز ایگم نے پیار سے دھلا پان سی صدف کو دیکھا وہ شریں سے ہی دُبی تپتی تھی اور اب پریشان زندگی میں ذرا زیادہ ہی مصروفیت ہو گئی تھی۔ اس لئے پہلے سے بھی کمزور ہو گئی تھی۔ میز ایگم کو تو ہر وقت اس کے کھانے کی فکر رہتی۔ ہانڈی سے روزانہ رات کو دودھ کا گلاس اسے اپنے سامنے پلاتیں۔ پاس بچا کر ناشتہ کراتا "مجھے معلوم ہے تم کتنی بٹی کٹی ہو۔ اس دو دن کے بھار سے اتنا سامنے نکل آیا ہے۔ چلو آؤ پہلے سو سو پیو"۔ انہوں نے نوکرائی آواز دی۔ "خالہ کھانا گرم کر کے لے آؤ"

"بھچھو آپ جاتی ہیں آج اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ صدف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر شہاب کی الوداعی پارٹی ہوگی۔" میز ایگم نے کہا "آپ جانتی ہیں ڈاکٹر شہاب کی جگہ کون آیا ہے" صدف نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم تم بناؤ گی تو پتہ چلے گا" "شری جیل بھائی" صدف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میز ایگم نے بے یقینی سے صدف کو دیکھا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس ہے وہ کچھ اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے کان سے پکڑ رہا ہوں اسے اس کے پاس لے دوں گی۔ وہ تمہارا مجرم ہے۔ اس نے تمہیں بہت رلا لیا ہے" میز ایگم نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بھچھو جان آپ اس قدر جلدیاتی نہ ہوں۔ وہ خود آپ۔ پاس آئیں گے وہ بھلا میرے مجرم کیونکر ہو گئے۔ تصور دار تو ہیں جس کی خاطر وہ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ماں کی شفقت سے محروم رہے مجھے تو آپ کا بے پناہ پیار ملا ہے۔ گھر میں رہتی ہوں۔ بن باز انہوں نے کاٹا ہے۔ مہرا نوان کو ملی ہے" صدف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کہاں ہے وہ بے ایمان مجھے اس کے پاس لے چلو" میز

شہرت جذبات سے رو رہی تھیں۔

رہا تھا دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔
مگر ہونٹ بند تھے۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ صدت کم مہم سہی
شرجیل کو دیکھ رہی تھی۔ جو ماضی کے شوق اور باوقافی شرجیل سے کشتہ
مختلف تھا۔

”آپ کو میری سوچوں سے کیا دلچسپی؟ آپ اپنی دنیا میں لگی تھی۔
کیا میری ماضی جان آپ کے ساتھ رہ رہی ہیں؟“ آخر کار شرجیل دل کی
بات زبان پر لے ہی آیا۔

دل کی فی الحال تو میرے پاس ہی ہیں۔ مٹنے نہیں چلیں گے۔ جبراً
تو خیال ہے کہ آپ ہمارے پاس ہی بٹھریں۔ اس بے سرو سامانی میں
بھلا کیسے رہیں گے؟“ صدت نے اطمینان سے کہا۔

”جی نہیں، اس مہربانی کا شکریہ ادا کر کے شرجیل بھی دیکھنا نہیں
چاہتا۔“ شرجیل نے بے حد مہم سے کہا، صدت اسے فتنے میں دیکھ
کر مسکرائی۔

”اس واقعہ کو چھپا کر رکھو گے۔ آپ کو ابھی تک ان سے استفادہ
نہایت ہے؟“ صدت کے ہونٹوں پر نفیخت سی مسکراہٹ تھی۔ اس
نے ایک نظر شرجیل کو دیکھا وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

میرا تو خیال تھا کہ وقت نے سب زخم مندمل کر دیے ہوں گے۔ ادا آپ
نے بھی فراخ دلی سے انہیں معاف کر دیا ہوگا۔ اور اب تک انہیں دل
سے قبول کر چکے ہوں گے؟“ صدت نے بے حد سہجے ہونے لہجے میں کہا۔

”جی نہیں، میں مرتے دم تک اس کو تو معاف کر سکتا ہوں
اور وہی قبول کر سکتا ہوں، اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ اور میں اسے
معاف کر دوں؟“

”مگر اس میں ان کا کیا قصور؟ وہ تو آپ سے۔“ بعد
خواہشمند ہیں۔ کیا آپ میری خاطر سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ مجھے تو
آپ دو دنوں ہی بے حد مزہ ہیں۔ میں دو دنوں میں سے کسی کو بھی کوٹنا
نہیں چاہتی؟“

”صدت یہ تمہارے خیالات ہیں؟“ شرجیل چیخ اٹھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں کچھ نندن دل کے ہوتے ہیں۔
اور کچھ دنیاوی بندھنوں کو نبھاتے نبھاتے بہت ٹھک گئی ہوں؟“
صدت نے ٹھکے ٹھکے سے لہجے میں کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ شرجیل نے تنبیہ کی سے بچھا۔
وہ صدت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ماضی کی چھوٹی چھوٹی سی صدت
سے کس قدر مختلف تھی۔

”میں چاہتی ہوں جیسے پہلے بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ویسے آپ
بھی حبیب بہاں ہیں ہمارے پاس ہی رہیں؟“

”جہاں اسنے روزمرہ گزارا ہے ایک روز اور وہی۔ میں انہیں
آپ کے پاس لاؤں گی۔ پھر پھر وراحت سے کام لیں۔ آپ کا عاقل
کے صدمے وہ اسی شہر اسی ہسپتال میں آگئے ہیں تو اس گھر میں بھی تباہی
گئے انشاء اللہ تعالیٰ؟“ صدت نے بتایا

میرا بیگم سبہ میں گر گئیں۔ انہیں کھائے کا بھی ہوش نہ رہا۔
کیا چیز ہے۔ شام کو صدت تیار ہو کر اس سے ملے گئی۔ ڈاکٹر شہاب تو
جا چکے تھے۔ ان کا گھر شرجیل کو مل گیا تھا۔ نوکرنے دروازہ کھولا۔ سا گھر

خالی رہا تھا۔ بھاڑیں بھاریں کرتا تین چار کرسیاں میز اور چٹاک ایک
کرے میں ہی تھا۔ صدت کو دیکھا تو شرجیل کی پیشانی پر ٹھیکیں پڑ گئیں۔
”آپ یہاں کس نے آئی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ یہاں

ہیں ورنہ چارج لینے سے پہلے ہی چلا جاتا۔“ غراب بھی میں نے کھہہ کرنے
دیا ہے۔ جیسے ہی کوئی دوسرا ڈاکٹر آیا ہیں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ چند
روز گئے ہیں سے گوار لینے میں آپ کا بڑا احسان ہوگا۔“ شرجیل نے

بے حد سرد دلچسپی میں کہا۔
”کیا اپنی اتنی کا نہیں بچیں گے وہ رات دن آپ کے لئے دعاؤں
ماگتی ہیں۔ ان کی شب و روز کی دعاؤں ہی تو آپ کو اس شہر میں لے

آئی ہیں۔ آپ پھر یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں؟“
صدت نے کڑی پر مٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ شرجیل سرج
رہا تھا کہ کیا واقعی مال کی دعاؤں میں اس قدر تاثیر ہوتی ہے۔ وہ پچھلے

سال ہی تو لندن سے واپس آیا تھا۔ ایک سال کراچی میں ملازمت کی۔
اور پھر کوئی انجانی سی کشش اسے پنجاب کی طرف کھینچ رہی تھی۔ لاہور
میں ٹرانسفر ہو سکتی تھی مگر وہ اس بے وفا کے شہر میں جانا نہیں چاہتا

تھا۔ مگر دل تھا کہ بے تاب ہو رہا تھا۔ اپنی مال کے قندلوں سے پرست
جانا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس کو جرات ملا اور جہلم کیلئے
لکھ دیا۔ غریبی قسمت کہ اس کی پرستگ جہلم کے سول ہسپتال میں ہوئی۔
صدت دو تین دن سے بوجہ زکام بیمار میں مبتلا تھی۔ اس نے

سا منانہ ہو کر اس نے چارج لے لیا اور راج اچانک صدت کو
ہسپتال میں دیکھا تو غم بھر سے ہرے ہو گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ
یہاں کام نہیں کرے گا۔ وہ کسی طور پر بھی صدت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ اس نے صدت کے مستقبل کے، اپنے مستقبل کے کیسے کیسے خواب

دیکھے تھے۔ صدت کا ڈاکٹر بننا بھی تو اس کے خوابوں کا ہی ایک حصہ تھا۔
مگر یہ اس نے کب جانا تھا کہ صدت پرانی ہو کر پیشیت ڈاکٹر اس کے
سامنے آئے۔ وہ ہر لمحے کی موت مرے کو تیار نہ تھا۔ اس نے یہاں

سے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ دل مال کے شعلے جانتے کر بے تاب تھا۔
وہ جانا چاہتا تھا کہ میرا بیگم کہاں ہیں۔ دل مال سے ملنے کے لئے زوہد

”تا کہ تم مجھے جلا جلا کر مارو۔ صدف خدارامیر سے میر کو آزاؤ میں
تمہارے ساتھ رہا تو خود م جاؤں گا یا تمہارے شوہر کو جان سے
مار دوں گا؟“ شرجیل نے بے حد غصے میں کہا۔ صدف دلی دلی سحرٹ
سے اس کے غصے سے سرخ ہوئے تھے میرے کو دیکھ رہی تھی۔
”آپ تو بہت ہی صلح کن اور فراخ دل ہیں پھر ان بے چارے
سے ایسی کوئی دشمنی ہے جو ان کے درپے ہیں۔ کیا میری خاطر انہیں مٹا
ہیں کر سکتے؟“ صدف نے بہت ہی رساتن سے کہا۔
”جس شخص مجھے تمام عمر کی تنہائی بخشنی۔ میرے خوابوں کو منفقہ دیا
ہے جان سے نہیں ماروں گا تو اور کیا کر دوں گا؟“

”اگر ایسی بات تھی تو یہ آپ کام کو پہلے کرنا چاہیے تھا اسے نہ
کہاں روپوش رہے بعد میں کہنا۔
”ابنی بدھتی کا نام کرنا اور تنہائی کا زہر مارنے کے لئے علم
کے جام پر جام پونہا تھا۔ میں خود کا شکر ادا کرتا ہوں میں نے میری
بروقت مدد کی۔ میں اعلیٰ برسوں میں کامیاب ہو گیا۔ سکا رشب لایا گیا
اور میں فوراً ہی مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ چلا گیا ورنہ مجھے کہاں کہاں
کی فاک جھانٹنے پڑتی۔ میں تعلیم کے شعبے میں مدہوش سا تھا پھر
مجباً کسی مدہوشی میں اپنا مزہیں پر اکر نہ مغمم گئے۔ ایک سال کراچی میں
رہا مگر کسی سے ملا نہیں۔ اب یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے یقین نہیں کہ میرے
زیادہ دیر یہاں بھی رکوں گا۔ میری تقدیر کی گردش مجھے کہیں بھی چین
سے بیٹھنے نہ دے گی۔“

”چلے پہلے پھوڑے سے تول لیں۔ اور اگر ن سب جانی تو انہیں
اپنے ہی پاس لے آئیں۔“ صدف نے کہا۔
وہ ایک دم ہی کھڑا ہو گیا مگر فوراً ہی بیٹھ گیا۔ ”میں دہل نہیں
جاؤں گا آپ انہیں یہاں لے آئیں۔ خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کریں۔“
شرجیل نے التجا کی۔

”میرے شوہر تو رات گئے گھر آتے ہیں۔ آپ جلدی گھر واپس
آ جائیے گا۔ میں زیادہ دیر سکے پر اصرار نہیں کروں گی۔“ صدف نے
کہا۔

شرجیل ماں سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس لئے زیادہ دیر
بکٹ نہ کر سکا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ ماں سے مل کر اسے یوں
محسوس ہوا جیسے برسوں کی سیاحت کی تنھن پل بھر میں جاتی رہی ہو۔
سال ۱۰ سال کی جدائی کی کسوٹی میں بھی حرف غلط کی طرح مٹ
گئیں۔ وہ دونوں روتے رہے۔ صدف بھی زورنا صے پر بیٹھی بار بار
دوپٹے کے کونے سے اپنی انھیں خشک کرتی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے
کمرے میں چلی گئی۔۔۔۔۔ باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ شرجیل جالے کیلئے
اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اے اب آپ بھی میرے ساتھ ہی چلیں۔“

”بیٹے ابھی بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔ آج تو صدف نے تمہارے لئے
خاص اہتمام کیا ہے۔ صدف تو چاہتی ہے کہ تم بھی ہماری ساتھ
رہو۔ بس اب بہت دن تنہا رہنے کیا ابھی مہاراول نہیں بھرا۔“
میرا بیگم بہار سے بیٹھ کر دیکھ رہی تھیں۔
”اے میں یہاں کے رہ سکتا ہوں۔“ شرجیل کچھ کہتے کہتے رک سالی
”جلو آؤ کھانا کھاؤ۔“ میرا بیگم نے بیٹے سے کہا اور میچر نوکر سے
کہا کہ صدف کو بلا لائے۔

”اے رہنے دیں۔ وہ دونوں خود ہی بعد میں کھائیں گے۔ میں اس
کے شوہر سے ملنا نہیں چاہتا۔“ شرجیل نے ہزاری سے کہا۔
”کس کا شوہر۔ باؤ لے ہوئے ہو گیا۔ اس لڑکی نے تمہاری خاطر
جگ لیا۔ پل پل گن گن کر کھا۔ تمہارے انتظار میں دن رات کیسا
تڑپا اور آفریں ہے پھر بھی مجھے حوصلہ دیتی رہی۔ مجھ سے چھپ چھپ
کر آؤ تنہا ہی رہی۔ میں نے اسے بار بار تمہاری تصویر کے سامنے
آئینہ بٹاتے دیکھا مگر آفریں ہے میری بیٹی پر کہ کبھی حرف نکالت
زبان پر نہ لاتی۔ میں نے تو اسے بار بار کہا کہ اس بے ایمان کا کیا بھروسہ
اس کے لئے کیوں اپنی زندگی برباد کرتی ہو۔“ پنا گھر بسا لو مگر اسے تو
صرف تمہارا انتظار تھا۔ ساری دنیا سے ناتوڑ کر تمہاری آس پر بیٹھی
رہی۔ اگر شرجیل کہتی۔ ”بھتیجیوں نے تو اپنی زندگی آپ کے نام لگا دی
ہے۔“ میں انہی کا نقل نہیں تھی کہ اس کی بات کا مطلب نہ سمجھتی۔

”تم تو سب سے ناراض ہو کر رو پڑیں گے۔“ پٹ کر خیر نمک
زلی کہ ہم تمہارے انتظار میں کتنے سخت مرحلوں سے گزرے ہیں اگر
صدف نہ ہوتی تو میں شاید آج زندہ نہ ہوتی۔۔۔۔۔ میں تو خیر دکھوں کی
عادی ہوں۔ تمام عمر دکھوں میں ہی گزر گئی۔ مگر کس سے کتنی مگرم
نے میری پھول کی بیٹی کو بہت دکھ دیے ہیں بہت تڑپا ہوا ہے۔
اب اگر پھر اسے ستانے لگے وہ تو پرستش کے لائق ہے۔ اس کا
حال تو پوچھا ہوتا۔ تمہارے بعد اس کی کیا حالت رہی یہ تو جاننے
کی کوشش ہی ہوتی۔“

میرا بیگم نے دسے غصے سے بیٹے سے شکوہ کیا اور پھر اپنے
اوپر گزرنے والے ہر لمحے کا حال سنایا۔ بیٹے کو سب کچھ بتایا شرجیل
تو حیرت زدہ سا بیٹھا تھا۔ صدف اس کی محبت میں اس قدر ثابت قدم
رہی۔ وہ تو سخت تھا کہ یہ ایک طرف جذبہ ہے جس نے اسے تباہ کر دیا۔
صدف تو خوشگوار ازاد و آبی زندگی گزار رہی ہو گی اسے حوالہ نصیب
شرجیل کا کبھی خیال نہ آیا ہو گا۔ اس نے اگلے میں عزت برتر مزیں ستیوں
کو دکھ دیے۔ انہیں بے طرح تڑپا یا۔ وہ شرمندہ سا تھا پھر اسے اب
سے چند گھنٹے پہلے کے ڈائینگ یاد آگئے۔ کیسے شوہر کا ذکر کر کے صدف
اسے جلائی رہی تھی۔

”میری بچی کسی ثابت قدم رہی ورنہ اس کی عمر میں جھلا کون دنیا کی دگنیوں سے نمونہ رہا ہے۔“

”اُمی! آپ اس وقت سے صدمہ ہی کی تعریف کر رہی ہیں یہاں میں نے کہیں اور شادی کر لی ہے۔ میں بھی تو آپ دونوں سے بھڑک کر تڑپتا ہی رہا ہوں۔ کسی جگہ وہیں نہیں آیا، ”شرچیل نے ماں سے شکوہ کیا۔“ خدا کا شکر ہے تم دونوں ہی ثابت قدم رہے اور آزمائش میں پورے اترے۔“ بھیرا بچہ نے کہا۔

”اُمی! مگر ہے اس کا کہ میں خدا سے ہلا کر لانا ہوں، ”شرچیل ایک دم ہی کھل اٹھا تھا۔ دیباہی ہشاش بشاش مہیا بھی ماضی میں ہوا کرتا تھا، ماں کے اشارے پر وہ اس کے کمرے کی طرف ہٹا۔ ”صدمہ“ ”شرچیل نے پکارا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ صدمہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھی تھی۔ ”شرچیل کو دیکھا تو کھڑکی ہوئی۔“

”صدمہ“ ”شرچیل نے قریب جا کر پکارا، اس کے لیے میں نے کچھ پکارا تھا۔ صدمہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ لگا ہوں میں زمانے بھر کا پیارا صوفے اسے دیکھ رہا تھا۔ صدمہ کی نظریں بھی اس کے چہرے پر پڑ گئیں۔ ”مذکور کی پٹیاں لگا ہیں ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں جرب کر رہی تھیں۔ کس قدر خوبصورت تھے وہ خاموش تھے۔ دلوں کی دھڑکنیں صاف سانی دے رہی تھیں۔ محبت کے عزمیں ڈوبے ہوئے دونوں ہی مدھوش سے کھڑے تھے۔

”تمہارے شوہر نامدار رکھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ”شرچیل نے شروع لہجے میں کہا تو صدمہ مزید کھڑکی سے اُڑی۔

”صدمہ کی بچی آنا سنگین مذاق اگر میرا لڑتیل ہو جاتا تو؟“ ”شرچیل نے کہا۔

”شوہر کا ذکر شروع کس نے کیا تھا؟“ صدمہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو حقیقت سے بے خبر در بدر کی خاک چھانا پھر تار مار۔“

”تم مجھے حقیقت حل سے باخبر بھی تو کر سکتی تھیں؟“

”مجھے آپ کی رقابت سے لطف آ رہا تھا۔ تو بہ! وہ غصے سے سرخ ہوتا چہرہ جیسے ابھی کسی کو مار دینے کا ارادہ ہو۔۔۔ اللہ آپ کو بہت ہی۔۔۔“ ”صدمہ مسکرا رہی تھی۔

”میرے ہڈیوں کی شدتوں کا مذاق اڑا رہی ہو؟“ ”شرچیل نے بڑھ کر اس کی چوٹی کو ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے زور سے کہینا تو وہ بات بھی مکمل نہ کر سکی۔

”ذرا احتیاط سے۔ یہ وہ اصلی دلی چوٹی نہیں ہے نقل ہے۔“ ”صدمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ بال کھینچنے سے اس کی آنکھوں میں

آنسو آگئے تھے۔

”میں اب تمہارے اصل نقل کو خوب پہچانتا ہوں!“ ”شرچیل نے اس کے شانوں پر جھٹک کر کہا۔

”جیسے جناب پیچھے جان انتظار کر رہی ہیں۔“ ”صدمہ نے غصہ دلی سے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے جھکنے کے لئے کہا۔ ”شرچیل ابھی تک اس کی چوٹی اپنے ہاتھ میں لپیٹے تھا۔

”جلتی جاؤ اور دو۔“ ”دوان ہالوں کو مہن کی دجہ سے میں تمہارے پیچھے چل رہا ہوں ورنہ اصولاً تو ہمیں مجھ سے دو قدم پیچھے چلنا چاہیے۔“

”جی نہیں آجکل برابری کا زمانہ ہے۔“ ”صدمہ بھی شوخ ہو رہی تھی۔

”محترم! میں ذرا پرانے خیالات کا مالک ہوں۔“ ”شرچیل نے برسرِ کہا۔ دونوں بے اختیار تہن دینے لگے۔ ”یوں لگتا۔۔۔“ ”صدمہ جیسے چھ سال کی جلائی کا عرصہ صدمہ غلطی کی طرح مٹ گیا ہو۔ وہ دونوں پہلے کی مانند ایک دوسرے کی بوت میں سرشار پھر چھاڑنے جا رہے تھے۔ چہرے ایک دوسرے کے قریب میں دلی مسرت سے چمک رہے تھے۔

”صدمہ تم واقعی صدمہ ہو اپنے دل میں میرے لئے آنا ڈھیر سا پیارا چھپاتے اتنے سال چپ چاپ میرا انتظار کرتی تھیں اُمی کہتی ہیں تم میری باہن چپ چپ کر دیا کرتی تھیں کیا میں بہت یاد آ کر لیتا تھا؟“ ”شرچیل نے جھک کر سرگوشی کی تو صدمہ کے رخسار جلنے لگے۔ لگاؤں خود بخود بھی جا رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ دونوں پہلے کی طرح شادواں و فرحان کمرے سے باہر آئے تو میرا بچہ سمجھ نہ سکا۔ بکالائیں۔



کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟
بیوفن بکس کا ٹیلا کر دو،
سوہنی سیراٹل
سوہنی سیراٹل تیار ہو کر آ گیا ہے،
ہر وقت خوش و خرم رہیں گے، دستی خریدیں
۳۰۔ انڈوسٹریل ٹرانز۔ کراچی
بایر کے لوگ دی پی سے بھی منگوا سکتے ہیں

ٹھٹھکی انکھیں

سلاجہ حبیب



میرے بیڈروم میں افسردگی سے اتر آئی۔

دیوانے کا خیال ایک بار پھر میرے ذہن پر چھا گیا۔ زبیدہ کی دو ماہ کی طویل غیر حاضری بھی آج اس کی منہ جوگی میں اپنی اہمیت کا احساس اجاگر کر سکتی۔ شاقب کا معصوم نیند میں ڈوبا چہرہ زبیدہ کی شرمیلی مسکراہٹ، میں تو جیسے ان سب سے بڑے بھند زبیدہ پتھر کا بت بنی میرے پہلو میں پڑی رہی! میری نظریں سامنے والے بھائی، ”ہو جاتیار“...

”کیوں کسی سے کشتی کا ارادہ ہے؟“ میں نے آنکھ ماری!

”چلے“ وہ ذرا تیزی سے لولا۔ ہر وقت سیر ہوئی کبھی بقی ہے تھے تو۔“ ڈوبہ ہمارے سامنے ہی آن لگا۔ پھوکی ماں کا چہرہ کلاک پر حجبی نصیں۔ دیوانہ اپنی معصوم التجا سمیت میرے ذہن میں گھس آیا۔ کلاک کی ٹنگ ٹنگ کے ساتھ میں بچہ پیچھے چلا گیا۔ حتیٰ کہ یہی ٹنگ ٹنگ ریل کے پیہویں کی گڑ گڑا ہٹ میں بدل گئی۔

فیصل آباد (تب لائل پور) کے ریلوے اسٹیشن پر کراچی

آنے والی چٹاب انجکسپریس صرف تیس منٹ لیٹ تھی۔ میں اور انیس

احمد خان بے تابی سے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ مٹی کی گرم دھیر

تھی۔ اور سورج عین سوانیزے پر مجھ سے زیادہ برا حال اس کا تھا۔

وہ ہر پانچ منٹ بعد اپنے سفید چہرے کو رومال سے رگڑ کر لہجہ لکھتا

کو کہنے لگتا! اس کی بے تابی قابل دید تھی میرا اپنا بھی حال کچھ ایسا ہی

تھا۔ مگر میں زیادہ تر جذبے دل میں چھپائے رکھنے کا عادی تھا۔...

پھوکی ماں کو ساری چونڈال چوڑکی کے ساتھ آج ہی ہم سب کے

منتر کرکرن حیفظ احمد کی شادی میں شرکت کے لئے آنا تھا۔ میں اور

انیس نوکلہ پور سے کل ہی یہاں پہنچے تھے۔ اس نے ریلوں کی فوج

کو ریس کر کے بتوں! انیس احمد نے ڈرائیور بنا کر یہاں بھیج دیئے تھے

خدا خدا کہ کہ جناب ایک پریس کا کالہ بے ڈھنگا بچہ نمودار ہوا۔ انیس

احمد نے تمہیں کے کار سے رومال کھینچ کر نکالا۔ دونوں بازو ہینڈل صاف

کئے۔ کوک کی خالی بوتل واپس اسٹائل پر رکھی اور میرے کندھے پر ہاتھ

مار کر لولا۔

”کیا میں مجرم ہوں؟“

آج برسوں بعد وطن واپس لوٹنے پر دل میں بے شمار ننگیں احساسات کے ساتھ میں ایر پورٹ سے باہر نکلا تو وہ اچانک سامنے آگیا۔ بالکل غیر متوقع طور پر میری خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ ہال بھرے۔ داروہی بے تحاشہ بڑھی ہوئی سیلا سا کرتہ۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل۔ وہ اب لوگوں کے اک تماشا بن گیا۔ جھجک اٹھا ہو گیا۔ اور وہ ہر ایک سے یہی پوچھتا رہا۔ ”کیا میں مجرم ہوں؟“... اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ سوائے میرے کہ کبھی وہ میری ذات کا ایک جان دو دنا لب تھا۔ اس قدر بدلے ہوئے چلنے کے باوجود میں نے اس کی مسکراتی ہر دانت کھول کو دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا۔ مگر وہ دیوانگی کی اس منزل پر پہنچ کر ہر ایک سے صرف یہی سوال کیوں کر رہا تھا؟ یہ تو صرف ہی جانتا تھا۔ پولیس کے ایک باوردی سپاہی نے هجوم کو مٹایا۔ اسے دیوانہ جان کر دھتکارا۔ مگر وہ سپاہی کا بازو ہتھ مار پوچھے جارہا تھا۔ ”میں مجرم تو نہیں ناں؟“ بتاؤ۔“ پولیس والا یہ بلا اپنے سر دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔

”تم مجرم نہیں ہو۔۔۔۔۔!“ بھرے مجمع کے سامنے اس

کا نام میرے منہ سے نکلنے نکلنے رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ نام

میری زبان سے پھسل جاتا تو لوگوں پر حیرت ٹوٹ پڑتی۔ وہ شہر

کے شہور صنعت کار کا بیٹا تھا۔ لوگ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے

تھے! میں آگے۔ بڑھا۔ دیوانہ اپنی ہی دھن میں مت ایک طرف

کو چل دیا۔ البتہ اس کی ٹھنڈی آنکھیں دور تک مجھے دیکھتی رہیں۔

دل میں دکھ۔ درد اور ذمات کا بے پناہ احساس جاگزیں تھا۔ وطن

کی ہواؤں نے آئے ہی مجھے اداس کر دیا۔ اگرچہ میرے عزیز و اقارب زرا دیر

سے پہنچے انہیں فنانٹ کا نام انکار ہی سے پتہ نہ چل سکا تھا! مگر میرے

دیوانے نے تو سب سے پہلے میرا سوگت کیا تھا۔ میں ہر ایک سے باری

باری ملا۔ زبیدہ نے مجھے دیکھ کر شرمیلی مسکراہٹ بھری پر سچائی اور

آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہہ گئی۔ وہ مجھ سے صرف دو ماہ پہلے

واپس لوٹی تھی۔ مگر دیاغیر میں اس کی غیر موجودگی میری زندگی پر کبھی

اور نہ ہی انداز سے اثر ڈالتی تھی۔ میرے بیٹے شاقب نے اپنی نضحی می باہیں

میرے گلے میں ڈالیں۔ تو میں ساری کوئت اور دکھ بھول گیا! وہ رات

لپک کر ڈپے میں گھس گیا۔ سنہری آنچل فٹ کلاس کے ڈپے میں یہاں سے وہاں ہلکا بکھرے ہوئے تھے۔ غلی کی مدد سے سامان اتر دیا اب ہم سب پلیٹ فائرم پر کھڑے چلوانی دھوپ میں کھڑے تھے۔ مگر وہیل کے سارے ڈپوں میں جانے کس کو تلاش کرتا پھربا تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ چائی بھی کم سخت ساتھ لے گیا تھا۔ درندہ میں اسے مڑا چھانا۔ اس دھوپ ادگری میں رکتہ تلاش کرنا پڑتا تو مڑا آنا بچو کوا بھلا کر میں نے غور سے دیکھا تو ڈپے میں ابھی اس کے ساتھ دو لٹوس اور بھی تھے!

دیل کی چوڑی کھڑکی سے ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ لٹکیاں اٹھ کر سامان اتارنے میں مصروف تھیں!

”اوتے ہریاں ہی ہریاں...“ اب کی بار انیس احمد نے مجھے آنکھ ماری۔! بھلا اس سبق دوپہر میں پریوں کا کیا ذکر؟
 ”یہ اب بیہودگی نہیں کیا“ اب مجھے ذرا دیر کو غصہ آگیا۔ وہ تو دھم شاموں میں اتر آگرتی ہیں۔ مگر وہ میری پرواہ کئے بغیر لٹکیوں کی مدد کرتے



مٹان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنہری آنچلوں کی بہار اور دہنی دی ہنسی کی بھوڑ کو گھٹی کے اندر سمائی۔
 ”زیتون تم روکنی یار لے کہیں چھوڑ آئیں۔“ بھوسھی اماں نے سوال کیا!

”میرا خیال ہے کہ جیوں۔“ ساف لے وجود سے قدرے سمجھی آواز آئی۔ مگر خاندان میں یہی بول اٹھیں۔ ”ارے شام کو چلی جانا۔“ کون سا تم غیر ہمارے لئے! آصف تمہیں شام کو چھوڑ آئے گا۔“ کوہا حرمہ کی سواری کا مسئلہ حل کرنے اور انہیں منزل مقصود پر پہنچانے کا سہل اس ناچیز کے سر ہاں نہ چلائے گا۔“ میں نے تلخ گھونٹ بھرا۔ انیس احمد مراد یاتو نے مجھے۔“ میرا سارا اعفہ اسی پر لگتا تھا! اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

انیس احمد خان میرا جگر یار تھا۔ بے حد بانگاہلا بقول دوستوں کے جس نے خاصی حد تک زنا نہ حسن پایا تھا۔ شیرازی ماں کی ساری مسعید رنگت اور بخانی باپ کے یکھکے میں نقش اس کی ذات میں سمائے تھے۔ یوں تو ہم دونوں میں کوئی خاص رشتہ درمی نہ تھی۔ مگر میرے ابا انیس کی امی جان کے رشتے کے بھائی ضرور لگتے تھے! علاوہ ان کے ذاتی مفہمت کچھ اس حد تک تھی۔ کہ ابا انیس احمد خان کے والد کے کاروبار میں حصے دار تھے۔ جینٹل کے ایک معزز گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ عرصہ دراز سے کاروبار ہی کے سلسلے میں سارا خاندان کراچی رہائش پذیر تھا۔ سوائے ایک تایا جان کے جن کی لائل پوٹریں ایک لیکچرری اور جھنگ میں کچھ زمین موجود تھی۔ لہذا وہ یہیں رہ رہے تھے! ان کے علاوہ سارا خاندان کراچی میں تھا۔ تایا جان کے بیٹے حفیظ کی شادی میں سلسلے میں سب ہی لوگ یہاں آئے تھے۔

بچپن ہی سے انیس احمد کی محاسن بھوسھی کی خواہش تھی کہ انہیں کلاس میں ہی کیڈٹ کالج بھیج دئے گئے۔ اب یہ تو خدا جانتا ہے کہ اس میں ان کی اپنی خواہش ارادے کا کتنا دخل تھا۔ ٹھیک بھٹک بھٹک طریقے سے سارے امتحان پاس کر کے موصوف جسد ہمارے تو اس بوتھ پر سارا ہی خاندان موجود تھا۔ اتنے بار پہناتے گئے۔ کہ راج کرنے جا رہے ہوں۔ مگر انہوں نے اس بات کی کبھی لاج نہ رکھی کہ راج خاندان میں کسی کی اتنے اعلیٰ وارفع پہننے پر پذیرائی نہ کی گئی تھی۔ مگر جناب دوامہ لود جو وہاں سے کچھ گروہ کر کے بھاگے تو دوبار ہی کا نام نہ لیا۔ وجہ صرف یہی بتائی گئی کہ ڈسٹین نہایت سخت تھا کہ ان کی آزاد طبیعت اس کی قطعی باندھی نہ کر سکتی تھی۔

مگر اس وقت سے یہ خاندان بھر میں کپتان بھائی مشہور ہو گئے۔
 (دیکھو میں مقبول۔ اور سید سے سارے کپتان بھائی کئے سید سے

انیس احمد اور والی برکت سے بھاری صندوق اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس صندوق میں چوڑیاں بھی تھیں۔ لہذا باہر سے چھوٹی ماں بار بار احتیاط کی تاکید کلا بھاڑ کر کر رہی تھیں۔ صندوق اتار کر اس نے نیچے رکھا! نظریں اوپر اٹھیں اور دروازے میں کھڑے مانوے وجود پر ٹپک گئیں۔

”پلیٹے...“ وہ بعد احترام گویا ہوا۔
 ”میرا دو پیٹ تو چھوڑیے...“ اس کا آنچل انیس احمد کے پاؤں تلے مسلائی تھا! ”اوہ“ وہ خلاف عادت شرمندہ ہو گیا۔
 ”معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ مانوے لب ذرا سا کھلے۔ اور سفید موتی جیسے دانت نمایاں ہو گئے۔ اب وہ ایک ساتھ باہر نکلے۔ میرا غصہ ہٹتا پر تھا۔ ”خدا کی فوجا رکھیں کہ اب یہاں گری نے مار دیا اور یہ چلا ہے لڑکیاں ڈھونڈنے...“!

دل ہی دل میں اس سے سخت ناراض میں باہر نکل آیا۔ تایا جان کی ٹیکڑی سے لائی گئی دنگین میں سامان رکھ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ یہ میرا اور اس کا وعدہ تھا کہ دایم پر گاڑی میں چلاؤں گا۔ مسادا حسینوں کے بھر میں میں انیس احمد کا دل جب عادت پھسل جائے۔ نظریں بہک جائیں۔ اور وہ حادثہ کر کے کسی قیمتی جانوں کا قائل بن جائے۔

”آؤ زیتون ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“ بھوسھی اماں نے سرسری صلاح کی۔ مگر وہ کہ موسم کی ستائی ہوتی تھی۔ دنگین میں سو رہ گئی۔ یہ کیمری دیتی تھی جس میں عارضی سیٹوں کا انضمام کیا گیا تھا۔ دریاں بن شیشہ رگ تھا۔ جس کی وجہ سے جلوے باہر نہ ہندے۔ مگر میں اس کی گرم دوہر میں چلتی دنگین کی دنگل سکرین پر دھوپ جیسے سنہری آنچلوں کی بات تھی۔
 ”اے مرگیا کیا؟“ اس کی مسلسل بعضی چپ سے تنگ آکر میں نے کہا!

”چل یار اپنا کام کر فوراً رہا ہوں میں۔“...! جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

”ان جلدوں کی موجودگی میں بھی“ میں نے سیٹرنگ سنبھال کر انگوٹھے سے دنگین کی پچھلی طفس اشارہ کیا ایک بار کی جیسے ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

”اچھا تو جناب پٹنی کے نہ آنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اچھا تو یہ بات ہے۔“ میں نے فہم کیا گیا۔

”اس میں دانت لٹکانے والی کون سی بات ہے؟“... وہ جل کر بولا ”مگر نہ ریا۔“ وہ باہر سرٹک کر پھر کھٹے دوڑتے درختوں کو دیکھنے لگا۔ تایا جان کی سی بڑی کوٹھی سب کو خوش آمدید کہنے بڑی

تھے۔ یہ تو صرف میں ہی جانتا ہوں جس نے ان کے ساتھ گھٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ مشکل سے بی اے کا امتحان دے کر ہم دونوں شمالی علاقوں کی سیر کو نکل گئے اور وہاں کے قدرتی حسن میں کچھ اتنے کھوئے کہ واپس کا ہوش ہی نہ رہا کئی ماہ کی آوارہ گردی کے بعد واپس آئے تو دماغی بند ہو چکے تھے۔ بے حد ڈانٹ بڑی، جس کا بس نے خاصا اثر کیا مگر بہتان بھائی مطمئن انداز میں کہنے لگے۔

”ایک سال کا کیا ہے یہ یوں چٹکی بچاتے گزر جائے گا۔ اگلے سال پڑھ لیں گے۔ یار اتنی جلدی کیا ہے! مگر میں ایک سال ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے اصرار پر اسے سبھی لاہور داخلہ لینا پڑا۔ میں ہم دونوں بہت خوش تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں! آزادی کی اتنی زیادہ نعمت پا کر وہ بہت خوش ہوا۔

”اے استاد بے قوتیار۔“ وہ کہتا۔ یہ سیکم سوچ تھی کراچی سے بھاگنے کی!“

”اے غلط مطالب مت اگال رہ۔“ میں ذرا عجب سے جواب دیتا۔

”شکر ہے عقل آگنی ورنہ اب تک وہاں ہی کڑھ رہے ہوتے۔“ وہ ہنستا۔ ”دیکھو! بے ایمان سے! ایک چھوٹا چار چار گریڈ فریڈرکھو کوئی پڑھا ہی نہیں۔ وہاں تو باکفشی تک بھی آگئے نہیں جانے دیئے آزادی کی اس نغمہ میں ہم دونوں مطمئن تھے۔ بیس یونیورسٹی دوپہر ہاسٹل میں کھینچی۔ لاہور کی گرم طویل بستی دوپہر تک باہر نکلنے کی اجازت ڈرامہ کی دیتی تھیں۔ اللہ شام کو ہمارا جوین پورے عروج پر ہوتا رات گئے تک مارا اور ڈسب ہمارے قدیوں کی دھول چاٹ کر خاموش ہو جاتا تو ہم نہ بے سنگ سنگ چپے واپس آجاتے۔

اب ان چھینوسوں میں حیفظ کو بخیر و خوبی رہا ہے کہہ سکتے ہیں اپنا چانس مارنے ہم لوگ سب سے ادھر ہی آگئے تھے۔ جہاں تک چانس کی بات تھی۔ تو وہاں لاہور میں کسی مشرق کی بیٹیاں ایسی تھیں۔ جو ہمیں اپنے سہنوں میں بسائے ہماری دایبھی کی راہ تک رہی تھیں۔ مگر ہم فی الوقت فارغ نہیں تھے! ہم تو اس کو لندن چانس سے فائدہ اٹھانے ادھر ہی چلے آئے تھے!

”گرمیوں کا تھا ہر کراچی شہر سے آتی ہوئی رنگین ہریوں نے میں ”پیٹو“ کہہ کر صرف یہ کہ ہماری توہین کی تھی۔ بلکہ ہمیں لفظ ہی نہ کروائی تھی۔ اور یوں یقیناً ہم جیسے ”سہنوں کے شہزادوں“ کی بقول کہتاں بھائی کے ”سخت بے عزتی خراب ہوئی تھی!“

اس شام جب میں زمینوں بیگم کو چھوڑنے کے حیفظ کی مزا کار میں جینٹ جارا تھا وہ سب کی سب کچھلی سیٹ پر جم گئیں۔ اگلے میرے ساتھ حیفظ کا قدم کے طور پر نہ آیا اور زمینوں بھی تھیں۔

راستے میں بھائیوں نے وہ مذاق کے میں نے کالوں کو ہاتھ لگا لیا۔ واپس آکر میں نے کہتاں بھائی کو صاف بتا دیا کہ ان تلوں میں میں نہیں! مگر کہاں وہ جیسے پوڑنے پر ادھر اٹھائے بیٹھا تھا۔ ”اے رے نبٹ لیں گے؟“ اس نے اسٹائل سے گردن اٹرائی۔

مگر سو یاد کہ جب حیفظ احمد خان رضانہ بیگم کو مبلغ بتیس روپے آٹھ آنے شرعی حق ہر کے تحت مجھ کے لئے سرپرست کر چکے۔ کہ اسلامی نظام کا تقاضا یہی تھا۔ دوسرے ہی دن ویسے کے بعد دوپہر کی گاڑی سے وہ سب چھوٹی اماں کی کاندیس واپس چلی گئیں میں اور جیتاں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہ گئے۔

اب بے دے کے ہمارے ٹارگٹ میں وہ جڑیاں رہ گئی تھیں جن پر کسی نے کسی عقاب کا سایہ تھا۔ سارا ہر گرام چوٹ ہو گیا ستم یہ کہ تیا جان نے چند ہی دن بعد میں جھنگ چلنے کا حکم دے دیا۔ چھتیاں ابھی باقی تھیں۔ اور زمینوں کے سلسلے میں کام کی گرائی کے لئے انہیں دو ہفتہ فراز در کاتھے۔ حیفظ احمد خاں تو رضانہ بی بی کی زلفوں کے ایسے اسیر تھے۔ کہ کسی کام کے قابل ہی نہ رہے تھے یوں بھی ان کے چلے جانے سے نئی دہن کا دل دکھ جانے کا خدشہ تھا۔ تیا جان کی نظر انتخاب ہم پر پڑی۔ ہم کو آوارہ گردی کے شوقین تو تھے ہی پورا تیار ہو گئے! فیصلہ یہ ہوا کہ تیا جان کی چھوٹ والی انہی میں ہمارا نیم لے گا۔ گاڑی بھی ازراہ عنایت عطا کر دی گئی۔ کہ روزیوں پر جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ مسئلہ تھا تو صرف وقت گزارنے کا امور وہ طے کرنا ہم دونوں کے لئے مشکل بات نہ تھی۔

سارے راستے کہتاں بھائی ٹرکیوں کی بے وقت دایبھی پر کچھ پریشان سے بیٹھے تھے۔ اندر میں انہیں کئی تباہی کا لہجہ سبب الاسباب ہے۔ کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔

”میری کچھ میں نہیں آتا“ وہ کہنے لگا اتنے زیادہ کاردار کے ساتھ یہ زمین پلنے کی کیا ضرورت ہے!“

”مناقض نہ کریا۔“ میں نے سمجھایا۔ ”آئے کادل نہیں تھا تو نہ پر مکر جاتا۔“

”اب وہاں پورے دو ماہ ہم کس لگے کیا!“ اس کا سوال تھا۔ ”مڑے ہی مڑے“ میں نے جان بوجھ کر چرایا۔ سارے سے میں گاڑی آئے دیکھ کر میں نے ہنگامی بریک لگائے۔ دندہ گاڑی کے چکنا چور ہوتے ہی مڑے ہی مڑے آجاتے! وہاں پہنچ کر کہتاں بھائی کی ساری جھلاہٹ مجھ میں آگئی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ دوکانیں سرشام نیند ہو جاتیں! گرمیوں کی شام بڑے شہروں کی نسبت یہاں دیرانی کا سماں لے اترتی۔ اگرچہ انہی میں ہماری آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔ مگر رہنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر ہم وعدہ کر چکے تھے اس

اس بانس جیسی سوکھی ڈریکلا سے۔“

”عورت کی تو بین نہیں کیا کرتے بری بات! میں نے کہا: ہر عورت کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ ہر مگر کی۔“ مگر اس نے تیزی سے میری بات کاٹ دی۔!

”تو اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھ اظلاطون کی اولاد۔“ وہ منہ پھیر کر لیٹ گیا! کافی دیر میں اسے متاثرہ نگاہ سے دیکھا۔ آخر تنگ آکر بولا۔
”اچھا یوں کر تو مجھ کو میں دن کا پارٹ ادا کرتا ہوں!“
”لا حول ولا قوۃ یہ بھی کوئی نعم نہ رہی ہے۔“ مجھے غصہ آگیا!
وہ خاموش کچھ سوچنے لگا۔

”یار مان نہ مان مگر ٹوٹ ہے اس رول کے لئے۔“ میں نے پھر اسے بھیا۔ ”ارے اسی بہانے ذرا کی ذرا میرے گھریلو ماحول نصیب ہر جیسا گنا تو کیا رہے۔“... اب کی بار شاید صبح رگ میرے ہاتھ میں آئی تھی۔ گھر دس دس کوسوں دور ہو سٹوں میں رہنے والے تھا تو جوان اکثر گھریلو ماحول کے مشقت سے نمٹتی ہوتے ہیں۔ اور دوراندیش لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ عمر بھر کے لئے وہ اس گھر کے ہو جاتے ہیں۔ وہ چونک کر مڑا۔

”چل ٹھیک ہے پھر پھر تہہ ہے اس کا۔“

”ہاں لائن پورے اسے چھوٹنے میں ہی تو آیا تھا۔ یاد نہیں کیا؟“
”اسے ہاں اس شام جب میں بازار گیا ہوا تھا۔ اور تو حینوں کے نظارے لینے اٹھا ہی آگیا تھا۔“ اس کا موڈ خوش گوشت ہو گیا اس رات ہم کافی دیر تک برادر گرام نہاتے رہے اور پھر لیسی تان کر سوئے ہم نے کوئی پتہ کچ کی محبت تھوڑی کرنی تھی۔ بس صرف وقت گزارنا مطلوب تھا۔ لہذا ابریشی نے کسی ہ ساری مگر یہ بھڑکوم دونوں خواہ فر خوش میں کھو گئے۔

لے مجبور تھے ورنہ میرا اپنا تو دل چاہتا تھا کہ اسی دم واپس لاہور صباگ جاؤں۔ کپتان بھائی کے ساتھ میں بھی پھنس گیا تھا۔ سارا دن زمینوں پر گزرتا اور شام بی وی کے سامنے۔ ہر اشتہار سے لے کر مارے پروگرام طبیعت پر جبر کر کے دیکھنے پڑے!

ایک شام جب کہ ہوا شاید نفا سے روکھ کر کسی اور دن محل گئی تھی۔ بی وی پر ایک بورڈ لگام دیکھتے ہوئے کپتان بھائی نے غصے سے بی وی بند کر دیا۔ اور میری طرف مڑ کر بولا۔

”اب تم کیرا میں تو سارا دن تیری شکل دیکھ دیکھ کر تنگ آگیا ہوں۔“ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ وقتی طور پر کسی مگر لمحات کو پہلے نہانے کے لئے کوئی چکر چلا چاہتا تھا۔ اسی لئے جانے کیوں میرے ذہن میں نازکی کی زبیتوں پر اپنے بھاری بھر کم نام سیمت آوارہ دہی ”راڈے سن“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور اس کی سوال پر آنکھیں میرے پھرے پر گز گئیں۔

”ایک بات بنتی ہے کامریڈ“ میں نے پیشانی پر آئے ہوئے بال ہٹائے۔

”اب بک بھی چکو“ وہ سننے کو بیتاب تھا۔ زبردست آہٹا ہے۔ یوں کرو تم محبت کرنا شروع کر دو۔ وقت اچھا کھٹ جائے گا!“
”اس دھول مٹی اور گرمی سے؟“ وہ طنز پر بولا۔ اسے عقل مند کرنے کے لئے کم از کم ایک خاتون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ بھلا یہاں کہاں ملے گی!“

”یہی تو بات تم سمجھے نہیں میرے سننے۔“ میں نے کہا: ”وہ خاتون نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ اسی شہر میں رہتی ہیں!“

”دیکھو بے! اب مذاق نہیں چلے گا۔ میں پہلے ہی بیزار ہوں!“
”مگر اب یہ چولا اتار میرے سننے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اور عشق کا کامر پڑ کر وارث شاہ کی میرا اسی شہر میں تیرا انتظار کر رہی ہے“
”بہت ہو چکا آصف اب میں برداشت نہیں کروں گا!“
وہ مجھے مارنے کو لپکا۔

”آرام سے جی۔“ میں نے اس کی گوری کلائی تھام لی! مل جائے گا! مگر دوسرے ہاتھ سے میری کمر دھپ لگا کر اس نے مجھے بیڈ پر گرادیا۔

”چل اب بتا کون ہے وہ؟“
”زیتون بیگم“ میں نے نام لے دیا۔ ”یاد ہے وہ اسٹیشن کی گیم دوسرے سالو لیکر آچل کا باؤں سے آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔“ بات سن کر پہلے اس نے آرام سے سر ہلایا۔ کچھ دیر میری اٹھی ہوئی شہادت کی انگلی کو دیکھتا رہا۔ مگر مجھے ایک دم غصے میں آگیا۔
”ارے کچھ دماغ چل گیا ہے تیرا۔“ میں اس سے محبت کر رہا تھا۔

صبح ہمیں تمام تر گرمی کے باوجود دہشت و گش گئی۔ شاید اس لئے کہ آج ہمارے مشن کا آغاز تھا۔ ذبح کے قریب ہم بانکے بنے تباہان کی بخشی ہوئی سرخ گاڑی میں زیتون کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ وقت ملاقات قریب تھا۔ لہذا کپتان بھائی پر پہلی پہلی ملاقات کی سی کیفیت طاری تھی۔ بار بار وہ اس دوپہر کو اسے اچھی طرح نہ دیکھ سکے کا ذکر کر رہے تھے۔ دینے بھی اتنے زیادہ پابند حیروں کی موجودگی میں اس جلی کٹڑی کو کون لفظ کر داتا۔ مگر اب وہ سارے چاند اپنے اپنے آسماؤں کی طرف پرواز کر گئے تھے۔ اور ہمارے نصیب میں جلی کٹڑی ہی باقی رہ گئی تھی۔

”آخا لے جا رہے کپتان بھائی!“ فاصلہ طے کر کے جب ہم محبوب کی گلی پہنچے تو سرخ آہیٹوں والے اس گھر کے اندر ایک ہنگامہ

برہم تھا۔ کوئی معرکہ شاید پورے زور و شور سے سر کیا جا رہا تھا۔ بسین۔
 پڑے دھوئے کا ڈنڈا ڈولی غرض کہ لڑائی کے سانس ہتھیاروں کا
 استعمال ایک ساتھ جاری تھا۔ جو دیواروں کے ساتھ لگ لگ کر دباؤ
 مارنے والی بھاری بھر کم شخصیت کے ہاتھ میں آ رہے تھے مگر کس میکین
 پر یہ سب کچھ آزمایا جا رہا تھا؟ وہ نا تو اں جان ہماری
 کشاہ نگار آہ آنکھوں سے اوجھل تھی۔ میں نے
 اور کپتان بھائی نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہے۔ جد باوی
 ہوئی تھی۔ رات بھر کے دیکھے گئے خواب پل بھر میں تاری میں تحلیل ہونے ہی
 والے تھے۔ کہ اندر سے ایک نو فرنگ کا باہر آیا۔ سیب کھانے ہوئے اس نے
 آستین سے ناک صاف کی اور آستینان سے ہماری سرخ کاڑی دیکھ
 کر آگے بڑھ آیا۔ میں جو حالات کی نزاکت کی حد تک سمجھ گیا تھا آگے بڑھا
 ”سنو میاں“ میں نے اسے پکارا

”میاں؟“... اس نے کچھ حیرت سے کہا۔ ”ارے بھائی صاحب
 ”میاں تو ہمارے ہاں مسجد کے امام صاحب کو کہا جاتا ہے۔ ابھی میرے
 نصیب میں یہ رہنہ کمال۔“ پھر وہ صیب کچھ چپاٹے ہوئے بولا۔ ”دوپہ
 میں نگران حفظ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس کا چوہا اتنا لگا تھا کہ
 میں حیران رہ گیا۔

”چلو عورت ہی غلط ہو گئی۔“ کپتان بھائی ہاتھ جھاڑ کر بولے
 ”اچھا بول کر دانی سے جا کر سیر کیا ہے بھائی آئے ہیں؟“
 میرے دماغ نے صحیح وقت پر ساتھ دیا۔ پیام جون ہی اندر پہنچا۔ گرم
 معرکہ ایک دم ختم ہو گیا۔ اتھل پھل کرنے دوڑ کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر
 خاتون سرسبز سے انداز میں دروازے پر پڑی آئی۔

”ابے کون ہے۔“ کدھر ہے؟“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں جیسے
 ہی ٹھہر کر نظر پڑی۔ وہ آگے چلیں میں ہی تو اں کی عزت کو با صفا ظلت
 گھر تک پہنچانے والا پرانا شناسا تھا۔ کپتان بھائی جو کہ اس آنے والی
 سیر پر کامل کردار تھے۔ خاموش کھڑے سرخ مزاج کے شیشے پر ہاتھ
 پھیر رہے تھے!

”کم آن میں... میں نے پکارا۔“ اُلک کر۔
 ”اُڑ جاؤ۔“ وہ ہماری ہلایں لینے کے بعد لوٹیں۔ آگے پیچھے
 چلتے ہوئے جب ہم ڈیڑھ گھنٹے سے اندر مین میں داخل ہوئے تو وہاں تھوڑی
 دیر پہلے والے میدان کا زرارے کوئی آثار نہ تھے۔ کسی ہزنمہ ہاتھوں نے نہ سے
 بالا ہی بالاسب کچھ سیٹ لیا تھا۔ برآمدے میں پڑے تخت پر جب ہم
 بیٹھے تو دماغ بس عرش معلیٰ سے کچھ ہی ادھر تھا۔

تعارف کے سلسلے میں صرف میرا نام کافی رہا۔ صرف فریق رہتا
 کہ اگر وہ ہمیں اس وقت وہاں دیکھیں تو سوچنے کی مار کھا میں وہ
 دل ہی دل میں میری سنگتی زہیدہ کے ساتھ اور کپتان بھائی سنگتی سنگی

کے ساتھ کر چکی تھیں۔ باقی خالہ جان نے ہمیں خیریت سے پہچان لیا۔
 تانیا جان کے گھر شنادی میں جہاں ہم ان کا بھاری بھر کم دو دیکھ نہ
 پاتے تھے۔ وہ ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ کر شاید پسند بھی کر چکی تھیں
 سوا گھنٹہ بیٹھ کر ہم ناکام و نامراد لوٹ آئے۔ زینون ایک پل
 کے لئے بھی نظر نہ آئی۔ خالہ جان نے دوبارہ آنے کی تاکید کرنے کے علاوہ
 ہمیں غریبا نہ گھر میں اٹھ آنے کی فرمائش کی۔ جس کو پورا کرنا ہمارے بس کا
 روگ نہ تھا۔ دو کدوں کے گھر میں بیٹھے ہی اٹھ لٹو کر پرستش آبادی خامی
 گناں آباد تھی۔ جبکہ خالہ جان کا مسکن برآمدے میں پڑا وہ تخت تھا جو
 ہمارے لئے ڈرائنگ روم کا کام دیتا تھا۔ باہر نکل کر جب ہم مٹی کے موڑ
 تک پہنچے تو وہی نو فرنگ کا جو شناسا بدل گئے کا آخری درخت تھا۔ نظر آیا۔
 برف کا ٹوٹا کھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی چمک
 پیدا ہوئی۔ اس نے مسکرائیں دیکھا اور بولا۔

”دراستے طریقے او۔“... خاصا بے باک لہجہ تھا۔ جس سے
 مجھے اعلاہ ہوا کہ یہ بڑا سو کریم جیسے بزرگوں کے نقش قدم پر چلے گا۔ میں
 نے اسے پاس بلایا۔
 ”نام کیا ہے تمہارا۔“
 ”محمد وارث۔“ جواب ملا۔

”بیٹھ یہ تو بتاؤ گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔“ میں نے
 سوال کیا۔

”راہل ہے جی۔ بے بے ہے۔ بیڑو جو۔“ اس نے انگلیں پر جو
 لگانا شروع کیا۔ ہمارے دل پر زمانہ نام پر دھڑکتے رہے۔ مگر زینون
 کا نام نہ آیا۔

”میں جی بس،“ وہ سارے نام گزرا کر خاموش ہو گیا!
 ”یا غلط حکم تو نہیں پھنس گئے۔“ کپتان بھائی کو گوش ہوا
 مگر میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے محاورت پر جرح جاری رکھی۔
 ”بیٹے تمہاری کوئی زینون آپا بھی ہیں؟“ میں رک رک کر بولا۔
 ”راؤ خوجی ہاں بل ہے جی۔“ وہ یوں کہنے لگا۔ جیسے وہ کوئی خاتو
 چیز تھی! اس نے شک بھری نگاہوں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور
 آنکھ پتک کر بولا۔ ”دیے کیا کام ہے اس سے!“ میں اور انیس احمد سر سے
 پاؤں تک مر گئے۔

”کچھ نہیں۔“ میری آواز لگے میں ایک گئی۔ ”ہم پھر آئیں گے!“
 میں نے گاڑی آگے بڑھادی... ایک دن مشکل تمام مسر کر کے جب ہم
 دوسرے دن وہاں پہنچے۔ تو گھر بھر ہمارے غائبانہ تعارف میں شریک
 ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک نازک سرا ہاتھ سے دلو پر پڑے
 یہ شاید بیوی تھی۔ جو پڑوس سے مواعلائی رابطہ پر اس طرح لٹک رہی تھی
 کہ ساری باتیں ذمہ داری ہونے کے باوجود سمجھ میں آتی تھیں

اچانک میری نظر دروازے پر پڑی۔ خالہ جان کمرے میں دو گلاس پھسلتا انار کا شربت لے آ رہی تھی۔ کپتان بھائی باہر کی طرف پشت کئے حالات سے بے خبر فخر میاں کا سا روپ لئے بیٹھے تھے۔ میری پہنچنے کی خوشی سے اکتا کر بولے:

”ابہ بچا کو یاد رہے۔۔۔“ پھر کیا ہوتا ہے؟ ”ای اشنا میں خالہ جان اندرا گئیں۔ میں نے بات جاری رکھی!... تاکہ وہ کسی قسم کا شک نہ کریں اور ادھر سے زیتون کا اجارہ مگر میرا دل بالکل نہ چاہا کھلنے کو مجھے ذرا بھی تو پسند نہیں! کپتان بھائی بولنے بنے میرا منہ دیکھتے رہے! ”کس اجارہ کی بات ہو رہی ہے؟“ خالہ جان نے پوچھا۔

”دراصل یہ انیس احمد مجھے زبردستی زیتون کا اجارہ کھلانے پر مصریوں۔ حالانکہ مجھے پسند نہیں، مگر انہیں بہت پسند ہے۔۔۔“ خالہ جان نے شربت کا گلاس میری طرف بڑھایا!

”ماں خالہ جان“ سبھی کھڑی ہو کر بولیں۔ ”آج تو آپ لوگ کھانا کھا کر ہی جائیں گے! انیس کی پسند زیتون کا اجارہ بھی موجود ہے۔ پارسل میری ایک سیلی جج پر گئی تھی۔ تو میرے لئے لائی تھی بچے تو منہ ہی نہیں لگائے! ویسے یہ بند بڑا ہے۔۔۔“ انہوں نے تقریر ختم کی۔ ”آج کھلے گا۔“ میں آہستہ سے بولا۔

”اہم غریبوں کا کیا ہے؟“ خالہ جان نے سلسلہ وہیں سے جوڑا ”جہاں سے متعلق ہوا تھا۔“ دال میں دو گلاس پانی زیادہ ڈال دیا ہو گی دعوت شیراز!“

”دال کوئی کس سستی ہے خالہ جان، تو کپتان بھائی تو منہ میں گھنکھٹائی لے بیٹھے تھے۔“ انیس احمد کو توجہ دے رہے تھے۔ ”اچھا۔۔۔“ خالہ جان نے لمبی سی اچھا کی۔ اور غینو کی آواز پر باہر نکل گئیں۔

”دارت شاہ دی ہیر کتھے؟“... میں شوخی سے گنگنے لگا! لیکن اچانک کپتان بھائی کی نظر منی کے اس حصے پر پڑی جسے ہماری نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن اشتہا بڑھانی کھانے کی خوشبوؤں نے آپ ہی ایسا احساس دلایا تھا۔ غالب بہاں پر ہی دعوت شیراز کی تیاری جاری تھی۔ بس اور پیاز کو بوس بسا ایک وجود ادھر سے ادھر آتا جا تا دکھائی دے رہا تھا۔ میرا اور کپتان بھائی کا دل پکارا تھا۔ کہ ہونہ ہو ہی زیتون بیگم ہے۔ میں اس اشنا ہر صفت پا کر پہنچنے کے باوے میں سوج رہا تھا۔ لیکن یہ بے ایمانی تھی۔ ایک تودہ چھوٹی بہت تھی دوسرے اداس بہت دکھائی تھی۔ اس ناول نے شاید اس کا دماغ بے حد خراب کر دیا تھا۔ ”ہونہ ہو۔“ میں نے سوچا۔

زیتون بیگم ہی فٹ ہے۔۔۔“ کھانا لگایا گیا۔ میں اور کپتان بے دلی سے بیٹھے کھ رہے مقصود

”بے لے کپتان بھائی آتے ہیں!“ اس نے بکارا۔ وہ مجھے ہی انیس احمد خان بھی تھی۔ کپتان بھائی اپنا چانس خراب ہوتا دیکھ کر جلدی سے آئے برطیس۔

”سلام کپتان بھائی!“ بیٹو کی آواز ابھری اب پوچش نہ تھی کہ سلام تو اس نے مجھے کپتان بھائی کہہ کر کیا تھا۔ مگر انیس احمد نے آگے بڑھ کر نہ صرف یہ کہ جواب دیا۔ بلکہ دست شفقت بھی سہرہ کھیرا۔ بھلا اس کی کیا تک تھی۔۔۔ میں اپنے عرصے کو پی گیا۔

اس روز ہمیں بہت سی باتوں کا بہتہ چلا۔ شلایہ کہ ایک ہر محض ہماری خاطر بیٹھک میں بدل دیا گیا تھا۔ زیتون آپا خالہ جان کی بیٹی نہیں بلکہ سوتیلی بھائی تھیں۔ حالات نے انہیں سوتیلی خالہ کے دربار پھینک کا صوف رشتے کا ایک چپا کر پی میں تھا۔ جن سے وہ کبھی بھارٹنے جایا کرتی تھیں۔ تب میری کچھ سی بات آنی کہ پرانی رشتے داری کے ناتے وہ بھی سچی اماں کے ساتھ ہی کر پی سے آئی تھی۔ خالہ جان نے اپنی غریب کا بار بار ذکر کر کے ہمیں اپنی بے جا امارت کا احساس دلایا۔ مگر میں نے عزت اور امارت پر الی فلسفہ بیان کیا کہ وہ دھاتی دینے لگیں۔ ہم نے واضح کر دیا تھا کہ ہم پیکر لالچ کے صرف ان کے اخلاق سے مجبور ہو کر رہنے چاہتے ہیں۔ نیز یہ کہ ہم ان کی ہر قسم کی خدمت کرنے کو تیار ہیں! واقعی ہم ان کی خدمت کرنے کا ہیسیہ تو کئے بیٹھے تھے!

وہ جگہ جہاں اس وقت ہم راجہ اندر کے فائنیشن نے بیٹھے تھے چونکہ تازہ تازہ بیڈ روم سے ڈرائنگ روم میں بدلی گئی تھی۔ لہذا ایک چار پاؤں کا چوڑا کھانا تھا۔ جس پر سینہ چادر ڈالی گئی تھی۔ نیچے پرنگ بڑے پھول اور کچھ شمر کڑھے ہوئے تھے۔ سینہ چادر پر سرخ اور سبز رنگ دکھن پھولوں کی صورت میں نمایاں تھا۔ جن کو دیکھ کر کپتان بھائی کا دل پکارا پکارا کہہ رہا تھا۔ کہ ہونہ ہو۔ یہ ضرور زیتون بیگم کے ہاتھوں سے بنائے گئے ہیں۔ خالہ جان ہماری تواضع کرنے باہر چلی گئیں۔ کپتان بھائی کرسی پر لوں اکڑ کر بیٹھے تھے۔ گویا تصویر بننے والے گے ہوں میں چاد پانی پر ذرا آرام سے لیٹ گیا۔

”یار اب اتنا اچھا نیکہ تو خراب نہ کر۔ کچھ شمروں کا ہی احترام کرے! کپتان بھائی بولے! میں نے سہکے نیچے سے اپنے دونوں ہاتھ نکالے۔ اور ذرا اتر گیا ہو کر شمر پھنے لگا۔ پنجابی کا ایک طویل مصرع گڑھا تھا۔ ”جوں جی جیجے دس دس میٹوں دارت شاہ دی ہیر کتھے؟“ بلند آواز سے میں نے شمر پڑھا۔ اور ”آخہ آخہ“ کہہ کر کپتان بھائی نے داد دی! ایک ماہر ہدایت کار کی طرح میں نے انہیں سین کی ٹیپائڈ سمجھائی شمر دے کر دی!

”اب دیکھ۔“ میں نے ہاتھ دروازے کی طرف کیا۔ جس طرف کپتان بھائی کی پشت تھی۔ ادھر سے آہلے بے توار ادھر سے زیتون!۔

نظر نہ آیا۔ خالہ جان نے کھانے پر حاضر ہو کر کہا۔ اور اب
اصرار کر کے وہ اس کا بل ہمارے مندرے سے وصول کر رہی تھیں چانگ
مجھے جیسے کچھ یاد آگیا۔
”ارے خالہ جان“....! میں چلتا۔ ”وہ زیتون کا چار تو رہ
ہی گیا!“

”ہائے خدا! مجھے اس کم محنت کو۔“ انہوں نے کسی کے ان دیکھے
وجود کو ہمارے سامنے کوساٹھ کر ساری نفی چونکہ ہمارے ساتھ کھانے
پر حملہ آور تھی۔ ہلڈ بے ٹم آواز میں زیتون کو کپکارا گیا۔ ذرا دیر میں وہ اچھا
کی پلیٹ پڑے ہمارے سامنے تھی اپستان بھائی نے پوری نفوذ سے اسے
دیکھا۔ زندگی بھر کی ساری خواہشوں اور احساسات نے کئی دن سوچی
مٹلی سی مٹکی ڈال بھی تو جاذب نفوذ تھی! اسنو لا سپاٹ سا چسرو
سیا ہی مال ہو نہت۔ سیدھی ناک ذرا باہر نکلتے ہوئے عارض اور
تنگ سی پیشانی وہ ایک عام سی مٹکی تھی۔

البتہ اس کے سپاٹ چہرے پر لگی تھنڈی سرخ سفند آنکھیں بے حد
پرائرار اور گری تھیں۔ خدا جانے ان آنکھوں میں کیا کھانے کپتان بھائی
کے ساتھ ساتھ میں بھی اسے نظر پھر کر دیکھ سکا۔ میں نے نظریں ہٹائیں
قبض کے داس سے ذرا پیچھے تک جھوٹی سیاہ بالوں کی چوٹی اب میری
نگاہوں کا مرکز تھی۔ سبز رنگ کی پھول دار قبض کے ساتھ کا ہی شلوار
پہنے دوپٹے کے نام پر صرف ایک ٹکڑا وہ سلنے کھڑی تھی۔ میں اور
کپتان بھائی جنہوں نے زندگی کا ایک حصہ رفا کیوں پر میر جگہ کرتے گرا تھا
اس لباس کو کچھ کر بھی اس کے سن کی عزت کا اندازہ نہ کر سکے۔

خالہ جان نے پیٹ لینے کو ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر ان سے پہلے کپتان
بھائی نے ماہر انداز میں پلیٹ کچھ اس طرح پھوکی کہ انگلیوں کی پوروں
نے زیتون کے ہاتھ کو چھو لیا! ایک ٹیکہ لگے کہ اندر اندر چار سمیت پلیٹ
نیچے آن گئی۔ ڈونگے سے سامنے اچھل کر کپتان بھائی کے سوٹ کو ان کے
مزاج کی طرح رنگین کر گیا۔ پلیٹ دو تین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

”ارے ستیا تاس تیرا“ خالہ جان چلائیں! کم محنت سے سیٹ
کی پلیٹ توڑ دی!“

”کوئی بات نہیں۔“ ہم دونوں نے ازراہ انکار کہا۔ کپتان بھائی
نے اپنا لباس چھڑا۔ پھر شام تک ان کا لباس دھل کر کھوٹا رہا۔ وہ
صرف خالہ جان کی ایک دھوئی میں بیٹوس جوئی بنے میرے سامنے بیٹھے رہے
اور میں انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ ”وارث شاہ دی بہر ہے؟“ انگریز شام
واپسی سے پہلے خالہ جان کے نقصان کا اندازہ کرنے ہم دو چور سارے ٹوٹ
اس کر پڑے ہوئے ٹیکے کے نیچے رکھ کر پئے آئے۔

داستان کا آغاز حسب توقع نہایت دلکش انداز میں شروع

ہوا۔ یعنی کہ ”وہ آیا۔ اس نے دیکھا اور فرخ کر لیا“ کی بجائے ”وہ آیا اس نے
دیکھا اور چاہے لگا“ کا سامو تھ محل بن گیا۔ زیتون بچہ کی کسی بھی احساس
سے عاری سر دنگا ہیں سیدھی کپتان بھائی کے ٹارگٹ پڑا تھیں اور
ہمارے شب و روز رنگین کر گئیں۔ زیتون کو دوسری بار ہم نے فرخ کر لیا
پر دیکھا۔ خالہ جان کے ہمراہ وہ بیٹوں کی شادی کے لئے رنگ بڑے پیڑھے لینے آئی
تھی۔ میں اور کپتان ہزار ہا کی دیکھی ہوئی دو کاٹوں کو از سر نو دیکھے لکھ کھڑے
ہوئے تھے۔ کہ یہ حسین اتفاق پیش آیا۔ چھوٹا مبینہ بعد عزت و احترام
پیڑھوں بیکٹ گھر ڈپ کر کے چل پڑے کپتان بھائی انکی سیٹ پر لیٹے بیٹھے
تھے۔ گویا آج بھی بالی صنف ناز کی کاٹا سنا گیا ہو۔ اس دن چھوٹے ہاتھ کے
لس کا احساس اور صبحی گامز میں تھا۔ کچھ سیٹ پر خالہ جان کی بھاری
اکڑ سماعت پر بارگزن کر رہی تھی۔ لیکن کالے رنگ کے چار جوتے سے بنائے
گئے نقاب میں سے دو ٹھنڈی آنکھیں کپتان بھائی کو مرکز تھیں۔

گھر کھنچ کو بیٹوں کی زبانی پتہ چلا کہ اچھن بھائی کی سال مٹکی ہیں۔ خبر
خاصی افسوسناک تھی! خدا جانے ان اچھن بھائی کی سانی کو آج ہی
کیوں مرنا تھا۔ بہر حال ان کا مرنا ہمارے لئے نہیں بلکہ کپتان بھائی کے
لئے خاصا سودمند ثابت ہوا۔ جبکہ قدرت کے کمال افضل دھرم سے حالات
اس حد تک ان کے حق میں نیک ثابت ہوئے کہ گاڑی میں جگہ نہ ہونے
کے باعث انہیں میری واپسی تک خالہ جان کے بال رکن پڑا۔ جبکہ
میں خالہ جان کو لمحہ اہل دعیال اچھن بھائی کی سسرال چھوڑنے جا
رہا تھا۔

خالہ جان نے جلدی جلدی زیتون کو ہدایت جاری کیں ظالم
سماج رخصت ہو رہا تھا۔ صرف ڈر تھا کہ کہیں خالہ جان اگر رنگ
میں بھنگ نہ ڈال دیں۔ مگر مصروف کو ان سے تعارف نہ ہونے کی موت
میں کو ذلت اٹھائی پڑتی۔ بہت ممکن تھا کہ زیتون کے ساتھ گھر میں ان
کی موجودگی کی شک کا باعث بن کر انہیں جوتے بھی چڑھا سکتی تھی۔ مگر
قدرت آج پوری طرح ہر بان تھی۔ خالہ جان راہ میں ہی مل گئے اور ان
بھی ہمارے ساتھ خالہ جان کی روتی ہوئی فرمائش پر اچھن بھائی کی
سسرال جانا پڑا۔ خالہ جان سارے راستے نام نہادین کے گھر کے لئے دلی
کو روٹی دیں۔ مگر میرا ذہن وہاں اچھا ہوا تھا۔ جہاں ہم سب کی —
موجودگی میں لایو جو حیات کا ڈرامہ ہونے والا تھا۔

کپتان بھائی برآمدے میں پڑے پیڑھے پر راٹھیا بن کر بیٹھے
گئے۔ زیتون بگم اندر چلی گئیں۔ شام کے پھیلنے ساتھ میں سورج کی پیش
رخصت ہوئی۔ برآمدے کا ننھا سا بلبل اٹھا۔ مگر زیتون بگم باہر
رنکلی۔ کپتان بھائی کی نظراں چانگ تخت کے ایک کونے پر دھری کالی جلد
والی ڈائری پر پڑی۔ وہ اٹھا کر پڑھنے لگے۔۔۔ ان کی نظریں خاصی بے

معنی سی تحریر تھی۔
 میں نے اپنی زندگی کا ہر خوبصورت لمحہ تمہاری یادیں اس لئے صرف نہیں کیا تھا کہ تم میری روح کو اذیت دو گے میں نے ہر آن تمہاری یادیں ہی کی دعا اس لئے نہیں مانگی تھی کہ تم اگر میرے خیالوں کا بت بانش پاش کر دو گے۔ میرا وہ پینا تو کھر گیا۔ ٹوٹ گیا۔ اور ٹوٹے سینے کی گرجاں جیسے میری روح میں ہوسٹ ہیں۔ بھگتے لہجوں کی یہ آنکھ چوٹی تھیں کس دور رہے پرے آئی ہے؟ پیچھے ہٹ کر دیکھتی ہوں تو ماضی کی پگڈنڈی پر بکھری بے شمار یادیں مجھے احساس دلاتی ہیں کہ میں نے اپنی زبان سے تمہاری محبت کا اعتراف کر کے کتنی بڑی غلطی کی تھی میں نے اپنی آرزوں۔ احساسات۔ جذبات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے نزدیکوں کی روایات کے لئے قربانی دی ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو جلا ڈالا۔ اپنا آپ ختم کر لیا۔ میں تمہارے روپ میں ڈھل گئی۔ جو تم نے مجھ کو دیا ہی نہیں کیا میری قربانیوں کا کوئی صلہ ہے؟ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے نہ دیکھے تمہیں چاہا۔ مگر تمہارا یہ گندہ ذہن۔۔۔ کاٹ میں جان سکتی کہ تم اپنے چھوٹے انسان ثابت ہو گے۔۔۔“

پکستان بھائی نے پڑھنے میں محسوس ہو گئے۔ تحریر ختم ہو گئی تو وہ چرکے وہ دشمن جہاں سامنے ہی تو صرف ایک ہاتھ کے خالصے پر کھڑی تھی۔ انکی توبہ کہ چاہیں تو ہاتھ بڑھا کر چھو لیں۔ پکستان بھائی کمال اداکاری سے اس کے چہرے کی فطرت دیکھتے رہے۔ جیسے کسی اور ہی عالم کی سیر کر رہے ہیں۔
 ”میری ڈائری۔۔۔“ وہ ہاتھ بڑھا کر لے لی۔
 ”ادہ تو یہ آپ کی ڈائری ہے۔“ ان کا سکوت توڑتا ہوا وجود خاصی بے ہنگم آواز میں بولا۔ ”کیا لکھتی ہیں آپ؟“

”افسانے“
 سیدھی سپاٹ آواز میں جواب ملا۔
 ”اچھا افسانہ تھا یہ۔۔۔ میں کچھ سفر نامہ ہے!“
 ”آپ کی عقل کا تصور ہے۔۔۔“

”خاصا مال کا لہجہ ہوں گی جی؟“ بغیر سوچے کچھ وہ دبالتے چلے گئے۔
 ”کس دنیا میں رہتے ہیں آپ؟“ وہ یعنی ”ہمارے ہاں تو ادیب سے زیادہ ردی فروش امیر ہے!“

”آپ افسانے کیوں لکھتی ہیں مس زیتون۔“ دنیا بھر کا مہذب انداز لہجے میں امڈ آیا۔
 ”میرے احساس کی تسکین کا ذریعہ یہ ہے۔“ وہ کہنے لگی اور پکستان بھائی ان کی ٹھنڈی خود اعتماد لگاؤ کو دیکھتے رہے۔
 ”شعور شاعری نہیں کرتیں۔“ وہ پکستان بھائی نے سنبھل کر

سوال جھاڑا۔
 ”بیکار لوگوں کا مشغلہ ہے“ یہ زیتون بیگم کی ذاتی رائے تھی۔

اس کی کسی بھی رائے سے وہ صرف وقتی طور پر اختلاف چاہتے تھے تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔

”اور افسانہ نگاروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس پر سرد لگا ہوا جھک گئیں۔

”اپنے ہی احساسات کے مارے ہوتے لوگ ہوتے ہیں مگر پڑھنے والوں کو مکمل احساس تحفظ فراہم کرتے ہیں“ اس کا سا فلسفہ پکستان بھائی کے سر سے گزر گیا۔ مگر وہ سنبھل کر باقاعدہ بحث کرتے رہے۔ بات آگے بڑھی حجاب کا پردہ مٹنے مٹنے بالکل مٹ گیا اور پھر جب میں خالہ جان کی نوع فطریہ کوئے اچھن بھائی کی کسرال سے واپس لوٹا تو ٹھوٹے کے سارے تیر ٹھیک ٹھیک نشانے برگ چلے تھے۔ اور پھر وقت بڑی ہی گزرتے لگے۔ گھر سے باہر ملتا تھا۔۔۔ ہونے لگیں۔ بہانے بنانے میں ہم دونوں ہی ماہر تھے۔ زیتون بیگم عشق میں رہنے بھری زنجیریں توڑ کر باہر آئی تھیں۔ باقاعدگی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وارث شاہ کی ہیر نڈر ہو گئی تھی۔ بنیادی طور پر وہ قدرے محرومی کا شکار زمانے کی مستانی ہوتی ہوئی شکل و صورت کی کا احساس بھی ذہن پر حلائی تھا۔ جیسے وقتوں میں حاصل کی گئی تعلیم اب انسانے لکھنے کے کام آ رہی تھی۔ کہ ان کے تمام انسانوں کا ہیرو پکستان بھائی کے روپ میں ان کے سامنے آن کھڑا ہو۔ زیتون بیگم خوابوں کو حقیقت میں بدلتے دیکھ کر سب کچھ بھول گئیں۔

ان ہی دنوں تیرا کیا خط آیا۔ انیس احمد کی ماں میٹے کی طویل جدائی سے گھر آئی تھیں۔ انہوں نے عین اس وقت واپس آنے کی فوری تاکید کی تھی جبکہ عشق کا سورج سواڑے کی پیش پر تھا۔
 ”کچھ ہوش ہے مجھے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ادھر کراچی میں

ہلک بہت پریشان ہے۔ تیرے بغیر۔۔۔“
 ”یار میں نہیں جاسکتا۔ ابھی تو کلا ٹکس پر بھی نہیں بیٹھے ایسا کر تو جا اور بات سنبھال لے“ یہ ان کا بلا معاومہ مشورہ تھا۔ مگر مجھے سوخت ناگوار گزرا۔

”تو سیریس تو نہیں ہو گیا؟“ مجھے فکر ہونے لگی۔ ”یار وارادہ دنیا کیس“
 ”مجھے اپنا ریل باجے تو فکر نہ کر۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس لاکٹ کا چین انکھی میں بھی لے گئے جو وہ اس شام زیتون کی پیش کرنے والے تھے۔ پھر ہم دونوں یہ اندازہ لگائے گئے کہ مرض کیا ہمارے ان کروڑوں کا علم اگر خاندان بھر کے بزرگوں کو ہو گیا تو ان کا کیا رد عمل ہوگا؟ ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں!“ وہ پھٹ سے بولا۔
 ”تو یس نہ کرے۔۔۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”ارے کس سے باپ کی اولاد ہے تو؟“
 ”خوش فہمی ہے آپ کو۔ میرے بھولے بادشاہ۔“ پکستان بھائی میرے سر پر چہیت لگا کر بولے احوال کا جوانی میں وہ سب ہی کچھ کرتے رہے

ہیں، تب مجھے احساس ہوا کہ وہ سچ محب عشق میں گڑے گڑے پھنس گیا تھا۔ اس وقت جانے کیوں سائلو سلونی شام جیسی ریتوں پر بے حد ترس آیا ... ایونروستی ان دونوں ہنگاموں کے بعد دوبارہ بند ہو چکی تھی۔ دقت اب ہماری گرفت میں تھا۔ بعد اصرار خالد جان کو مطمئن کرنے کے لئے مجھے کراچی آنا پڑا۔ ورنہ ڈرتا تھا کہ وہ انیس احمد خان سے ملنے خود ہی نہ ملے گی۔ اس صورت میں بانی خطرے کی لائن سے بھی اوپر جا سکتا تھا۔ یوں بھی ان دونوں عشق سیلاب زردوں پر تھا۔ بحالت غم جو میں میں انہیں مطمئن کرنے چلا آیا کہ سچہ بخت ہے لیکن جب میں واپس پہنچا تو کھلا منکس عمل میں لا کر وہ ڈلے کا ڈراپ سین بری طرح سے تباہ و برباد کر چکے تھے۔

وہ ڈھلتی تیش والی ایک عام سی شام تھی جو کسی رنگینی کے بغیر شام غریباں کی کسی اداسی کے ساتھ خالد جان کے آئین میں دھیرے سے آن کر کی تھی ... اسفید کرتے شلواریں ملبوس پاؤں میں ہیر کے دیس کا چرچر کرتا سنہری تاروں سے مزین تیلے والا حجاب سے کپتان بھائی اندر داخل ہوئے۔ گھر میں ایسی خاموشی تھی تو ایسی طوفان کی آمد ہو۔ وہ جینٹل ٹھہر کر امدے میں آن رکے اندر والے دروازے سے خاموش تھے۔ البتہ اسٹورے ریتوں بیگ نکلیں۔ اور کپتان بھائی کو دیکھ کر ایک ساتھ کئی دھدک رنگ شام کے انہرے میں ان کے چہرے پر آئے۔ اپنی ٹھنڈی ریح نگاہیں کپتان بھائی کے چہرے پر صرف ایک بار جھرا کر اس نے قدم اٹھایا۔ مگر کپتان بھائی کی آنکھوں میں یکساں گرمی اور لبروں کی دلکش مسکراہٹ کی تاب نہ لاکر اس نے نگاہیں جھٹکا لیں۔ دوبارہ جب اس نے کپتان بھائی کے عیالمراد پر نگاہیں اٹھائیں۔ تو وہ سچی محبت کے نور سے جگمگامی تھیں، ہیر کی محبت کے رنگ اور سوسنی کی جاہت کا نور سامنے جا کر بیٹھا۔ کپتان بھائی ایک لمبے لمبے کاپ بنے پورا گھر خاموش تھا۔ خالد جان بعد اہل دعیال اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے سرگودھا گئی تھیں اور رات بارہ بجے سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ ”میرا خیال ہے اندر کل بیٹھیں ...“ ریتوں کی آواز آئی بے شاہد پڑوس سے بھی نکلنے لگا۔

”مراندہ تو گرمی ہے۔“ کپتان بھائی نے کہا۔ پھر خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ کی انجانی کر زں سے کانپ رہا تھا۔ ریتوں کے پس ان سے پیچھے داخل ہوئی۔ اس کا آجکل کھلے دروازے میں لہرایا سر دنگ ہوں میں اعتماد و یقین کی پرچھائیاں اور شناسائی کا تاثر ابھرا۔ وہ لکھتی برسرے کچھ اٹھنے لگی۔ وہ شاید کوئی تصویر تھی۔ جس میں اس کے بچپن کا رنگ نمایاں تھا۔۔۔ ابا گھر میں تصویر

لے وہ طری۔ اور اسی دقت بجلی چلی گئی۔۔۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ سیدھی کپتان بھائی سے جا کر ٹکرائی۔ تصویر گر گئی، شیشہ چٹنا چور ہو گیا، باہر شام بڑھ کر لڑات کے اندھیرے میں بدل گئی۔ اندر کمرے میں نکل کر تاریکی میں دم بج کر دو دروازے لگا۔ اور اسی تاریکی میں ریتوں کا چور اپنی سر دنگ ہوں سمیت کپتان بھائی کی باہوں میں آں گرا۔ اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا۔ شام نے رات کو گھٹے لگایا۔۔۔ اور کچھ لمحوں ہی لمحوں میں بہت کچھ ہو گیا۔ تاریکی کے صرف ایک بل میں وہ دونوں دم بن کر پہنچے

گیارہ دن کے بعد جب میں واپس پہنچا تو وہ اسٹیشن پر عجب چلے کے ساتھ موجود تھے۔ بالکل خاموش شزاری آنکھوں کی جوت بھٹی چٹی تھی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا۔ جیسے ضمیر کے پوکوں سے تنگ آئے ہوئے جسم کی لگا ہوں میں ہوتی ہے۔ ہونٹوں پر پھڑکی جی ہوتی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھا۔۔۔

”ابا غضب ہو گیا۔۔۔“ اگاڑی میں بیٹھے ہی وہ بغیر میسرے پوچھے شروع ہو گیا۔

”کڑی کوڑوں سے عزتی کر لئی اناں۔۔۔“ ابا میرے ذہن میں صرف یہی بات آسکی۔ کہ شاید کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش اپنی بے عزتی کا احساس کرنے کے ذریعہ خاموش اور زیر پران تھا۔ مگر ساری داستان کی کچھ پتہ چلا کہ یہاں تو وہ نہ صرف میری اپنی ریتوں کی بلکہ سارے خاندان کی بے عزتی کر چکا تھا۔ معصوم سر دنگ ہوں والی ریتوں کی آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوتی۔ ”میرا قصور کیا تھا؟“ اس کی فریاد جیسے گونج اٹھی میں

بھی تو اس جرم میں برابر کا شکیں تھا۔ ”دقت ہے ہزار بار ابا میں اقد خان تم ہر۔۔۔ میں اس پر برس پڑا۔ تم تو کبھی ایسے نہ تھے۔“ ماضی میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی سے تمہارا واسطہ رہا ہے مگر میں۔۔۔۔۔۔! مارے غصے کے میرے ہواں جواب دے گئے ”مجھے خود نہیں معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ دُبتے لہجے میں بولا ”اگرچہ میں جذباتی ہر گز نہیں مگر جانے کیوں اسے دیکھ کر میری عقل جواب دے گئی۔“ کپتان بھائی کی آواز دردناک حد تک گھو گھو گھٹی جیروں چاہا اسے جلیبی کاڑی سے نیچے پھینک دوں میں تو کراچی سے اسے آل علیہ کی رپورٹ دینے آ رہا تھا۔ اور وہ میرے استقبال کے لئے ایک نئی مصیبت لئے بیٹھا تھا۔ میری عقل کی بات تو وہ تو اس کے پاس کبھی بھی ہی نہیں۔ کپتان بھائی جلد از جلد واپسی کی فکر میں تھے۔ دوسرے ہی دن ہم پورا بستر باندھ کر دوایں سے بھاگ آئے تاہا جان کو پڑھائی کے حرج کا بہانہ منسک کرنے کے لئے کافی تھا۔ حالانکہ ان کے خیال میں ہم بھی پرسکون جگہ آرام سے اپنی پڑھائی کر سکتے تھے۔ مگر ہم کچھ کرنے میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ سامنے آئے پھر حالات نے حد نازک رخ اختیار کر سکتے تھے واپس کراچی آ کر وہ بے حد بدلی گیا۔ لہذا میں یونیورسٹی ابھی

نمک بندھتی، کراچی میں قیام ناگزیر تھا۔ وہ بہر شام سمندر کے کنارے نکل جاتا۔ درتیک اپنی نظر بسجائے بحری جہازوں کی روشنی میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ رات گئے میں بڑی مشکل سے اسے واپس گھلاتا۔ شوخی شرات سب ختم ہو چکی تھی کراچی کے موسم میں کبھی کبھار بے مقصد درسنے والے بادل جب گھر کر آتے تو وہ لمبی ہوک کے ساتھ تان لگاتا۔

”جرح جو گی پچھے دس دسے مینوں وارث شاہ دی ہیر کتھے؟“
اپنی وحشت زدہ آنکھیں میرے دودھیر لکائے وہ گویا مجھ سے سوال کرتا۔ میں اسے دیکھتا تو اس وقت مجھے سچ کا دیو ادھو کی لٹکا کھی وہ دونوں ہاتھوں سے میرے کانہ پھوڑ کر سوال کر لے کے انداز میں کہنا میں نے تو یہ سب کچھ بھی نہیں چاہا تھا۔ آصف... پھر یہ سب کچھ اس طرح ہو گیا؟“ میرے پاس اس کے کبھی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے صرف ایک بار زیتون کو دیکھنے کی خواہش کی۔ فحش اس کی دماغی حالت ان دونوں شکوک سے گئی تھی۔ میں اسے ساتھ لے لہو ر آنے کے بہانے میری بستی کے قرب دجوار میں بسنے والی ٹی آر ڈول والی بستی کے شہر لے آیا۔ سیدھے تو خال جان کے ہاں جانے کی ہمت نہ پڑا۔ کونسا وقت رخصت ہم انہیں الوداع کہہ کر آئے تھے۔ ہم بھی ان ہی بادشاہوں میں سے تھے جنہوں نے تاج محل بنا کر غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔

دودن ہم ادھر ادھر تاک جھانک کرتے رہے۔ شاید وہ کہیں کسی وقت نظر آجائے۔ تیسرے دن جب کہ ہم شام کے اندھیرے میں اس پھوڑ کا لاس ہوٹل کی کھٹمل زدہ چارباہیوں سے تنگ اگر کھلگے کی سوچ رہے تھے۔ وہ ہیں اچانک نظر آ گئی۔ میں بس کاٹک بیٹے تھا ہی تھا۔ کہ وہ اڈے کی بلی بھی سے باہر نکلی۔ کالے برقعے میں اکبر ادھو چہرے کی لے تاج شہیلہ کا لے نقاب سے نمایاں تھی۔ میں نے کپتان بھائی کو کہنی مار کر خبردار کرنا چاہا۔ مگر وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

”زے...“ ان کے لبوں سے آواز نکلی... مگر وہ ادھر ادھر دیکھتی احتیاط سے سامنے دروازے سے اندر داخل ہو گئی میری نگاہیں ادھر اٹھیں۔ دروازے پر بیوی پیٹھک دو داخلے کا نام بمعکسی ڈاکٹر کے جملہ کو الف کے آؤں اٹھا۔ بات اب ہمارے اختیار سے نکل چکی تھی... ہم دونوں نے گھر اکریک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نہ سمجھے کی کوشش میں کبھی سب کچھ سمجھ کر انھیں جھکا لیں۔ احساس شرمندگی سے میں زمین میں گر گیا۔ خالہ جان کا اطلاق زیتون کی پاکیزہ مسکراہٹ اس پر آنے والے حالات کی سختی۔ سب کچھ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہم وہیں کھڑے رہے۔ اٹھوڑی دیر بعد وہ

باہر نکلی۔ بھل میں دالغافو جھپانے کی اگرچہ کوشش کی گئی تھی مگر لغائے کے پیچھے ہونے کو نے کسی دوائی کی شیشی شام کی ہوا سے پھڑپھڑاتے برقعے سے سامنے نظر اڑی تھی۔

”زیتون“ اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالنا۔ کپتان بھائی نے آواز لگا دی۔ وہ لبوں رکی۔ جیسے یقین کر لینا چاہتی ہو کہ وہ آواز نہ حقیقت تھی۔ اس کی ٹھنڈی آنکھیں ہمارے جسم میں گر گئیں۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اور سڑک کی طرف چل پڑی۔ میں مناسب الفاظ کی تلاش میں کہیں دور نکل گیا۔ سڑک کے کنارے وہ ٹھہر گئی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ہم دونوں بھی آن لڑے۔

”زیتون“ کپتان بھائی نے دوبارہ پکارا۔ اس کا وجود بدلتا رنگ لے بیٹھ سچ کر اپنے گناہ پر ماتم کر رہا تھا۔ اس ظلم کی یادداشت میں آسمان بھی اگر ہم پر گر پڑا تو کم تھا۔

دور سے بس کی میڈلائٹس قریب آتی گئیں جیسا کہ زور دہشتی میں زیتون نے نقاب اٹھ۔ صرف ایک بار ٹھنڈی سچ آنکھوں سے کپتان بھائی کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ جان سکتے۔ بس قریب آ گئی۔ زیتون نے لغت سے کپتان بھائی کی طرف دیکھ کر کہو کا۔ وہ مڑی۔ اور اس نے بس کے آگے جھلاٹنگ لگا دی!

پل بھر میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ هجوم بس سے ازار مشکوک لگا ہی ہم پر پڑیں۔ ہم نے اس سے قطعی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہوئے اسے بس کے انتظار میں کھڑی مسافر خالون بتایا۔ لوگ مطمئن ہو گئے۔ واقعی اس کی ناآشنائی ہم سے بے حد گہری تھی۔

اس وقت وہ بالکل ہمارے سامنے وارث شاہ کی ہیر کی طرح بے بس خاموش بڑی تھی۔ ٹھنڈی سرد رنگا ہی کھلی تھیں اور بے زور رنگا ہی آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ سڑک پر بہتا مڑج خون سیدھا ہماری جانب آ کر ہمارے خاموش ظلم شمی داستان سنا رہا تھا۔ بزدلوں کی طرح اسے وہاں چھوڑ آئے۔ مگر وہ ہشام ہمارے ذہن پر نقش ہو گئی۔ بس کے مسافر اسے اپنے ہی شہر کی بیٹی سمجھ کر منزل پر پہنچانے کے لئے صلاح منظورہ کرنے لگے۔ اس وقت مجھے اُن آن بڑھ۔ اجڈ دیہاتیوں کے چہرے پر وہ عظمت نظر آئی جو بڑے لوگوں اور بڑے شہروں میں بسنے والے اور بچے ان لوگوں کی طرح لکھی زندگی سے نکل کر صنعتی شہروں میں چلنے والے کا خالوں کے دھوئیں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

وہاں سے اسے واپس لانا میرے لئے ایک مرحلہ بن گیا۔ ساری رات وہ ”ج“ جو گی پچھے دس دسے مینوں وارث شاہ

دی ہیر کھتے؟“ الاپتارہا۔

ہوٹل کے لوگ چونک چونک کر اسے دیکھتے رہے۔ برسوں اس کا علاج ہوا۔ مگر ہوش و خرد سے سیگانہ وہ ہر ایک سے بھی بوجھتا رہا۔ وارث شاہ دی ہیر کھتے، لیکن جب وہ خرد کی منزل سے رخصت ہوا۔ تو ہر ایک سے بھی سوال کرتا رہا۔ ”میں مجرم تو نہیں؟“ ایک رات وہ ہسپتال کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر بے حاشہ رویا سارا اسٹاف پریشان ہو گیا۔ شہر کے مشہور صنعت کار کا بیٹا یوں بے بسی کے عالم میں ہٹھا کر مال باپ دولت سے اس کے لئے اب ہوش و خرد خریدنے سے قاصر تھے صبح ہوئی وہ ہسپتال سے غائب تھا۔ پھر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

برسوں بعد میں نیر آبا کے ساتھ چھنگ گیا تو مانی ہیر کے غرار پر وہ متانہ دوسرے ملکوں کے ساتھ دیوانہ وار نچ رہا تھا اس کے بول برسوں سے جلا ایک ہی لول رہتا تھا! ”جو کچھ دس دس بیٹوں وارث شاہ دی ہیر کھتے؟“ میں مثلاً شاہاں سے وابستہ تھا۔ اب وہ جس منزل پر تھا۔ وہاں سے لے داپس لانا میرے بس کی بات نہ تھی دن گزرتے چلتے میری شادی عیدہ سے ہو گئی۔ عزیز ترین دوست کی جدائی پر میرا دل خون کے آسور دیا میں اس کے بعد خاندان کی کسی زندگی نہیں ملا اس کی اپنی اور دل کو دیکھ کر مجھے نادانستی میں کئے گئے اپنے جرم کا احساس ہونے لگا ایک برس وطن کی فضاؤں میں سو گوار گزر گیا۔ میں نے ایک سفر میں نوکری کر لی اور پھر اپنے سر کی دساعت سے باہر چلا گیا۔ دیار غریب میں اس کا اگرچہ کوئی نقش نہ تھا لیکن ہر منزل پر قدم پر وہ مجھے یاد آتا رہا۔ زبیدہ نے ابھی بے پناہ چاہت سے میری توجہ نہ تھی نیسے نائب میاں جب اس دنیا کی ہوا کا مزہ لوٹنے اور حوائی میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنے آن وار ہونے تو میں سمجھ گیا۔ زندگی اپنے تمام تر رنگ کے سامنے آن موجود ہوئی۔

یوں ایک ایک کر کے اٹھ برس گزر گئے۔ وطن واپس کا ارادہ کرتا تو سرد لگا ہوا راستے کا پتھر نہ کر سانسے آ جا میں۔ ضمیر کی سرفراز سے بچنے کا فرار بھی تھا کہیں آپسوں سے اپنے وطن سے دور رہوں۔۔۔! ان قدرت نے اتنی بڑی سزا دی تھی مجھے وہ دائمی عدل انصاف والا ہے۔ لیکن مال کی مسلسل بیماری اور باپ کے دکھ بھرے خطوط کے علاوہ زبیدہ کی طرف سے دیتے گئے ”سنگدل“ کے طعنے نے مجھے میری واپسی کی راہ دکھا دی اور آج برسوں بعد جب میں واپس لوٹا۔ تو وہی دیوانہ میری لہر کے پوچھ رہا تھا! ”کیا میں مجرم ہوں؟“۔۔۔!

بے پناہ سوچوں کی یلغار نے میرے ذہن کو پاش پاش کر دیا۔ رات گز گئی۔

اور صبح کے آثار نمودار ہوئے۔ جانے کس دقت میں اٹھکا ہمارا ذہن نیند کی آغوش میں سمٹ کر جاسو۔ گھر خراب و آوار کی آمدیں میں رات بہت معصوم گزرا۔ پندرہ دنوں کے بعد کہیں یہ عجم چھٹا تو میں زبیدہ کو لئے نیر آبا کے ہاں ملنے چلا۔ راستے میں لی مارکیٹ سے پہلے والی سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ سامنے کے ڈی اے والے ایک پرانی مہترہ عمارت گزار رہے تھے۔ اچانک میری نظر سامنے جا پڑی۔ وہی دیوانہ نیر آبا۔ منہ کھولے اور دیکھ کر ٹرٹرا رہا تھا۔ میری آنکھیں بے تحاشہ آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”اے آپ کو کیا ہوا؟“ زبیدہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ جانتی ہو یہی دیوانہ کون ہے؟“ ہاں میں نے کہا ”ہو کہ کوئی مکر۔۔۔“ وہ حیرت سے بولی

”ہر ایس احمد خان ہے“۔۔۔! میرے منہ سے نکلا۔ ”اے کپتان بھائی“۔۔۔! زبیدہ متحیر کڑاڑی سے باہر نکل آئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھ سے پہلے ہی وہ اس ملک پہنچ گئی تھی۔ اس نے مجھے دکھا۔ میں کمر بے قریب آیا۔ اور سر ٹوٹی میں دلا ”وارث شاہ دی ہیر کھتے؟“ جانے اس دم کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ دیوانہ نہیں ہے! اس نے آگے بڑھ کر میری جگہ لے لی۔ میں گھر آکر پچھے ہٹا۔ زبیدہ اس کی وحشت زدہ حالت دیکھ کر میرے ساتھ آن لگی۔ مگر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ سہ ماہی منزل عمارت کی اوپر والی منزل سے غیر متوجہ طور پر میری اوریٹ کا ایک ٹوڈا بالکل اس کے سر پر لگا کر۔ اور وہ ہر اکسہاڑے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے نیچے گر گیا ایک عجم امڈ آیا۔ کتا بڑا بازی کر تھا وہ ہر باہر ای ذات کے گرد کسی نہ کسی بہانے جمع لگا لیتا تھا۔ میں اسے ہسپتال لے گیا جب وہ لیٹی آنکھیں کھول چکا تو ہوش کی اسی منزل پر واپس آ گیا۔ بہر تے برسوں پہلے واپس ہٹ گیا تھا۔۔۔! وہ دن صبح سب کے لئے خوشیوں کا پیام لائی آہستہ آہستہ اس نے سب کو پہچان لیا ہسپتال سے فارغ ہونے پر اس کے نے میرے ہاں رہنے پر اصرار کیا تو سب نے اجازت دے دی۔ کوئی مجھ اسے آزدہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا میرے گھر کا کیسٹ روم اس کا مسکن بنا تھا اب کپتان بالکل کوکا کر بہت خوش تھا۔ زبیدہ نے دل و جان سے خدمت کی اور میں میری خوشی کا تو جیسے ٹھکانہ بنی تھا۔

کتنا سخت جان ہوں میں دوست۔۔۔! وہ دکھی بچے میں ہوتا ”ابھی تک جان پر کیا کچھ کر گیا۔ لیکن روح اند جسم کا رشتہ۔۔۔“

اور ایسا نہ کہو میرے دوست۔۔۔! میں انجانے خدشوں سے لرز جاتا۔ اب میں اسے کبھی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کبھی میرا دل چاہتا میں چیخ کر کہوں

”محموم ہوا انیس احمد اپنے ذہن سے اس خیال کی جھلک دو۔ تمہارا جبر میں ہوں میرے پستان بھائی جس کی ذہنی تفریح نے اس کہانی کا تانا بانا کر دو محصوم زندگیوں کو اس کی جھینٹ چھوڑ دیا۔۔۔! اگر میں کبھی کھلے دل سے اس بات کا اعتراف اس کے سامنے نہ کر سکا، کتنا بزدل تھا میں۔

اس رات باتیں خوب بری۔ میرے گیسٹ روم میں آج کل کے بے تحاشہ ادنیٰ قیمتے کو بیٹے۔ بادلوں کی کسی ادنیٰ گرج کے ساتھ ہنس ہنس کر دم دوڑوں بائیں کرتے رہے! زہیدہ ثابت کے ہمراہ بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے حیدر آباد کی ہوئی تھی۔ گھر میں خاموشی کے ماحول میں اس کا ہر گونج دار فقہار اٹھاتا شردیتا۔ بائیں کرتے ہوئے کھو گیا۔!

”کہاں کھو گئے میاں جنوں۔۔۔! میں نے اسے بلایا۔“
”سندھ کے میاں جنوں کو آج برسوں بعد خواب کی یہ بھیر یاد آگئی تھی!“

”میں سوچتا ہوں آصف۔“ وہ آہستہ آہستہ بولا۔ ”زیون کی کاہلی پر کبھی کبھی وہ تحریر شاہد میر سے لے لے لے جی۔ جو تقدیر نے اٹھانے میں اس سے کھولی تھی۔۔۔!“ ”وہم ہے تمہارا یا اس اب تمہو جاؤ!“ میں نے اس کا خیال بٹانا چاہا۔

”تم اوپر اپنے بیڈ روم میں جاؤ۔۔۔! اور شاہد تنہا چاہتا تھا۔“
”وہاں آج میر (کیا کام۔۔۔! میں نے اسے شرارت سے آنکھ ماری! اب کبھی کروا دو۔۔۔!“

”ہاں۔“ وہ لمبی سی ہال کر کے ہنس پڑا۔ ”میرا اتنا خیال رکھنے ہو۔ میں مرنے نہیں چلا۔“

”واللہ نہ کرے۔۔۔! میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے ابھی تک میں روز ایک خواب آور گول دے دیتا تھا۔ شیشیہ البتہ میرے تصرف میں آتی تھی۔ کہ وہ نہیں کچھ اور نہ کر بیٹھے۔ میں نے اسے ایک ٹوک کھلائی اور بھر بائیں کرتے ہوئے ہم دونوں وہیں سو گئے۔ تاروں بھرا آسمان اس رات بادلوں کی کھن گرج مہر کہ خاموش تھا۔ اپنا سا اعنفہ گرج کر دھرتی پر جھڑ چکنے کے بعد باد تاروں کو اپنے جلو میں سمیٹنے اور خاموش دھرتی پر سایہ کئے تھا۔ دھرتی نے اس کا سارا غم اپنے اندر جو سمیٹ لیا تھا۔ اس رات کے کسی ظالم پہر ہم سب کا پستان بھائی اور میرا انیس احمد خان چپکے سے گرے۔ موت کسی لمحے مجھے غافل پار اندر لگائی تھی۔ صبح بالکل خاموش تھی۔ مجھے یاد آیا ایک بار جب سو بڑے سائیکل کے حادثے میں ہم دونوں بال بال بچ گئے تھے۔ ٹوسٹر پر کڑے جھل کر رہ بولا تھا۔

”اس طرح نہیں یار میں ذرا جذبات انداز میں مرنے چاہتا ہوں!“
”ہاں۔ بالکل ویسے اس طرح آدمی مرنے کے بعد بھی ذرا اسمارٹ نظر آتا ہے۔۔۔! اور ہم دونوں ہنس پڑے تھے۔

رات کسی دنت مجھے غافل پار کے لئے خواب آور گولیاں ساری لنگلی تھیں۔ میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ واقعی جذبات تو میں میں آج بھی مرنے کے لئے خود کشی بہتر طریقہ سمجھتا ہوں۔ جب ہی تو وہاں کے لوگ اجنبی خود کشی کرتے ہیں۔ لیکن میں اتنا بزدل تھا کہ اس اجنبی خود کشی میں اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ حالانکہ ہم دونوں کو مرنے چاہیے تھا۔ یادیں اس کے سر وجود کے ساتھ ٹھنڈی آنکھوں بہت مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک بار وہ خواب کی کیفیت میں پڑنے کے کرے کی کھیت پر نظر پڑا تھا۔

جانتے ہو میری زندگی کا آخری لمحہ کون سا ہو گا۔؟“
”ہاں جب تم تین بار کھو گے“ ”بول ہے۔! میں نے شرارت سے کہا تھا۔!

اور وہ سنجیدگی سے ہنس پڑا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کا آخری لمحہ آہستہ سے آہستہ سے میرے قریب سے چر کر لے گیا مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ تقدیر کا یہ زخم بہت کادی تھا۔ کسی انوکھی شام غریباں تھی وہ۔۔۔!

قبرستان میں اداسی کا راج تھا۔ اس کا ٹھنڈا وجود تہہ در تہہ مٹی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ٹھنڈی مٹی لگا ہوں مجھے کھور رہی ہوں!

میں نے آخری مٹی کی ڈالی۔ نئی زدہ اس کی آنکھوں کی طرح ٹھنڈی مٹی بھی جیسے ہی سوال کر رہی تھی۔ روراث شاہ دی ہیر کتھے؟ بے قرار ہو کر میں نے اپنا سر دوست کے مقبرہ پر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔



پھول کا گھر

اقبال بانو



بناؤ کہ ملوگی کہاں؟“ حمید مل گیا۔

”ہمارے گاؤں سے باہر ایک کنواں ہے اس کے قریب جی شیشم کا درخت ہے۔ بس دن پھنپنے سے پہلے میں وہاں آجایا کروں گی“ شاہدہ بولی۔

”تم دوپہر میں آنا“

”وہ کیوں؟“

”دیکھو نہ مجھے گھر جاتے جاتے کافی رات ہو جایا کرے گی اور ویسے بھی بھری دوپہر میں کون نہیں دیکھے گا“ حمید نے کہا۔

”تہاں گھر تو نزدیک ہی ہے۔“

”پہلے میں اپنے تایا کے مل رہا تھا۔ اسکول تیا جی کے گھر کے نزدیک تھا۔ اب میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔ جہاں سے لاری کا یہاں ہم کار راستہ ڈھانی گھٹنے کا ہے۔“

”پہلے تم نے نہیں بتایا۔“

”کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا۔“

”اب وہ دونوں کہاں کے کھیت کے بچوں ہوج بنے ہوتے پھوٹے سے راستے سے گزر رہے تھے۔“

ادھر چرب شاہدہ کا گاؤں تھوڑی دھورہ گیا تو حمید نے رک کر ہولے سے کہا۔

”اچھا شاد خدا حافظ میں بھیہ کر آؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گی“ شاہدہ نے نظریں اٹھا کر حمید کی طرف دیکھا۔

”انکھوں میں خواہ نمواہ ہی شبنم چھنے لگی۔ وہ حمید کے سامنے رونہ نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے تو بھڑکی سے آگے بڑھ گئی۔“

حمید کتنی ہی دیر تک کیک کے تنے سے جک لگائے اُسے جانا دیکھتا رہا جتنی کہ وہ اس گاؤں کے کچے کچے مکاؤں کے دیواروں کے پیچھے کم ہو گئی۔

حمید دل میں ہزاروں ڈیرے ادا ہونے کے ڈال کر واپس پلٹ آیا۔

شاہدہ لوگ شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ لوگ شاہ لکڑیوں کا بیوپاری تھا اور اس کا گراہ گاؤں کے ان لوگوں سے اچھا ہوتا تھا جو کہ زمیندار کے مزار سے تھے۔

لوگ شاہ اپنے بیوپار کے سلسلے میں شہر جایا کرتا تھا اور جب وہ کسی اسکول کے بچوں کو اچھے اچھے یونیفارم پہنے گئے میں بستہ دکھاتا تو اس کے دل میں یہ خواہش پھیل جاتی کہ کھل اٹھتی کہ اس کی بیٹی شاہدہ بھی اس طرح یونیفارم پہنے ہوئی ہوگی۔

اس طرح یونیفارم پہنے ہوئی ہوگی۔ اس لئے وہ اس نے شاہدہ کو سکول میں ڈال دیا۔ جو کہ گاؤں سے ڈیرھ میل کے فاصلے پر تھا۔

وہ ایک آفسیر کالونی تھی جس میں وہ پرائمری سکول تھا۔ جہاں کالونی کے بچے پڑھا کرتے تھے۔

وہیں حمید اور شاہ کی پہلے روز ہی دوستی ہو گئی۔ شاہدہ

نہایت ہی خوشگوار تھا۔ بھری دوپہر

ہونے کے باوجود بھی پتہ نہیں چلی رہا

تھا۔ کیونکہ کالی کالی گھاؤں نے کاش کو لپوڑی طرح ڈھانپ رکھا تھا اور آثار تھے کہ ابھی بارش ہوا ہی چاہتی ہے۔

حمید تقریباً آدھ گھنٹہ سے جی شیشم کے درخت تلے کھڑا تھا۔ یہ آدھ گھنٹہ اسے صدیوں پر عید لگ رہا تھا اور سرگ پار گورنمنٹ ہائی اسکول کا گیٹ تھا کہ

کھلے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔

ادھر پھر ایک دم ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

انکھوں میں اٹھتی چمک عودائی یوں لگا جیسے کہ سرکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔

وہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے کمر لکڑی چادر سے اپنے پورے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔

حمید سرگ پار کے تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”آج دیر ہو گئی؟“ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”جی نہیں تم نہیں آئے ہو گے۔ میں کینٹن میں پیچھی رہی“ ڈوٹو

”پورا آدھ گھنٹہ ہو گیا ہے“ حمید بولا۔

”اچھا“ وہ ہنس دی۔

”او لا مذاقی“ حمید منہ بنا کر بولا۔

”تجس علم ہے کہ آج میرا آخری پرچہ تھا“ شاہدہ نے کہا۔

”مل بھی بناؤ لکھا ہوا؟“

”ٹھیک ہی ہو گیا ہے۔“

”شاہدہ! حمید نے کبھی راز اس سے کہا۔“

”ہوں۔“

”اب میں بتیں کیسے دیکھوں گا؟“ اس نے بڑکا سا سوال

کر دیا۔

”یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا۔“

”پہلے شاہدہ کچھ کرنا؟“ حمید نے نہایت جتنی لہجہ میں کہا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں حمید؟“ شاہدہ نے کہا۔

”کچھ بھی کرو۔“ وہ بے قرار تھا۔

”م تم یوں کر دیر سے گاؤں آجایا کرنا؟“ شاہدہ نے راتے دی۔

”اتنی دور“ حمید نے کہا۔

”بس بے جینی صم“ شاہدہ نے مذاق اڑایا۔

”یہ بات نہیں ہے شاہدہ۔“

”تم مجھے دیکھنے کے لئے بے قرار بھی ہو اور گاؤں بھی نہیں آنا چاہتے۔“ شاہدہ چمک کر بولی۔

”ٹھیک ہے میں بر جیے تہاں سے گاؤں آیا کروں گا۔“

کی کوئی اور سہیلی نہ تھی۔ وہ اور حمید دوم ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ حمید کا گھر کا کوئی بی بی تھا حمید کو تو اسکول آنے میں کوئی دقت نہ ہوتی جب کہ شاہد کو بہت سویرے گھر سے نکلنا پڑتا۔ بلکہ شاہد نے اس کے سکول لانے اور لے جانے کے لئے ایک ملازم رکھا ہوا تھا جو کہ شاہد کو لے جاتا تھا۔ اور چھٹی ہونے تک سکول کے باہر ہی بیٹھتا تھا۔ اس سے گپ بازی کرتا تھا۔ یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ شاہد اور حمید میں کا وہی چھٹی۔ شاہد ذرا ڈرامی چیز حمید کے لئے چھپا چھپا کر مکتی اور دوسرے روز حمید کو دیتی تو وہ بہت خوش ہوتا۔ شاہد کے انضباط والے بھی اس کا دل میں رہتے تھے۔ وہ بہت اعتراض کرتے کہ شاہد نہ پڑھے مگر بلکہ شاہد نے کسی کی نہ سنی۔ پرائمری کے بعد شاہد کو سیکنڈری سکول میں داخل کر دیا گیا اور یوں حمید کو شاہد کا ساتھ چھوٹ گیا۔ حالانکہ حمید بھی کالونی ہی کے ہائی سکول میں پڑھ رہا تھا مگر یہاں لڑکوں کی دیر پھر میں اور لڑکیوں کی طرح شغف ہوتی تھی پھر بھی جب چھٹی ہوتی حمید کیٹ پر اپنی ساتھی سے ملنے کے لئے موجود ہوتا۔ اس کی ایک جھلک ہی حمید کو سرشار کر دیتی۔ وہ دونوں بچے ہی تھے۔ اتنی شہرت اور گہرائی کا مطلب وہ نہ سمجھ سکتے۔ مگر گزرتے وقت نے انہیں آہستہ آہستہ سب کچھ سکھایا۔

شاہد کو پتہ چل گیا کہ حمید کو سامنے پا کر اس کا دل کیوں سے دھڑک دھڑک بے حال ہوتا ہے۔ چلیں اتنی بوجھ کیوں ہو جاتی ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتیں اور دے بھی لڑکیاں تو دقت سے پہلے بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر بات سمجھنے لگتی ہیں جب شاہد بھی ہر بات سمجھنے کی تیوینجیر ہو کر وہ آٹھویں کلاس میں بری طرح فیل ہوئی جب کہ حمید پاس ہو گیا۔ پھر بھی اس نے شاہد کو دلاسہ دیا کہ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے تم دوبارہ امتحان دے دینا۔ شاہد نے اس کی بات پہلے باندھ لی ورنہ اب تو اس کا دل پڑھنے کو ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب شاہد اسکول اکیلی جاتی۔ پھر ہوا یہ کہ کوکشاہ نے بھی کو برقعہ اوڑھا دیا اور یہ واضح سنل تھا کہ اب شاہد ہر فی کی طرح قلندریں نہیں بھرے گی۔ حمید شاہد نے ڈوبتے

دل سے کہا۔
 ”حمید اب تم سکول کے گیٹ پر منت کھڑے ہو کر دو۔“
 ”کیوں؟ حمید نے حیرت سے پوچھا۔“
 ”لوگ کیا کہیں گے؟“ شاہد بولی۔
 ”کچھ نہیں۔ پہلے کوئی کچھ کہتا ہے۔“

”اب ہم بڑے ہو گئے ہیں حمید؟ شاہد نے ہونے سے کہا۔“
 ”شاہد ہم نہیں نہ دیکھیں تو سمجھ نہ کر لیا ہو جائے۔“

حمید نے بیقراری سے کہا۔

”میں کیا کر دوں؟ شاہد بے پردائی سے بولی۔“
 ”اچھا پھر اس طرح کہ جسے کسے دقت اسکول کے پھوپھا باغ میں آجایا کر دوں گا۔ تم ذرا جلدی آجاکو۔“ حمید نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ شاہد نے بغیر سوچے کچھ کہا۔
 — اور پھر یہی ہونے لگا کہ شاہد اسکول جلدی آجاتی او

حمید اور وہ دس پندرہ منٹ ساتھ ساتھ اور پھر یہ جذبے جو اپنا آپ منو کر رہتے ہیں۔ حمید نے بھی اپنے دل میں غصے کئے شاہد سے دوری کا تصور بھی اس کے لئے سوڈان روح تھا۔ اور ایک روز وہ شاہد کا ہاتھ تمام کر نہایت پریم سے ہولا۔

”شاد میں تجھ سے شادی کر دوں گا۔ تو کرے گی نا؟“
 حمید نے اتنی معصومیت سے کہا کہ شاہد ہلک ہلک اسے دیکھے لگی۔ جو بات اس کے دل میں تھی۔ حمید نے رمل کہہ دی بہت سیدھے سادھے لفظوں میں وہ رپتے حیرت میں غوطہ زن تھی۔
 ”تاؤ شادو مجھ سے شادی کر دو گی؟“ حمید نے بے قراری سے پوچھا۔

”ہاں!“ شاہد نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا اور حمید کی تو دل کی کلی کھل گئی۔

اب ان کی ملاقاتیں ہوتیں تو وہ پہلے جیسی معصوم باتیں نہ ہوتیں بلکہ منتقل کے انہوں نے جواب دیکھے جاتے۔ چھوٹے سے گھر کے پسینے دیکھے جاتے۔ حمید منصوبے بناتا رہتا اور شاہد مکر اسکر اسکر سنتی رہتی۔ حمید کے چھ اور بھائی بھی تھے مگر ان کی کوئی بہن نہ تھی۔ اور ان سالوں بھائیوں کو بہن کا بڑا ارمان تھا۔ حمید کے والد کی شوگر کوٹ میں زمینیں تھیں۔ اس لئے یہ لوگ زمیندار کہلاتے تھے۔ حمید نے میٹرک کے بعد شہر کے کالج میں داخلے لے لیا اور وہ اب بھی کسی دسی طور شاہد سے ملنے ضرور آتا اور جب دونوں کچھڑتے تو دونوں کے چہرے مل پراچر کی کہانیاں واضح طور پر دھبی جاتیں۔

یوں ہی دقت کے بہتے سمندر میں کچھ اور سمندر پرے اور جب شاہد نے انٹر کا انکزام ویا تو حمید بی۔ اے میں تھا۔ خدا کو ان کا شوگر منظور رکھا اور حمید نے والدین سے مندر کر کے شاہد کے ہاں رشتہ لینے کے لئے بھجوا دیا حالانکہ اس کے دو بڑے بھائی ناراض ہوئے کہ وہ عزیز بڑاوی میں شادی کر رہا ہے مگر جب والدین راضی تھے تو وہ کیا کرتے۔ لوگ شاد بڑی مشکل سے مانا کوئو کہ اس کی ایک بی بی تھی اور پھر یہ بات۔ دونوں سردار دادیں ملے ہو گئی کہ حمید ایک ماہ بعد یہاں آجائیکا۔

اور گھر داماد کے طور پر رہے گا۔ ملک شاہ بس اسی بات پر مان گیا اور یوں ایک گلابی شام وہ بچپن کے متھی ہمیشہ ہمیش کے لئے ایک ہو گئے۔

حمید قشاہدہ کو دیکھ کر جتنا تھا۔ دونوں کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں اور پھر حسب وعدہ حمید قشاہدہ کو لے کر واپس سسرال آ گیا۔ حالانکہ اس کے والدین نے بہت شور مچا یا مگر حمید نے کہا۔

”باباجان میں چاہا ملک سے وعدہ کر چکا ہوں اور ویسے بھی میں بچپن سے تاجی کے پاس رہا ہوں۔ اب اگر میں اپنے سسرال ہوں تو کیا حرج ہے۔ آخر آپ کے چھ اور بیٹے بھی ہیں۔ ویسے بھی دہل سے کالج جانے سے آسانی رہے گی۔ حمید نے بہانوں سے باپ کو راضی کر لیا اور ملک شاہ کے ہاں آ گیا۔

چند روز تو ٹھیک گزے مگر حمید نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ ہجرہ بی بی جو کہ شاہدہ کی ماں تھی۔ وہ اس سے خوش نہیں بلکہ اس نے دیکھا ہے کہ شاہدہ بھی رنجھانی سی رہنے لگی ہے۔ حمید اور شاہدہ اگر کمرے میں ہوتے تو ہجرہ دور شاہدہ کو

آواز دے کر بلا لیتی جیسے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں بلکہ بزدل کے پاس بیٹھی ہوا اور پھر ایک روز جب حمید کالج سے آیا تو اس نے دیکھا شاہدہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے کہ روٹی پر تیل اس نے زبردستی کی سکرابٹ لہوں پر کھینچ کر جھکا اسٹاف

کیا حمید کمرے میں چلا گیا۔ شاہدہ سے وہ پوچھتا ہی چاہتا تھا کہ تو اس کیوں ہے؟ تب ہی ہجرہ بی بی نے آواز لگائی۔

”شاہدہ ادھر آ“ اور وہ کھٹ سے کمرے سے نکل گئی۔ پھر کھانا بھی حمید کو ملازمرے لا کر دیا اور شاہدہ اسے نظر نہ دانی بے ستمائے جھوک ہونے کے باوجود بھی حمید نے کھانا نہ کھایا۔

شاہدہ کی سوچی سوچی آنکھوں نے حمید کے دل میں جھالے ڈال دیے تھے اور وہ رات کا منظر تھا۔ جب شاہدہ اس کے پاس آتی تھی کیونکہ اس وقت ملک شاہ آ جاتا تھا۔ او ہجرہ ملک شاہ کے سامنے انہیں کھلی پھوٹے دے دیتی تھی۔ اور رات کو شاہدہ نے حمید کے سینے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

”حمید مجھے یہاں سے لے چلو میں یہاں نہیں رہنا چاہتی“ ”کیوں؟ آخر کیا ہوا؟“ حمید نے بے چینی سے پوچھا۔

”اماں ہر وقت طعنے دیتی ہیں کہ پڑھنے جاتی تھی جسم کر بیٹھی۔ اصل میں وہ اپنے جھانکے سے میرا بیاہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی نشتر زنی مجھے جیسے نہیں دیتی“

”میں تمہارے بابا سے بات کروں گا“ حمید نے شاہدہ کے ہاں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اور پھر شاہدہ اس کی بانہوں میں اپنے سارے غم بھول گئی۔

حمید نے ملک شاہ سے عہدہ رہنے کی بات کی تو وہ نہ مانا۔

”تم وعدہ کر چکے ہو ساتھ رہو گے میں شاہدہ کو خود سے جدا نہیں کر سکتا“ اس نے حمید کی ایک بھی نہ سنی۔

اور پھر یہ ہوا کہ جب شاہدہ کا رزلٹ نکلا تو حمید نے اپنے ای کالج میں اسے بی۔ اے میں ایمیشن دلادیا۔ حالانکہ ہجرہ بی بی نے منع کیا مگر حمید نہ مانا۔ یہ تو تھا کہ شاہدہ کی اس کل سے جان چھوٹی تھی۔ صبح وہ اسکو پر شاہدہ کو لے کر کالج چلا جاتا اور

سہ پہر کو وہ دونوں کھوتے کھاتے واپس لوٹتے۔ شاہدہ کی تنگدستی لوٹ آتی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ دونوں ہی بہت خوش تھے اور پھر ایک روز حمید نے شاہدہ سے کہا۔

”ہم الگ گھر بنائیں گے۔ شاہدہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ سسرال میں پڑا رہوں“

”میں نے تو پہلے بھی کہا تھا تم نہیں مانے“ شاہدہ بولی۔

”بس ایجنڈا م دے لوں پس سروں کے لٹا پلائی کر دوں گا“

”باہل ٹھیک“ شاہدہ نے کہا۔ اور حمید اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ کیوں الگ رہنا چاہتا ہے اس نے چند روز سے گھر کے ماحول میں عجیب تبدیلی دیکھی تھی۔ قریبی کاجوں کا زمیندار مراد خان ان کے ہاں روزانہ آنے جانے لگا تھا حمید کو لڑتے اڑتے غبر ملی تھی کہ وہ گئے دنوں میں ہجرہ بی بی کا محبوب تھا جب پڑھتے تھے گھر گیا تو چمچے ہجرہ بی بی کی شادی ملک شاہ سے ہو گئی تھی۔ اور اب اتنے رسول بعد وہ اپنے عہدوں کو بازہ کرنے آ جاتا۔ جب کہ حمید کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ گھنٹوں ہجرہ بی بی سے کہیں لڑکتا اور شام کو ملک شاہ کے آنے سے پہلے چلا جاتا۔ حمید اور شاہدہ کالج سے آتے تو پہلے سے سوجھ بھڑکا اور حمید کا خون کھول کر رہ جاتا۔ ایک روز دہے دہے لفظوں میں اس نے ہجرہ بی بی سے کہا۔

”ماں مجھے اچھا نہیں لگتا کہ مراد خان یہاں آئے“

یہ میرا گھر ہے جو چاہے آئے تم کون روکنے دالے ہوتے ہو؟ ہجرہ جھک کر بولی۔

اور حمید نے سوچا واقعی اگر میرا گھر ہوتا تو اس طرح منہ پر تھپیر تو پڑتا۔

پھر ہجرہ بی بی نے یہاں نہ کیا کہ مراد خان شاہدہ کو چھپا کر لگا۔

حمید نے کہا ”جب میں پڑھا دیتا ہوں تو کیا ضرورت ہے کسی ٹیوٹر کی۔“

اور حمید کی اس بات پر ہر وہ بی بی کا دل سنگ اٹھتا تب اس نے حمید کو کہہ دیا کہ یہاں نہیں ہو گے۔ تم میرے لئے غمخوار ہو۔ حمید امتحان سے فارغ ہوا تو اسے اپنے دل میں درد محسوس ہونے لگا۔ بیٹھے بیٹھے وہ محنت پسینوں میں ڈوب جاتا اور شاہدہ بولانی بولانی پھرتی اور پھر ایک روز تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب حمید نے منہ بھر کر سرخ خون سے سفید چادر پر گل و گلزار بنا دیے۔

”حمید کیا ہوا؟“ شاہدہ رودی۔

”میرے دل میں کچھ ہو رہا ہے۔ بول لگتا ہے کہ جیسے دل کو کوئی کاٹ رہا ہے۔“ حمید بولا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

ملوک شاہ بڑی طرح گھبرا گئے۔ اور پھر کون سا علاج سمجھا جو کہ انہوں نے داماد کا نہ کرایا صرف ایک ماہ میں ہی حمید چل کر رہ گیا۔ حمید کے والدین اسے لینے آئے مگر وہ نہانا۔ وہ اپنے شاہدہ کے ہاتھوں ہی میں دم دینا چاہتا تھا۔ بعض مرتبہ کہتا۔ ”شادی میں مر جاؤں تو تم شادی کر لینا زندگی کو روک نہ لگانا“ تب شاہدہ تڑپ تڑپ کر رو دیتی۔

پھر حمید کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ایک مہرے ہونے مگر پھر معروف کی سمجھ میں کوئی مرض بھی نہ آیا۔ حمید کا باپ اور سرسپاتی کی طرح پیسہ بہا رہے تھے۔ حمید کے لئے اس کے کچھ بھائیوں نے خون دیا۔ مگر کوئی افادہ نہ ہوا۔

زہرہ بیگم اپنے نزدیک جوں اپنے کو خون ہتھکتے دیکھتیں تو دل پر کڑ کر رہ جاتیں۔ ڈاکٹر ان کے بیٹے کے لئے کچھ نہیں کر رہے تھے اور آخر وہ اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے ایک ہر صاحب تک پہنچ گئیں۔ ان کا بہت شہرہ تھا۔ کئی لوگ اپنی مرادیں پانچکے تھے اور زہرہ بیگم بھی مایوس نہ تھیں۔

انہوں نے اپنے بیٹے کی تمام کیفیت پر صاحب کو بتا دی۔ انہوں نے چند لمحے آنکھیں بند کر کے کچھ دیر سوچا اور پھر آنکھیں کھول کر اپنی سرخ سرخ نظر دلوں سے زہرہ بیگم کو دکھایا۔

”مجھے افسوس ہے،“ ان کے لب لپکے۔

”جی۔“ زہرہ بیگم نے ہیرت سے پوچھا۔

”تمہارا بیٹا زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”آپ کچھ نہیں کر سکتے۔“

کرنے والا تو وہ بلی بھیڑی والا ہے وہ چاہے تو مر دے

میں جان ڈال دے۔ پر اس کے کلام میں بھی توار ہے۔ تمہارے

بیٹے پر سفلی عمل کر دیا گیا ہے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ زہرہ بیگم کی غور غور سی چیخ نکلی گئی۔

چاؤ اور وہ جہاں رہتا تھا اس گھر کی دہلیز کو کھودو۔ وہاں مٹی کا منہ بند ڈانڈن ہے۔ اس میں تین چنگی کالے کچھو ہیں جو کہ دو ڈھائی ماہ سے باہل بھوکے ہیں اور جب وہ مارے بھوک کے لٹے کی خالی سطح کو ڈنگ مارتے ہیں غذا کی خاطر تو تمہارے بیٹے کے دل میں سوراخ ہو جاتا ہے اور روز ہی کتنے سوراخ ہوتے ہیں مجھے تو حیرت ہے کہ وہ ایک دن میں مر کیوں نہ گیا۔ اب تک زندہ کیسے ہے۔ تم



پین ورک اور تھریڈ ورک

بے شہما جدید
نت نئے ڈائریکٹ پین ورک اور تھریڈ ورک
گھر میں بیٹھ کر آپ با آسانی خود بنائے
پاکستان میں اردو زبان میں پہلی
بار اسے موضوع پر ایک جامع کتاب

آج ہی نکال کر دی بی گولیے۔ ڈاک ٹرپ عیندہ

منگوانے کا پتہ



نیا ادب اردو بازار، کراچی

زہرہ یکم اس قابل تھی کہ تین تین سال تک اس طرح پتہ چلا۔ بس وہ تو ایک ہی بین کے جبار ہی تھیں۔
 ”موتیرے دشمن تھے کھائے وہ خوش نہیں تھے تجھ سے تو کیوں آیا اس جگہ۔“

پھر حمید کی لاش لاری کے ذریعے اسی کے گاؤں لے جانی گئی کیونکہ حمید کے بھائی اسے اپنے کبابی گاؤں کے قبرستان میں دفنانا چاہتے تھے۔ شام بھی انہیں کے ساتھ چلی گئی اور جاتے جاتے ہا جونی بی سے کہنے لگی۔

”اماں آپ کو پسند نہیں تھا کہ حمید یہاں ہے۔ آپ پونہی کہہ دیتیں تم چلے جاتے مگر آپ نے میرا ہشتابنا گواہ کر دیا ہے اب یہاں اپنی رہیں۔ شادیالے بھائی میں اپنے سرال میں رہوں گی۔ حمید کی قبر سر روز دیا جلاؤں گی۔ تم جہنم کے ساتھی ہیں میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اب میں اس آگ پر زندہ رہوں گی حمید کے پھولوں ایک اور قبر کا اضافہ ہو اور وہ قبر میری ہو گی۔“
 پھر نلوک شاہ کے روکنے پر بھی وہ نہ رکی اور اپنی روتی ملتی ہوئی ساس کی کمرے کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار کئے اس کے گھر سے ہمیشہ بیٹھ بیٹھ نکل آتی۔

آج کئی سال ہو گئے ہیں۔ شاہدہ پٹ کے میکے نہیں گئی۔ وہ روز شام کو حمید کی تربت پر اپنے انکھوں کے بازو پھلاتی ہے اور دریا جلاتی ہے اور لوگ اس جوان اور اسیر و فانیہ کو دیکھ کر آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ جس کی ماں نے اس کے ہنستے ہتے چن کے تھے پھر دیے تھے مرث اس لئے کہ اس کا داماد نہیں کرتا تھا کہ اس کی ساس کا گئے دنوں کا محبوب اپنی یادیں تازہ کرتے ان کے گھر آجائے اور مرث کی بات تو یہ ہے کہ ہا جونی بی کا وہ محبوب اب نہیں آتا۔ کیونکہ مراد خان نے اسے کہا۔

”جب تم اپنی بیٹی کی خوشنود پر تنب خون مار سکتی ہو تو میں کون ہوتا ہوں مجھے تو بہاری محبت پر بھی بھر و سہ نہیں؟“
 اور ہا جونی بی نے ہاتھ ملتے ہوئے سوچے جاتی ہے۔

کیا آیا میرے ہاتھ پر کتنا ابھی تھا سب کچھ گنا ابھی ہول ہول مرث اپنی خوشی کی خاطر رہا کرتی تھی سزا اپنے کمرے کی لاکھ کی جی بھی میری نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں وہ ماں سے مانگن کے بن گئی پچھتاوے اسے چن نہیں لینے دیتے۔
 لئے اس زور پشیمان کا پشیمان ہونا

جاؤ اور ان پھولوں کو آزاد کرو جب تک وہ زندہ ہیں تمہارا بیٹا بھی زندہ ہے۔ جیسے ہی وہ مردہ بھی مر جائے گا۔“ پھر صاحب لہوے گئے اور زہرہ یکم کے ہاتھ پاؤں تھنڈے ہو گئے تھے پھر سکانے ان میں کیسے اتنی محنت آئی وہ پھر صاحب کے حجب سے نکلیں یہاں پہننے کا بھی ہوش زہرہ اور بھانگی جوتی بس اسٹیڈ پر پہنچی وہاں سے رکشیا لیا اور گاؤں آگئیں۔ ان کے ذہن میں پھر صاحب کا جسد گوج رہا تھا۔

”ان کو آزاد کرو۔ جب تک وہ کیچڑ زندہ ہیں تمہارا بیٹا بھی زندہ ہے۔“ گاؤں سے باہر رکشہ رکھا تو انہوں نے پولیس جتنے پیسے بندھے ہوئے تھے رکشے والے کو دے دیے اور پھر بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے مٹا کی ماری ماں گاؤں کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں دو لڑا دوڑی جا رہی تھی اور پھر نلوک شاہ کے دروازے کی دہلیز پر وہ تہوار کر پڑی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے عورتوں سے بھرے سنگ کھنکھائیں گئیں جہاں ایک چارپائی کے گرد عورتیں بیٹھیں ہوئی تھیں اور شاہدہ چارپائی کی پٹے سے سر کھرا رہی تھی۔ اس کے چھوڑ سے زمین آسمان کانپ رہے تھے عورتیں اسے تھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ ایک دکھاری ماں اس دروازے کی چوٹ پر گر کر پڑی ہے جہاں وہ بچو دفن تھے اور زہرہ یکم کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان کا جلن کوئی ہت پر موت سے مار گیا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ وہ ہاتھ سے اس چوٹ کو کھونٹے لگیں۔ ہا جونی بی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس کا رنگ امتاس کے پھولوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔
 ”یہ کیا کر رہی ہو حمید کی ماں؟“

”مجھے یہ چوٹ اکھاڑنی ہے ہا جہ۔ جہاں میرے بیٹے کی موت کا سامان دفن ہے۔ زہرہ یکم نے چٹاؤں کی ہی سستی سے کہا۔ پھر ہا جونی بی اور دوسری عورتوں کے روکنے کے باوجود وہ نہ رکیں۔ قریب ہوا چوڑا کرال اسٹاکر کھدائی شروع کر دی اور چنڈے لہجہ وہ مٹی کا منہ بند لوٹا ان کے ہاتھ میں تھا جس کو کھولا تو واقعی اس میں یقین سیاہ مردہ بچو موجود تھے۔

ہا جونی بی تو کانپ رہی تھیں۔ اور زہرہ یکم بھی عیش کر رہی تھی۔ بہت ہی شگفتہ خوردہ لہجہ میں لہجیں۔
 ”تجھ جیت گئیں ہا جہ میں ہار گئی۔ میرا جو تجھ سے روٹھ گیا۔ خدا کرے کہ ابھی اسی دھڑاں مدلی دکھو جس طرح میرا دل پٹھانے تمہارا بھی پیٹے۔“ انہوں نے ہا جونی بی کو گریباں سے پکڑ کر تھپتھپایا۔
 یہ بات سب بگڑ پھیل گئی کہ دہلیز سے بچو نکلے ہیں۔ مگر



اس دنگا کوئی نام نہیں

ناہیدندر



”تا نگہ تیز چلا دینا بابا“ مجھے کچھ اور نہیں سوچتا تو جلدی سے کہتا ہوں۔

”ساب آج ٹھنڈ بہت ہے اور سہارا یہ گھوڑی تو رہا
بہار بھی ہے آجکل“ بابا آہستہ سے کہتا ہے اور پھر کھڑکی
سے باہر دیکھ کر کہتا ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تا نگہ بابا
نے خود غصے کی گت کا ناچھوڑ دیا ہے۔

لمبی سی تار کول کی سڑک حد نظر تک پھیلی ہوئی ہے
پھر عبداللہ کا قبرستان بہت پیچھے رہ گیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کے
ساتھ سرسراتے ہوئے گھول اور ماضی کی سرگوشیوں سے دوسرے
زمن پر چکا چوند سی جھا جاتی ہے۔ بولتی آنکھوں والی مریم کا سہارا
میرے دامن کی بریق تھوکتا چلا جاتا ہے۔

مجھے اچھی نظر آ رہا ہے۔
اس دن میں حسبِ عادت کئی دن سے مجھے کوئی پہنوں
میں آواز دیتا تھا“ ویسٹنگ برنگٹنار ہاتھ باندھ کر
تھا۔ اور جب کبھی میں ویسٹنگ پر یہ غمہ لگتا تا مگر احمد میری
ویسٹنگ نہیں کراچ جاتے کیوں
میں تھا۔ دراصل آج ہالی میں داخل ہوتے ہی مسز احمد نے مجھے ہلا
بہار سے دیکھتے ہوئے کہا تھا

”تو آج تم نے جہاں سمارٹ لگ رہے ہو“ وہ ڈوٹو
کرتے ہوئے اور انھوں نے جلدی سے صوفے کی ٹانگ کو چھوچکا
تھا تا نگہ مجھے نظر نہ لگے۔ میں ہمیشہ سے اپنی پرسنلٹی پر اتنا ہوا
تھا۔ اوپر سے مسز احمد کی بات پر اور ہواؤں میں اڑتے لگا۔
اس وقت میں تھکا ہوا اپنے بیروں پر اسکیٹس باندھ رہا تھا۔
تب تو پھر مجھے تھکے تھکے میں نے جو نظر اٹھائی تو دروازے سے اندر
داخل ہوئی ہوئی نازک سی لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ نکلائی پھیول
والی شلوار شین اور سلیپے سے لپٹے ہوئے وہ اپنے والی وہ نکلائی
رنگت والی لڑکی میرے دل میں آتھنی چلی گئی۔ وہ مجھے نظر
سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی جسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو،
میں آج بھی اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ وہ بے حد چمک

اور نمکنت والی لڑکی تھی۔ سب لڑکیوں سے منفرد۔ اپنی آنکھوں
والی لڑکی میرا دل تو ہمیشہ سے ایسے مضمون کا منتظر رہا تھا۔ نٹ سے
سے باہر اگر۔ اپنے تڑپے چمکے ہوئے دل کی آواز زاری پر کان دے
میں بڑی دلچسپی لگتا ہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لگاؤ کی نیاس بھاتا
رہا۔ مگر وہ میری جانب دیکھ کر مسز احمد کی جانب بڑھ چکی تھی۔
”اے میں یہاں ہوں لے نازک لڑکی۔ کہیں تیری تلاش
میں تو نہیں ہے۔ اور آہ۔ چلی آ میری آنکھوں کے پٹ کھول کر دیکھ

رات اندھیری اور سرد ہے بالکل اماؤں کی سی
سیا سیوں والی ہولناک رات۔ اوپر سے سردی اس قدر شدید
کہ آنت نچ رہے ہیں۔ تب میرا تا نگہ پیر عبد اللہ کے قبرستان
سے گزرتا ہے تو میں لرز جاتا ہوں۔ اپنے اوپر کوٹ کے کنار
اوپر چڑھتے ہوئے اس منظر سے نظریں بچانے کی کوشش
کرتے لگتا ہوں۔ مگر قبروں پر آؤ براں سفید سنگ مرمر کے کتبے
مجھے اپنے ہمراہ چلتے محسوس ہوتے لگتے ہیں۔ مجھے خطہ بھر کو اپنی
حفاظت پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں نے سات آٹھ میل کے
سفر کے لئے اس سواری کو کیا چنا تھا۔ مگر اتنے غریب لوگ اس
شہر میں داخل ہونے کے بعد تانگے کو دیکھ کر میں اپنے آپ کو باز
نہ کر سکتا۔ تب تا نگہ بان و بھی آواز میں نشوونما آئی کہ بہت بُرا نا
گیت لگنے لگتا ہے۔ سرخ و سفید بارش نے تا نگہ بان کی
آواز میں عجیب سا لہجہ ہے۔ مجھے بہت پیلے رخصت خانے
تھوڑی بہت نشوونما دکھائی تھی۔ میں اپنی توہینا تا نگہ بان کی سڑکی
آواز پر مرکوز کر دیتا ہوں۔

میرے رفیق میں نے اپنی قبر کے کتبے پر
پتہ ای نام کندہ کر دیا ہے
تا نگہ میرے بعد لوگ
میرے نام سے پہچان لیں۔
ہاں یہ لے دیکھ میری آنکھیں اب بھی ٹھکی ہیں
اگر تو میرے قریب سے گزرے
تو پلٹ کر مجھے ضرور دیکھ لیتا۔

مجھے بت تا نگہ بان پر غصہ نہ لے لگا۔ مگر میں سوچتا ہوں
شاید تا نگہ بان کو بھی اس اندھیری رات میں ماضی کی آوازیں
سنائی دے چکی ہیں۔ میں نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا ہوں
جہاں اس کی کندلی آنکھوں سے پانی کی ایک لمبی سی قطار اس
کی داڑھی کو لٹکاتی جا رہی ہے۔ مجھے اپنا دامن نہ لگنے لگتا ہے
تو میں اپنے سر پر رکھے ہیٹ کو پھر اپنے منہ پر بٹھا لیتا ہوں۔
میرے در و دیوار پر میری آنکھیں کندہ ہیں۔

یہ مجھے جب یہاں پائین کی
مجھے تیرا تھوڑی سی
”خان بابا“ میں آگے اس کا گیت سننا نہیں جاتا تھا۔
ٹپٹے سے سجان کا سہارا میری نگاہوں کے سامنے گھومتے
لگتا ہے۔
”ساب کیا بولتا ہے؟“ تا نگہ بان پلٹ کر مجھے
دیکھتا ہے۔

آگے کیسی کل رنگ راہیں ہیں میرے دل نے تریپ کر چینی پاپا مانگر
کجنت کی آواز بہت دلی ہوئی ہوئی تھی صرف میں ہی سن سکا آخر
میں سیدھا ہوا مسز احمد بڑی شہر لفظوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں
نت میں اسکیننگ کے دوران اس کے قریب سے گزرا۔ ہائے
کیسی دل آویز جھک آدھی تھی اس کے شری سے میرے دل نے
پھر پہلو میں بچل بچائی۔ اب کے میں رہ نہ سکا۔ میں نے اسے
سامنے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ مسز احمد کو چھوڑ کر سا مڈ پر رکھی کچ
پر بیٹھی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے مدد کی دعا کی اور اس
پر جا کر۔ وہ ایک دم بے حد زور ہو گئی تھی میں یوں اس پر جا کر
تھا۔ اس کا ناک و جو دھیرے دھیرے کے نیچے دھیرے دھیرے
کاف رہا تھا۔ یہ یکپا مٹ، یہ میرور کتنا فرحت بخش اور لاوین
تھا کہ میری چاہ رہا تھا وہ یونہی میرے نزدیک ہے۔ اس کی
گلگلی رنگت ہے جسے میری تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کافی
بے بس محسوس کر رہی تھی۔ آخر میں بھی اٹھا اور وہیں کوچ پر سیدھا
ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کو پیچ کر بیٹھ کے کر اپنے لگا۔ اگرچہ
چوٹ تو دل پر لگی تھی مگر اب میں اس کے سامنے دل کیسے پر لگتا
کیونکہ اس کے قیور بہت خطرناک ہو رہے تھے۔

انتہائی بد مزاج اور بے ہودہ آدمی ہیں آپ، وہ اپنا
پرس اٹھا کر غصے سے بولی
"آئی ایم سوری گرل، میں نے تکلیف سے کیا ہے مجھے کیا
آپ کے سوری کہنے سے کیا نتائج ہیں۔ میں کافی دیر سے
آپ کو اپنی جانب گھورتا رہا ہوں۔ مسز احمد نے مجھ سے کلب کی
بہت تعریف کی تھی مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں اس گراؤ کا نظارہ
بھی ہوتا ہے۔"
"دیکھیے آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ میں نے قصداً یہ حرکت
نہیں کی ہے۔" میں بہت مظلوم بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ
بہت آؤٹ ہو رہی تھی اس کے قیور مزید خطرناک ہوئے جا رہے
تھے۔

"آپ نے یہ حرکت قصداً کی ہے مسز آپ لوگ یہاں آئی
لئے آتے ہیں۔ اگر آپ کو اسکیننگ کرنی نہیں آتی تو آپ کہیں سے ساتھ
ہیلپر رکھنا چاہیے۔" وہ زہر مند لہجے میں بولی بہت تیز اور تند
ہو رہی تھی وہ اور مجھے ہمیشہ سے ایسی ہی اٹھ رہی تھیں اچھی لگتی تھیں
"آپ بالکل ٹھیک سمجھیں میں ابھی سیکھنے کے دو میں ہوں۔"
"تو پھر آپ لوگوں پر کیوں کرتے پڑتے پھر رہے ہیں۔"
کسی سے باقاعده تربیت ہیں؟

وہ غالباً مجھے بے لفظ سنانے کے موڈ میں تھی۔

"بھئی میری بھی تو نہیں آپ کو یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔"
"میں یہاں آپ کو دیکھنے نہیں بیٹھی تھی مگر۔ ویسے مجھے
علاوہ یہاں پر کوچ بھی پڑی ہے۔ وہ تیزی سے بولی۔
"بہر حال میں معافی کا حق استکار ہوں۔" میں نے نرم لہجے
میں کہا۔

"ہوں؟ وہ بلیٹ گئی۔ اس کی ناک میں کی کی کھٹ کھٹ
میرے سینے پر حملہ لگے۔ مجھے اسکیننگ ہال ایک دم بورا اور
بکواس لگنے لگا۔ میں نے اسکینس پیروں سے الگ کئے اور باہر کی
کھلی فضا میں چلا آیا۔ جی تو جا رہا تھا کہ پورا کلب چھان ماروں اور
اس مہم میں جو کتب میں ڈال کر ساتھ لے جاؤں۔ مگر طبیعت ایک دم
چاٹ سی ہو گئی۔ جی۔ اس شکر فی کا پتے بھوں، کھنی پکوں کی بچل
نے مجھے ایک دم ٹپک کر دیا تھا اور اس وقت میں اپنے آپ کو
بے حد احمق تصور کر رہا تھا کہ میں نے جاتے سے اس کا آثار نہ
کیوں نہ حاصل کیا۔ میں اپنی موٹر بائیک کو اشارت کر رہا تھا کہ
مسز احمد اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھاتی ہوئی میرے سر پہ پہنچیں۔
"بہت شک ہے جو تے جارہے ہو نوید، دیکھو ایک بات کا
خیال رکھا کرو۔ یہ ناک ٹوکیاں بعض اوقات اپنی جوتی بھی اتار
لیتی ہیں۔" مسز احمد نے اشارت سے کہا۔

"اوہ ڈیم! میں نے غصے سے کہا اور موٹر بائیک،
اشارت کر کے ہوا ہو گیا۔

مگر اگلے روز عجیب اتفاق ہوا میں اسکیننگ ہال میں کوچ
پر نیم دراز میسر کر دیکھ رہا تھا کہ اس کی سیل کی کھٹ کھٹ پر
چونک گیا۔ وہ اپنا پرس بھلائی ہوئی آ رہی تھی۔ آج تو وہ اور بھی
آفت لگ رہی تھی۔ سیاہ لینن کے سوٹ پر سندھی براڈ کام تھا
اور آج اس نے بال کھولے ہوئے تھے۔ مجھے تو اسے دیکھنے ہی
کوئی افسوس یاد آگئی۔ میں اس سے ایک دم صدمہ شوروں گیا۔
"اے نوید یہ روکی تمہیں مشرود مار ڈالے گی؟" میں اس سے
خوفزدہ سا ہو گیا۔ آج دوسری ہی بار سے دیکھ کر میری جوجالت
ہو رہی تھی میرے جیسے عاشق کے لئے بڑی عجیب بات تھی
بلکہ اہوئی بھی۔

"ہیلو" وہ میرے نزدیک سے گزری تو میں نے میسرور
ہشائے ہوئے بڑے احترام سے اسے پکارا
"اوہ!" اس نے ہاتھ پر نشان ڈالے تو مجھے دیکھا
"آج پھر تو اس کوچ سے نہیں ملے گئے ہیں؟" اس
نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ کل کی چوٹ کافی ہے۔" میں ہنس دیا۔

”کیا واقعی آپ کو کل چوٹ لگی تھی؟“ وہ حیرت سے بولی
 ”ہاں“ میں نے مصمصیت سے کہا
 ”کہاں؟“

”یہ دیکھئے“ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا تو وہ
 ایک دم بلن کر گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سخت غصے میں پڑ گئی۔
 ”تو کیوں کہتے ہیں آپ کے یہاں ٹیکٹ ہے۔ وہ تو مجھے کل
 ہی آپ کے دیکھنے پر اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ واقعی یہود
 آدمی ہیں؟“ وہ بالکل ہی آؤٹ ہو رہی تھی۔ اوسر میں سخت زوٹ
 ہو رہا تھا کہ آخر میں اٹنا بالوں کیوں ہوا جا رہا ہوں اس کے پیچھے
 کہ بن موچے سمجھے بکے جا رہا ہوں۔

”دیکھئے سنیں تو“ اسے جاتا ہوا دیکھ کر میں نے اسے ولنا
 چاہا۔

”بھلا میں جائیں آپ اپنی چوٹ سمیت؟“ وہ غصے سے
 بولی اور جلی گئی۔

کافی روڈ گزر گئے۔ وہ پھر نہ ملی۔ جولی کے ساتھ گرم گرم ہاتھ
 کرتے اور لمبے قہقہے لگاتے ہوئے وہ ضرور یاد آئے۔ نکستی۔ وہ
 جو مجھے بے حد متاثر کر گئی تھی۔ کبھی کبھی ڈانٹنگ فلور پر جولی کے
 ہمراہ رقص کرتے ہوئے جب میں اس مہ جبین کے تصور میں
 کھوئے لگتا تو جولی ہنسنے لگاتی۔

”کیا بات ہے نوید۔ کوئی یاد آ رہا ہے؟“

”ہاں“ میں بالکل تجویز کی طرح آکر وہ ہو جاتا۔

”کون؟“ جولی چونک جاتی۔

”ایک لڑکی۔ نازک اور پیاری سی“

”کہاں رہتی ہے؟“

”یہاں“ میں اپنے دل کی طرف اشارہ کرتا تو جولی جھٹ

مجھ سے الگ ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی اُڑنے لگتی
 اور پھر ڈانٹنگ فلور پر اس کے قدم اٹھنے سے انکار کر دیتے۔
 مجھے پتہ تھا کہ جب سے میری دوستی جولی سے ہوئی ہے وہ مجھ پر
 اپنا حق سمجھنے لگی ہے اور میرے خیال میں یہ اس کی طاقت تھی۔

کیونکہ میں نے اپنے رویے سے اسے یہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ میں
 اسے پسند کرتا ہوں یا مجھے اس سے کوئی لگاؤ ہے۔ مجھے اس کلب
 کو جوائن کرنے دو سال ہو گئے تھے۔ میں یہاں کا محروم اور نڈھال
 ممبر تھا۔ خاص طور پر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔ مگر میں ان سے
 ایک لمٹ میں نے بڑے سنا رہا تھا۔ اگرچہ عورت میرے نزدیک
 بہت معمولی اور اراذل جنس تھی مگر میں نے اپنے وقت کو کبھی مجروح
 نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کلب میں بسنے سے تین

معا شقے بھی لڑائے جس کی ایک کڑی یہ چولیا ناوا کر گئی تھی۔

سانولی سلونی بہت جذباتی سی جولی۔ جسے میں پہلے ہی روز جان
 گیا تھا۔ چاہتا تو اسے سمجھنے کے بعد اس سے ملتا ہی نہ مگر ایک دوست
 کی حیثیت سے وہ مجھے پسند تھی اور پھر وقت گوار کی کے لئے
 بھی تو کوئی لڑکی ہوئی چاہیے تھی نا۔ اپنی کڑشتہ گرل فرینڈ کے
 نام بھی مجھے دھنک سے یاد نہ تھے تھے۔ مگر یہ لڑکی۔ یہ بھڑکی
 اور غصیلی لڑکی جائے کیوں میرے حواسوں پر جم کر رہ گئی تھی۔

اس دن رخصتے میری سیٹ ہو گئی کہ میں اپنے اسکیٹنگ
 کوچ جمیل اشرف کو آسانی سے راسکٹا ہوں۔ رضائے خلیل صاحب
 کے کان میں یہ بات چھونک دی کہ میں ایسی برکیں مار رہا ہوں یا جولی
 وہ فوراً مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ہم لوگ ہال میں گئے
 کلب کے کافی ممبر بھی دیکھنے آئے تھے۔ اوسر میں سجان کو جی
 بھر کے کوس رہتا تھا جو جکل نہ جانے کہاں غائب تھا میں نے
 رضائے سے کہا کہ فوراً فون کر کے اسے بلائے۔ رضائے بتایا کہ وہ
 لاہور گیا ہوا ہے۔ میں اس کی دعاؤں کے بغیر مقابلے میں شریک
 نہ ہونا چاہتا تھا۔ مگر اب مجبور ہو رہی تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کی مجھے قوی امید تھی۔ میں مقابلہ جیت
 گیا تھا۔ جمیل صاحب نے مجھے خوب بکب کیا۔ باقی لوگوں نے
 تہنایاں سجائیں۔ میں نے تابیوں کی کوچ میں سب لوگوں کی
 طرف دیکھا تو بیچ میں وہ ممبر ہیں وہ دشمن جان بھی نظر آ گئی
 لحظہ بھر کو نظر مٹی تو میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں عجیب سی
 کاٹ تھی۔ میں خشک گیا تھا اس لئے فریش ہونے کے لئے باتھ روم
 میں چلا آیا۔ وہاں سے نکلا تو باہر جولی میری منتظر تھی۔ اس نے
 مجھے جلدی سے پٹاکر میرا دایاں رخسار چوم لیا اور مجھے تینے
 کہ مبارکباد دی۔

”افوہ“ میں فوراً ہی اس کو درلے کی زبیں آگیا جس پر
 انسان کا ایمان بھی ڈگدگاتا ہے اور پھر میرے سامنے تو
 ایک خوب جوان لڑکی تھی جس کے جسم سے خوشبو کا سیلاب بڑی
 ساتسوں میں گھل رہا تھا۔ میں نے جولی کو قریب کرتے ہوئے
 شکریہ کہا۔ وہ ایک کمزور لمحہ مجھ پر فتح پا چکا تھا اور میں نے
 ساتھ جولی اظہار کرنے بھی لگا تھا کہ میری نظر سامنے ڈھکی والی
 کے سر سے پروہ کھڑی تھی اور بڑی دوزیدہ نظروں سے لگے کچھ
 رہی تھی۔ میں ایک دم بوکھا لگا۔ میں نے جولی کو اپنے تالک
 کیا اور تولیے سے بال خشک کرنے لگا۔ جولی نے حیرت سے
 مجھے دیکھا۔

”اوہ ہاں جولی رضائے میں ڈھونڈ رہا تھا؟“ میں بولی

کو یہاں سے بھگانا چاہا۔

”رخصا کو کوئی کام ہے مجھ سے؟“ جولی نے پوچھا۔

”ہاں شاید“

”تو پھر میرا بھی چلو نا نوید“ جولی نے میرا ہاتھ پکڑا۔

”جولی! آئی ایم ڈی کی ٹائرڈ۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو“ مجھے زندگی میں پہلی بار جولی کی ہاتھ پکڑنے والی حرکت ناگوار سی لگ رہی۔ اگرچہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جانے کیا ہوتا رہا تھا۔

”اچھا۔ جولی میرا ہاتھ تھامو ڈوبکھر کر چلی گئی۔ جولی کے جانے کے بعد میں اس کی طرف دیکھا۔

”مہیلو“ میں نے خوشنوازی سے کہا۔

”ہوں“ وہ لا پرواہی سے صرف ہوں کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے مبارک باد نہیں دی آپ نے؟“

”ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ شخص نہیں کی۔ ویسے چند دنوں کی پریکٹس سے آپ کافی ماہر ہو گئے ہیں۔ اس کے بچے میں طنز تھا۔

”ہاں مجھے خود بھی امید نہ تھی“ میں شرمندہ سا رہ گیا۔ ”کیا واقعی آپ کو اسکیننگ کرتے ابھی چند دن ہیں؟“

”اس نے تنک کر پوچھا۔

”آپ مجھے کیا جتنا چاہا رہی ہیں؟“ آخر میں نے صاف

گوئی سے پوچھ ہی گیا۔

”در اصل میں حیران ہو رہی ہوں کہ کہاں تو آپ گرتے

پڑتے پھر نہ سٹے اور کہاں یہ عالم؟“

”بھئی شوق اور محنت کا بھی تو دخل ہوتا ہے اور پھر مجھے ان ڈورنگز کا بہت شوق ہے اور میں ان میں بہت ماہر

بھی ہوں“

”ہاں مجھے اس کا اندازہ ہے۔ ابھی اپنی آنکھوں سے میں

اس کا مظاہرہ دیکھ چکی ہوں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کون

کون سے کیبل کیبل لیتے ہیں؟“ وہ بہت بڑی بات مجھے آسانی

سے کہہ گئی۔ میں جی ہی میں کھولی کر رہ گیا۔ مگر ابھی مجھے میرے

اپنے تھے۔ بسا پیرے سالے پڑی تھی اور بازی کو جانا ابھی باقی

تھا۔ اوپر سے وہ زمین جاں مجھے بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

”دیکھیے آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں؟“ میں نے اپنی طرف اشارہ

کیا۔

”یہاں کچھ کہنا چاہا۔“

”ایسا کوئی تذکرہ میں نے آپ سے نہیں کیا“ اس کا

بوجھ بہت سہاٹ تھا۔

”یہ تذکرہ نہیں تو کیا ہے؟ آپ مجھ پر بھی چوٹ کر گئی ہیں۔“

”یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے مجھے چوٹ کرنے

کا حق کہاں پہنچتا ہے؟ ہاں البتہ یہ سب مظاہرے انسان تھائی

میں بھی تو کر سکتا ہے۔“ وہ بڑے کیلے لیے میں بولی اور تب

ہی سامنے سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ تو وہ بھاگ فی

اور میں اس کی مزید ڈانٹ سننے کی حسرت دل میں ہی بٹ رہ گیا

اب کی بار وہ مجھے سنیک پار میں ملی میں اور جولی بیٹھے

کوک اور سینڈ وچ کھارے تھے۔ میں نے کوک کی بوتل منہ سے

لگائی اور سامنے نوز وچیل روکیوں کے اس گروپ کو دیکھنے لگا

جو غالباً کسی بحث میں ملندہ آواز سے گفتگو کر رہا تھا۔ ان کے

درمیان وہ بھی تھی مگر بہت سنجیدہ اور دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی۔

میرا دل جل کر رہ گیا۔ کاش میں اسے کوک اور سینڈ وچز

آؤ کر سکتا۔ وہ بلیکس کی چمکین بھٹکائے اسی طرح دھیرے دھیرے

مسکراتی رہتی اور میں خوب رویا منہ بھارتا۔ میرے دل میں حزنوں

کا طوفان اُٹھ آیا میری بہکتی ہوئی نظروں کا اثر ہو گیا کہ اس

نے پل بھر کو میری طرف بڑے غصے سے دیکھا اور منہ پھر لیا غالباً

وہ مجھ سے بے حد اذلاں تھی۔ مگر میں نوید تھا۔ میں نے آج تک منزل

عشق میں کبھی قدم چھپے نہ ٹلے تھے اور یہاں تو نظروں کا معاملہ

تھا اور بھلا نظروں پر کس کا اختیار ہوتا ہے میری دعائیں اس

تک تو رنگ لائیں کہ جولی چلی گئی۔ میں ابھی کہ روکیوں کے اس گروپ

کی طرف آ گیا۔

”مہیلو بی۔ ہائے نوید“ سب روکیاں مجھے دیکھ کر

کھلکھلائیں۔ میں ہمیشہ سے اچھی زندہ دلی اور شاندار پرسنلٹی کی

بنیاد رکھوں میں بے حد مقبول رہا تھا مگر اس لمحے کی صورت حال

مجھے ڈر سا دیا۔ اس مہم میں کے سامنے جولی بھرپور نہ

دے رہی تھی میرا پریشانی مضبوط ہو گیا تھا

”ہائے گزرتے ہاؤ آؤ ہو؟“ میں نے سب سے کہا۔

”ویری فائن“ کا دیر نے کہا۔

”گڈ“ میں نے جواب دیا۔

”اے نوید بیٹھو نا کیا کھڑے کھڑے ہی باتیں کرو گے

جھیلہ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ان سے ادھر ادھر کی کپ ہو رہی

اس دوران وہ بے حد تعلق سی۔ یہی تھی مجھے ان سب روکیوں

پر غصہ کیا جو میرا تعارف بھی اس سے نہ کر رہی تھیں۔ دوسری

طرف میں بھی یہی پوز کر رہا تھا جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

”آج کل تو مزید اسرار ہو رہے ہو نوید کیا بات ہے

”ہوں“ میں نے اسے دیکھا۔ کجخت نے اس ساری

میںٹنگ کے دوران ایک بار بھی تو مجھے نہ دیکھا تھا۔

”آپ کلب میں باقی کیوں نہیں دینا چاہتیں۔ میرے دوبارہ سوال کرنے پر اس نے پہلو بدل کر مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔

”درہل مجھے یہاں کا ماحول پسند نہیں ہے“

”تو پھر آپ یہاں کیوں آتی ہیں؟“ مجھے اس کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ باقی گزرنے سے بھی توری چڑھائی تھی۔

”وقت گزارنے کے لئے“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا

”عجیب بات ہے جس ماحول کو ناپسند کیا جائے وہاں

وقت کیسے گزارا جاسکتا ہے“

”کسی ماحول سے بچوٹے کرنے اور وہاں اپنے آپ کو

اس رنگ میں رنگنے میں بہت فرق ہوتا ہے مشر نوید“ وہ

بڑے تنکھے لہجے میں بولی۔

”اوہ“ مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ ماحول کچھ بد مزہ سا

ہو گیا تھا۔

”میں اب حیلوں گزرو“ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی نے دیکھا

اس کی آنکھوں میں کوئی جذبات نہ تھے بلکہ بولوں لگ رہا تھا جیسے

وہ ان باتوں سے یور ہو رہی ہو۔ مجھے اس لمحے وہ بہت کنزرویٹو

سی لگی۔

”اے روکنا“ ناویہ نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں آئی ایک گینگنگ لیٹ“ اس نے ناویہ سے کہا اور

میرے قریب سے گزری۔

مجھے تب اپنے آنکھ میں لگی مدن مست کی سیلی یاد آگئی

جب میں اس کے قریب سے گزرتا تھا تو عجیب سی طمانیت محسوس

ہوتی اور اب جو وہ میرے قریب سے گزری تو ویسا ہی لگا۔ (رہ گیا)

اے بھول کر اب دوبارہ کپ لگانے لگی بقیں۔ شامی کبابوں اور

کوک پرائفٹوں نے مجھے خوب بکب کیا کہ میں پہلے سے زیادہ

اچھا اور سخی ہوتا جا رہا ہوں۔ مگر اس سے میرا دل رورہا تھا

میرے دل کے آس پاس اس کا سیاہ آنچل منڈلا رہا تھا۔ میں

اب کیا کر سکتا تھا۔ اس کی خاطر میں جوگ نہیں لے سکتا تھا۔

پتھر نہیں کوٹ سکتا تھا۔

میں صرف اس کا تعاقب کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پیچھے

بھاگتے بھاگتے آج میں نے فراخ دلی سے ڈیڑھ سو روپے اور

فضول لواظوں پر خرچ کر دیئے تھے۔ اس پر بھی وہ مس سے مس

نہ ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی میری ضدنی جارہی

وہ اس کے بعد کتنی بار مجھے ملی۔۔۔ میں نے کبھی نہ

کوئی چکر ہے؟“

”ہاں بہی سمجھ لو“ میں نے منہں کر اس کی طرف دیکھا۔

”ابنی تھنک مسر“ میرا میرے سر پر کھڑا تھا میں نے

کچھ سوچا اور پھر ان سب لوگوں کے لئے شامی کبابوں اور کوک

کا آرڈر دے دیا جس پر انھوں نے بے حد تائیاں بجا لیں۔

”یو آر لے کر سیٹ میں نوید“ سمجھو نے میرے آگے ہاتھ

بچایا۔

”بہت پڑانی خبر ہے جو بی بی“ میں منہں پڑا۔

”ہاں بھئی سناؤ آج یہ گروپنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے“

میں نے دونوں بازو متحرک کر کے کہتے ہوئے عین اسی

آنکھوں میں جھانکا۔ لحظہ بھر کو وہ بڑی سی ہو گئی اور ادھر ادھر

دیکھنے لگی۔

”ان کے سلسلے میں“ ناویہ نے اس کی طرف اشارہ کیا

میں نے زہر لے دیکھا۔

”پہلے تعارف کرواؤ نا ناویہ“ سمجھو نے کہا۔

”اوہ سوری“ ناویہ منہں پڑی۔

”جیسی نوید یہ میں ہماری اچھی سی ساتھی مریم احسان۔

اور مریم ایہ نوید ہیں۔ کلب کے سینئر ممبر بہت بہت نہیں مکھ اور

زندہ دل انسان ہیں“

”زندہ دل نہ کہو ناویہ“ میں نے شرارت سے کہا۔

”کیوں؟ آپ کے دل کو کیا ہوا؟“

”مگ ہو گیا ہے کہیں میں نے بسیا ختم کہا اور مریم کو دیکھنے

لگا۔ اس کا نام اس پر کس قدر سوٹ کر رہا تھا۔

”تو تمہارا دل بھی تم ہو سکتا ہے نوید“ سمجھو نے منہں کر کہا۔

”کیوں؟“

”بھئی ہر وقت تو تم متبھیلی پر دھرے پھرتے ہو“

”الزام مت لگاؤ مجھ پر۔ پہلے ہی لوگوں کے تاثرات میرے

بارے میں فضول سے ہیں۔ اب تم تمام گزرتاؤں میں نے کسی کو

دل دیا؟“ میں سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ سی تو افسوسناک خبر ہے“ ناویہ نے سینے پر ہاتھ

رکھ کر کہہ پھری تو سب منہں پڑیں۔

”بہر حال دل کی جانے دو۔ ہم لوگ بتا رہی تھیں کہ تم یہاں

مریم کے سلسلے میں اکٹھی ہوئی ہو۔ تو کیا سلسلہ ہے بھئی؟“ میں نے

براہ راست اسی سے سوال کر دیا۔

”بھئی مریم کی میسویں سال گزہ ہے اور یہ چاہتی ہے کہ

ہمیں گھر میں پادشہی دے دے جیکہ ہم لوگوں کا اصرار ہے کہ کلب میں؟“

بال صرف اس سے اظہار محبت کے لئے الفاظ ڈھونڈتا رہتا۔
دوسری طرف میراچہم۔ میرا عزیز دوست سبحان ابھی تک نہ
لوثا تھا۔ سبحان میرا بچپن کا دوست تھا۔

میرے سے بالکل مختلف۔ دُلا تھا اور اس سبحان۔
جس کی طبیعت میں یہ حد سادگی تھی اور جو میری ہر بات
کی ضد تھا۔ مگر میری اور اس کی اتنی بچی دوستی تھی کہ لوگ حیران
رہ جایا کرتے تھے۔ اس وقت مجھے اس کی کئی بری طرح محسوس
ہو رہی تھی۔ کیونکہ اپنے ہر معاشرے کی داستان میں اسے بری فیصل
سے سنا کر اپنے دل کے پھیموے چھوڑا کرتا تھا۔

مجھے بہتہ تھا کہ سبحان کو لڑکیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں
ہے۔ مگر میری اس اور اس کی بیوہ مجھے کبھی نہ لوثتا۔ بلکہ خوب ہنسنا
کرتا۔ میں روزانہ باقاعدگی سے گالیاں نکال رہا تھا مگر اب
میرے پاس گالیوں کا اشتاک بھی ختم ہو جایا رہا تھا۔ دو دفعہ نکل
کوڑوں کیا تو پتہ چلا کہ وہاں بھی مزید بندرہ میں روز رہے گا۔
اور میری بری حالت تھی۔ میں نے پتہ زیادہ کر دی تھی۔ جونی
لکنا ہی چننا کرتی کہ میں ابھی صحبت برپا دو کر رہا ہوں مگر میں کیا
کرتا۔ اس دشمن جان کے قصور سے فرار کی کوئی اور صورت
مجھے نظر نہ آتی۔

میں اسے جس قدر بھولنے کی کوشش کر رہا تھا وہ مجھے
انتہائی جیکے جاری تھی اور پھر یہ میرے ساتھ ہو رہا تھا تو یہ کرام
کے ساتھ جس کے آگے لڑکیاں بھی رہتی تھیں۔ دوسرے میں
اپنے والدین کا بے حد لاڈ رہا تھا۔ بچپن سے میری جبلت میں
یہی سما گیا تھا کہ جس چیز پر دل آئے اسے حاصل کر لوں اور اب
تک کوئی ایسی چیز نہ تھی جو پسند آئی ہو اور ملی نہ ہو۔

مگر میرے یہ احسان
مجھے یاد ہی کیا کیا کہ کرتے تھے اپنی پسند کو بھجھوڑو۔
چاہے تمہیں اسے خراجا پڑے پھینا پڑے یا کچل کر حاصل
لے لیا پڑے۔

گویا اب میرے لئے یہ بین راہیں تھیں۔
اسے فوجیوں جھین لوں یا کچل دوں۔
بین راہیں تھیں جو سب کی سب منفی ہی تھیں۔ مگر میں
باکرتا۔ موائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔
میں تھا میرا جنون تھا میری راہیں طویل ہو گئی تھیں
زور دو پہری اور اجازت نہ تھی تھی تھیں۔ میرا کسی بھی
زمین میں دل نہ لگتا تھا۔

آخر ایک روز میں نے دل سے آخری کوشش کی اجازت

لی اور اسے خالی میز پر بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ سامنے
ڈائن ہو رہا تھا۔ رضا جونی کے ہمراہ تلچتے ہوئے مجھے بڑی
شریفانہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”ہیلو“ میں نے بے حد سلیقے سے اسے ”ہیلو“ کہا۔
”اوہ“ وہ جانے کس سوچ میں تھی کہ چونک ہی گئی۔
”آپ کیسی یہاں کیوں لگتی ہیں۔ دیکھئے تنہا خوبصورت
گالے اور گنا دکش میوزک۔ آئینے جلیں ڈائن کرتے ہیں“
”مجھے ڈائن پسند نہیں“ اس کا ہنر ہنسنے کی طرح سناٹ
تھا۔

”کرنا یا دیکھنا؟“ میں نے بات کرنے کے لئے سارا کہا۔
”دونوں ہی صورتیں“ وہ میگو جو جس کے سب سے بڑی
تھی۔ اس وقت مجھے اس پر تھوڑا سا افسوس بھی ہو رہا تھا کہ
اسے کہ از کم مجھے ہی جوں آؤ کرنا چاہیے۔ میں نے وسلسلہ
شروع کر دی۔ اپنے پسندیدہ گانے ”کئی دنوں سے مجھے کوئی پسند
میں“ یہ ویسٹنگ کرتے ہوئے میں بے حد جذباتی ہو گیا۔
”آج کا موقع آخری ہے نوید۔ یہ مجھے مت کھونا اور نہ
پھر بچتا دوگے“ میرے دل نے سرگوشی کی۔

پرسکے اس کے نازک سے گلابی ہاتھ پیرا پنا ہاتھ رکھ دیا۔
”تم مجھے ہمیشہ غلط سمجھتی رہی میرم۔ مگر یہ سب
کچھ کہنے کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ رہا ہوں
کیونکہ جھٹوں کے اظہار پر آج تک کوئی بندہ نہیں باندھ سکا
ہے۔ آئی سوئی میرم۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں“

میری آواز میں لڑکھارٹ تھی۔ جانے کون کون سی
لڑکیاں میری زندگی میں آکر جا چکی تھیں۔ میں نے بار بار اظہار محبت
کیا تھا۔ مگر یہ... میں ابھی دوس تھا ہی کہ اس نے تیزی سے
اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کے نیچے سے گھسیٹا اور میرے منہ پر جڑ دیا۔
میں ایک دم اٹھ ہو گیا۔ قریب میزوں پر بیٹھے لوگ ہمارے
طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”اوہ بوڈو! اٹھو۔ مجھے امید تھی کہ تم یہ حرکت ضرور
کرو گے۔ مگر تم مجھے بالکل غلط سمجھو۔ یہاں کلب میں تمہارے
مطلب کی بہت سی لڑکیاں موجود ہیں؟ وہ سخت طبق میں
تھی۔ میں اتنے لوگوں میں اپنی اسلٹ ہونے کے خیال سے
خوف زدہ ہوا جا رہا تھا مگر میرا اندر رکھول رہا تھا۔

”تم اپنے آپ کو اتنی پارسا اور مجھے اتنا غلط کیوں سمجھ
رہی ہو میرم؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔

میرے سامنے مریم احسان تھی میری قاتل۔ جا دو گرنی اور ظالم لڑکی۔

جو میری تمام تکلیفوں کے باوجود مجھے بے حد شرم لگتی تھی میں نے پھر اسے دیکھا۔ سادہ سے شلوار قمیض میں وہ کتنی پیاری اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو ہراساں ہوئی۔ مگر تب ہی اس کے چہرے پر وہ خود بخود اور نمکنت دایں لگی ہوئی اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔
 "ہوں۔ تو یہ اتنی بارساڑ کی اس سنسان علفیہ میں کھڑی کس بات کی منتظر ہے۔" میرے لہجے میں کڑواہٹ کھل گئی۔

"آپ چاہئے۔ مجھے آپ سے مدد نہیں لینی۔ وہ منہنی سے بولی۔

"اوہ تو یہ عذریہ میرا دل چاہا ہاتھ میں پکڑا جا سکے اسے جڑوؤں۔ مگر یہ کوئی موقع نہ تھا اس سے انتقام لینے کا۔ مجھے آپ کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ رات بھر کھڑی رہی۔ ہوسکتا ہے کوئی گاڑی ٹھیک کرنے کے لئے اس پارسانی کے بھرم کو ہی چور کر جائے۔" میں نے کرکیک انداز میں کہا اور گھوڑے کو موڑ لیا۔ دس منٹ بعد میں اسٹیٹ میں تھا۔ بڑے ابلے ملازموں کی فوج باہر بڑھی تھی۔ میں نے حیرت سے ان سب کو دیکھا اور تب ایک لپکا میرے ذہن میں کودا۔ وہ سب مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے راجہ اور اس کے دو ساتھیوں کو لپکایا اور مریم کا بتا کر کہا کہ کسی طرح سے اسے یہاں لے آؤ۔ راجہ اور اس کے ساتھی ہمیشہ بڑے ابلے ہی کام کیا کرتے تھے۔ لحظہ بھر کو وہ بھی کپے لگ کر میری جیب سے لٹکے ہوئے سُرخ نوٹوں نے انہیں کچھ سوچنے ہی نہ دیا۔ وہ چلے گئے اور میں بڑے کمرے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ جڑی اسی کو میرے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ ملاقات میرے اوپر جنون سوار تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ لوٹ گئے مگر مریم کے بغیر۔ انہوں نے بتا دیا کہ وہاں نہ گاڑی ہے۔ نہ وہ مختصر مہر۔ یہ ایک اور مانت ہو گئی تھی مگر صرف مہلاریا۔ کہ ابھی تو بہت سے موقعے بڑے ہیں۔

مگر تقدیر نے اور کوئی موقع نہ دیا۔ اگلے روز بالان اکبر۔ میں اس سے لپٹ کر تھر تھکا دو دو با۔ اس نے مجھے سارا دروازہ سنائی اور میں نے اسے جتنا سمجھا کیا تھا سب کہہ رہا تھا۔
 "تو تو اور بھی زیادہ سہارا ہو گیا ہے تو یہ تو بڑی بھلی

"ہم گے ایک لفظ بھی نہ بولنا۔ میں چوں نا اس جو نا دیا یہ نہیں ہوں کہ تھپادی فریضی محبت کے دھوکے میں آؤں۔
 "آئی ٹیٹ ہو، وہ پاؤں پھینکتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے نازک جوتے کی ٹھٹ ٹھٹ میرے ذہن پر پھوڑے برسائے گئی۔ اس کے زہریلے الفاظ میں میرے کانوں میں گونج رہے تھے "اسے توڑ ڈالو نوید!"

میرے ذہن کی منہنی سوچ نے آج فتح پائی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت بچا پرکار رکھا تھا۔ مگر وہ نوبال کل الٹ جا رہی تھی۔
 "اسے پکچل ڈالو نوید۔ اتنا مسلوک اس کی پہچان بھی مشکل ہو جائے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ نوید نہیں پکچل دے گا۔ اور ایک دن اپنے من کی پیاس بجھانے کے بعد نہیں ضرور تھکے گا کہ نوید جس چیز کو پسند کرتا ہے اگر وہ اسے نہ ملے تو اسے توڑ دیتا ہے۔" میرے اندر کے شیطان نے آج فتح پائی تھی آج تک مجھے کسی نے یوں ذلیل نہ کیا تھا۔ اور پھر اس سمرلی ماری کی نے نہ صرف مجھے ٹھکرایا تھا بلکہ مجھے ذلیل بھی کر دیا تھا۔ اس دن میں شام کو اپنا تانکہ لے کر قریبی گاؤں کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ کبھی میرے بڑے آبا کی اسٹنٹ تھی مگر اب ایسا خاصا شہر سا۔۔۔ ہو گیا تھا۔ تانکے کا فنجے بچپن سے شوق تھا۔ اتنے گاؤں میں مجھے یہ خوبصورت گھوڑا لے دیا تھا میں کافی عرصے تک اس پر رائڈنگ کرتا رہا۔ دل بھر تو یہ خوبصورت تانکہ بنا لیا۔ اپنی شیوہ رلیٹ اور سوزو کی کار کو چھوڑ کر میں ہمیشہ تانکے کا سفر کرتا۔ میرا تانکہ بہت خوبصورت تھا۔ دور سے بھی لگتی۔ اس دن میں ویسٹنگ پر گیا ہوں پیار ہے۔ لگنا تا ہوا بڑے آبا کے کھڑکی طرف جا رہا تھا۔ میرے سفید گھوڑے کی رفتار بہت تیز تھی کہ ٹرک کے کلمے کھڑکی گاڑی کے ہمراہ لہرتے دھاتی آہٹوں کو دیکھ کر بالکل سبے ہاتھوں میں تھر تھرا گئیں۔

"ناؤ ہی لے میں نوید۔" میرے دل نے تنبیہ کی تو میں سیدھا ہو گیا۔ مریم کے مارنے کے بعد میرا دل عموماً مجھے یوں ہی ٹوک دیا کرتا تھا۔ میں نے رفتار اور بڑھا دی۔
 "اے مسٹر! باریک سی آواز نے مجھے روکا۔
 "لو بھئی نوید! ایک نئے ہی لڑکی خود بخود نہیں بلا لگی ہے۔ میں نہیں دیا۔ مگر اس کی طرف آیا تو حیران رہ گیا۔ یہ دھاتی آہٹوں کا سا پلے ہی لگا تھا۔

کا کیا حال ہے؟“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔
”پتہ نہیں۔ میں کافی روز سے کلب نہیں گیا۔“

”اے تو تو کہاں رہا۔ اور اسی جان بھی تجھ سے سخت ناراض ہیں۔ میرے بعد تو نے میرے گھر کی بھی خبر نہیں لی۔“
”اوہ دینی سوری سجان۔ دراصل میں پچھلے دنوں کچھ بیمار سا رہا ہوں۔ میں نے شرمندہ ہو کر کہا، اس مرحلے کے چکر میں تو میں نے واقعی سب کو بھلا دیا تھا۔ اور ہر سجان کا گلہ بھی درست تھا۔“

”سوری مجھے نہ بول تو۔ اب اتنی جان ہی تجھ سے نہیں گی۔ ان کو سوری بولنا تو پتہ چلے گا۔“ سجان نے کہا
”اے ہمارے خاں جان تو نے اُن ہیں۔ دیکھنا ناراض ہونے کی جگہ کتنے پیار کر رہی گی۔“

”اچھا میں چلوں۔“ سجان نے رست واضح دیکھی۔

”آج بڑی جلدی میں ہو۔“

”ہاں۔ گھر میں میری پوری سال آئی ہوئی ہے۔ کچان لوگوں سے ابھی پوری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔“
”ہیں کیا واقعی؟“ میں اچھل گیا۔

”ہاں ہماری چھوٹی بہنیں منتقلی اور دھڑا آگئی ہیں۔ جب تک رہائش کا مسئلہ حل ہو گا وہ لوگ ہماری طرف ہی رہیں گے۔“
”کب آئے یہ لوگ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”میرے جانے سے بھی پہلے کے۔“

”اے تو بڑی مفید چیز ہے۔ یا میری بیگم تر گھر میں ہو تو میں باہر بھی جا سکتا ہوں۔ ایک یہ تو ہے۔“ میں جڑ گیا۔
”بھئی تو نوید ہے اور میں سجان ہوں۔ لہذا فرق کافی اتنا ہے۔“ سجان نے ہنس کر کہا اور میں لوٹ آیا۔

شام کو مجھے رضا نے بتایا کہ سجان کلب آیا ہوا ہے۔ اسے ڈھونڈنا ہو انیس کورٹ پہنچا تو وہ کسی لڑکی کے ہمراہ میل رہا تھا۔ میں قدرے حیران رہ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے چل پڑا۔ وہ میری احسان تھی۔

سلکون شلواری قبض ہیں بلوس۔ دو چٹیاں کپڑے پہن کر۔ میری نظریں پھر پہنیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس سے کبھی نفرت نہ کر سکوں گا۔ دلوں میں رہنے والوں کو محبت دی جاسکتی ہے۔

میں ایک طرف کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ تب ہی رض مجھے ہٹا دیا۔

”کیا دیکھ رہے ہو نوید؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔“

”جس اور اس کی اوٹیں۔“ میں نے بے رحمی سے کہا۔
”بی کیئر فل نوید۔ یہ میری اپنے سجان کی بیگم تھے۔ رضا منس بڑا اور ان کی طرف چل دیا۔ میرے کانوں میں سبسٹوڈل چکا تھا۔ تمام صداؤں کے مفہوم ختم ہو گئے تھے۔ نظروں کی نگاہیں چل کر گئی تھیں۔“

منہ میں اس قدر کڑوا سب سی کھل گئی تھی کہ جیسے مجھ سے میری کامیابی نہ ہو۔ نہ مفہم کیا جا رہا تھا اور نہ ہی میں اسے بھوک سکتا تھا۔ میں اتنا بڑول ہوا کہ وہیں سے لوٹ آیا۔ جیسے سجان ایک دم ہی برسا گیا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اس سے کوئی تکلیف پہنچی تھی مگر یہ سوچ، یہ وار جو وہ اگلے میں مجھ پر کر گیا تھا بہت کاری تھا۔ یہی جا پا پھوٹ پھوٹ کر دروازوں، مگر رو نامیری لغت میں شامل نہ تھا۔ اس لئے اس دن میں خوب پی بلکہ میں نے جولی کے ساتھ بہت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ جولی بہت خوش تھی اور اس نے مجھے اتنا پیسہ نہ دیا جیسا کہ میں نے تب میں نے سوچا اپنے مطلب کے لئے ہم کتنے سیلشن ہو جاتے ہیں جولی کو میری قربت چاہئے تھی اور اس نے مجھے ہر دہائی کر کے اپنا مطلب نکال لیا تھا۔

مگر میں ٹپ چکا تھا۔ بالکل ہی دامن سارہ گیا تھا میرے اندر کے نوید کے جاوے طرف جو جا رہا تھا جاری تھا اس میں میں لڑھکتا جا رہا تھا۔ کبھی پستیاں مجھے گھسیٹ لیتیں تو کبھی میں ابھرتا اور سوچتا مجھے سجان اور میری لوان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ تب پستیاں مجھے اپنی دلہن میں اتار لیتیں اور میں سوچنے لگتا تھا ان دونوں سے اتفاق دینا ہے۔

بہمیشہ کی طرح میری منہ سوچ جیت گئی۔ میں نے چپ کر دیا شروع کر دیا تھا میں کسی روز تک سجان سے بھی نہ ملا اور مختلف منصوبے بناتا رہا۔ مگر ایک دن جبکہ میں اپنی گاڑی کو ٹرن دے رہا تھا تو کتنا کا وہ سفید پلا میرے سامنے آ گیا جو میں گزشتہ دو تین روز سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں مگر وری آواز میں بھونکتا ہوا پلا بٹا لگا۔ میں نے ہارن دینے پر گڑی اس پر بڑھا دی۔ لمبی سی چیخ نکلا میں ہوائی اور پھر سسکیوں میں بدل گئی۔ میں نے گاڑی روکی اور واپس آ کر اس کی موت کا تماشا دیکھنے لگا۔ میرے قدموں کی چاپ پراس نے منہ اٹھا کر مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ میں غصہ بھر کر زور دے گیا۔ مگر اس کی موت کا تماشا مجھے بڑا چپ لگ رہا تھا۔

”اوہ!“ اس کی گردن ڈھلکتی ہی میں نے خوشی سے نعرہ لگایا تو کھنکھارنے کی آواز پر چونک گیا۔ میرے بالکل پیچھے سجان کھڑا تھا۔

”ارے تم؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ تم اتنے بے رحم کب سے ہو گئے ہو نوید؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ مجھے لفظ بھر کو اس پر غصہ سا آ گیا۔ مجھے اس وقت وہ بے حد بزدل لگ رہا تھا کہ اس کا رنگ زرد تھا اور ہوجھ پکھارہم تھا۔

”بہت پرانی بات ہو گئی ہے سبحان“ میں منہ پڑا۔

”نوید! اس نے مجھے شانوں سے تنہا کیا۔“

”نوید! تم ایسے نہیں ہو سکتے ہو نوید۔ مجھے بتاؤ تم نے اس مصوٰی کو کیوں مارا؟“ اس نے چیخ کر کہا۔

”اس کی موت کا تماشہ دیکھنے کے لئے“ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”اوہ۔ آئی ایم سو ری۔ میرا دوست اتنا بھی گر سکتا ہے نوید میں یہ کیسے مان لوں؟“

”شہر دو بھی ایک اور بچے کو سامنے آنے دو پھر میں تمہارے یقین کو مضبوط کر دوں گا“ میں کس قدر بے رحم ہو رہا تھا۔

”کیا؟“ وہ تقریباً رو دیا۔

”بے وقوف کیوں ہو رہے ہو نوید۔ میرے بعد آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ تمہارے خیالات میں اتنی زبردست تبدیلی آئی ہے“

”ارے جانے دو۔ اندر چلو۔ میں تمہیں چائے پلاؤں“ میں اسے اندر لے آیا۔ وہ کافی دیر میرے پاس رہا۔ مگر اس نے مجھ سے زیادہ بات نہ کی بلکہ جب میں سمجھ کر کھانا تو وہ بول چوک کر میری جانب دیکھتا جیسے مجھے پچھاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ادھر میرے دل میں بھی ایک گرہ لگ گئی تھی۔ میرا لہجہ بھی میرے جذبات کی چٹخی کھاتا رہا اور وہ بڑی خاموشی سے لوٹ گیا۔

”کافی دن میں یوں ہی آوارہ پھرتا رہا۔ وہ خود میری طرف نہ آیا میرے دل نے آخر خود ہی مجھے علامت کی تو میں اس کے گھر جا پہنچا۔

وہ سب لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سبحان کے ہمراہ بیٹھی مریم کو دیکھ کر میرے دل پر کرس سے چل گئے۔ آئی نے بھی دیکھتے ہی میرا منہ خا جو اود میری خوب مروت کی۔ انکل بھی کافی خفا تھے۔ ان لوگوں کا بے حد پیار دیکھ کر میں بہت شرمندہ ہوا۔

”اے مریم چائے بنا کر دو نوید کو“ آئی نے اسے کہا۔ میری نگاہیں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بڑی تیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”سہمی بی بی جانے بنا کر لا رہی ہے مانی جان“ اس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ میں سبحان کے پاس بیٹھ گیا۔

”تمہاری بھانجی بھی یہ“ سبحان نے کہا۔

”اچھی تھی“ میں صرف اتنا ہی کہہ رہا۔

”تم منہ میں گھنگنیاں ڈال کر آئے ہو کیا؟ میں گزشتہ ایک ہفتے سے مریم سے تنہا رات گزاری کر رہا ہوں۔ اسے تم سے ملنے کا بہت مشتاق ہے۔ مگر اب جبکہ تمہارا کام ختم ہوا تو تم کو گھر موئے بیٹھے تھے سبحان نے مجھے سگریٹ آفر کی۔ میں نے سگریٹ کے دھوئیں میں اپنی سوجوں کو ڈرانا چاہا۔

”تمہیں مریم ابھی سختی ہے سبحان؟“ میں نے نرم خوردہ لہجے میں کہا۔

”ہاں ظاہر ہے۔ میری منگیتر جو ہوئی۔ سبحان خوش دلی سے منہ دیا۔

”بیلہ سمجھی تم نے اس کے بارے میں ذکر نہیں کیا؟“

”میں پہلی بار ہی تو اس سے ملا ہوں۔ ہم لوگ بچپن میں ایک دوسرے سے مشوب ہو گئے تھے۔ تمہیں میرا پتہ ہی ہے۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ اب سوچتا ہوں۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”گو کیا“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”بھئی تم بڑے شیطان ہو نوید۔ ہم لوگ ابھی تو صرف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے گپ لگاتے ہیں۔ وہ بہت بڑبڑا اور سا وہ طبیعت کی لڑکی ہے“

”اوہ! میں نے گھنٹی سی آہ بھری۔

”شہر وہیں اسے بلا کر لاتا ہوں“ سبحان اٹھ کر چل دیا۔

”کے جانے کے پہلے پھر بعد ہی میں بھی اس کے پیچھے ہوں۔ میری نظر گھر میں گھر کے فرد جیسی حیثیت تھی۔ اس لئے کسی نے بھی مجھ کو سبحان کے پیچھے جانے کا فوٹس نہ دیا۔

”بھئی کیوں نہیں آؤ گی آخر تم باہر؟“

”مجھے تمہارا دوست قطعاً اچھا نہیں لگتا ہے۔ مجھے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے“

”لو بھئی تم نے ایک ہی ملاقات میں اس کے متعلق غلط لگا لے۔ دیکھو وہ میرا بہت عزیز دوست ہے۔ کیا سوچے گا وہ بارے میں؟“

”وہ سوچ اس کی اپنی ہو گی۔ لہذا مجھے مجبور نہ کرو“

”تم کلب میں لی نہیں بیٹیں اس سے؟“

”جلی تھی“

”تو پھر اس کے بارے میں اتنی غلط سوچ کیوں ہے؟“

”کیا تم نے ایسی کوئی بات دیکھی ہے اس میں؟“

”سبحان کی اس بات پر میں گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ پوری داستان سنا دے گی۔

خاتونِ دلہن ۱۲۶

”بس مجھے وہ پہلے ہی روز سے اچھا نہیں لگتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”افوہ۔ کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟“

”بس بعض لوگ اچھے نہیں لگتے نا؟“ وہ معصومیت سے بولی۔ میں تب پلٹ آیا، یہاں اس کے دل میں میرے لئے اس قدر نفرت نہیں کہ وہ مجھے فحش کرنے کو بھی تیار نہ تھی۔

”ارے نوید تو تمہیں کیا۔ تم اس دو ٹوکی کی نوید بلکے پیچھے کیوں ہلکان ہوتے ہو۔ تمہارا سے کتنے بہت اڑکیاں موجود ہیں۔“ میں نے ہنس کر سوچا تو نفرت کی ایک ٹھنڈی سی ابر میرے سراپے کو چھیدی ہوئی گزر گئی۔

میں چند منٹ آنٹی کے پاس بیٹھا اور لوٹ آیا۔ کلب جانا میں نے بالکل ختم کر دیا۔ جو لی کے فون البتہ مجھے دن میں بہن بارہ ریسو کرنے پڑے۔ وہ میرے پیچھے بولی ہوئی بارہی تھی۔ اس دور ان اس نے مجھ سے بدولی ہو کر اپنے کرن لٹ ے لگتی تھی کروالی تھی۔ میں نے بغیر ہنسنے ہی اسے مبارکباد کا ٹیکہ دیا تو وہ ٹیلیفون پر رہی رو دی۔

”سبحان عجیب کہتا ہے نوید تم باؤلے ہو گئے ہو جاک“
”لو بھی میں مبارکباد دے رہا ہوں اور تم مجھ باؤلا رہی ہو۔“ میں ہنس دیا۔

”یہ تم باؤلے ہی تو ہو گئے ہو نوید کہ وہ سب مجھے کھو ہے ہو جو میں نے اور تم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔“
”تمہاری شادی جب لگتے ہو جائے گی تو پھر ہنسنا کرو گی۔“
”دیکھو ہم دوست لے رہے ہیں ہمیشہ سے۔“
”لو۔ نوید ایسا نہ کہو میں ہمیشہ سے تمہیں پسند کرتی ہوں۔“

”تھینک جولی۔ مگر اب اس سلسلے کو جانے دو۔ آئی وٹن بیٹ آف ٹک۔“

”دل سے کہہ رہے ہو؟“

”ہاں بالکل یقین مانو مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ لٹ اچھا، اسرار اور مروڈ پرس ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش لگے گا۔“
”ہاں۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”اچھا بائے۔“ میں نے جلدی سے فون رکھ دیا اور جی نٹ پر کافی دیر تک منتظر رہا۔ اسی دوران رضا نے مجھے بتایا مان اور میرم آج کل اگلے کلب آتے ہیں اور شیش کورٹ کافی دیر تک کھیلے رہتے ہیں میں نے اس کی بات اڑادی۔ مجھے اپنے دوست سبحان سے بہت پیار تھا میں اس پر

جان بھی قربان کر سکتا تھا مگر دوسری طرف مجھے میرم کے منگیتر سبحان سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور میں اس کی شکل بھی دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اب بھی عجیب بات تھی کہ یہ دونوں ایک جیسے نام ایک ہی شخص کے تھے۔ اس نے میں آجکل عجیب کیفیت سے دو جا رہا تھا۔ میں ان دو بہنیوں کے درمیان ٹک رہا تھا بچپنوں اور نفرتوں کی کل صراط بہت نازک تھی۔ نہ محبتوں پر سے گزرا جا رہا تھا اور نہ نفرتوں پر سے۔ میں اسی کیفیت میں اڑکارا جبکہ سبحان میری طرف سے بے حجب چلن تھا۔ وہ دن میں بارہ دفعہ میری طبیعت پوچھتا۔ مجھے سمجھاتا۔ اقوال زیرین سمجھاتا۔ سنا۔ مجھ سے بہت پوچھتا کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میں کلب کا روح رواں ممبر لڑکیوں کے جھگڑے میں پھینکے والا عاشق۔ ایک دم انا بن کر اور لڑکیوں ہو گیا ہوں۔ میں اسے کیا بتاتا۔ وہ بوسے دن میرا دل پہلاتا۔ کبھی کسی منہاں بچہ دکھاتا کبھی کہیں کھانا کھلاتا۔ بلکہ بعض اوقات گھسیٹ کے کلب تک لے جاتا۔

تب مجھے اس پر لٹ کر پیار آتا۔ مگر تب کبھی مجھے میرم یاد آجاتی میں اس سے لڑنے لگتا۔

اس روز مجھے اس کا فون ملا۔ میں پلنگ پر اوڑھ لیا، اُداس گیتوں کے کیسٹ سن رہا تھا۔

”کہاں پڑے ہو؟“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”میں ریڈ میں ہنس دیا۔“

”چلو پھر یہ کرو میری طرف آ جاؤ۔“

”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے عزیز خانے پر۔“

”کیا کر رہے ہو؟“

”اپنی منگیتر کے ہاتھ کا جانا ہوا صلہ کھا رہا ہوں۔ چلے

آؤ تو تمہیں بھی کھلا دوں۔“

”منگیتر کا نام سن کر میرے منہ میں کڑواہٹ آگئی۔“

”میں صلہ نہیں کھاتا ہوں۔“

”جلد تو ویسے ہی چلے آؤ۔ ہاں دیکھو اپنی گاڑی لے آنا۔“

کیونکہ یہاں گاڑی لے گئے ہیں اور مجھے آج کسی کام سے جانا ہے۔“

”تم خود کیوں نہیں آ جاتے۔ گاڑی لے جانا واپسی پر۔“

”اوہ نہیں تم خود آؤ۔“

”اچھا۔“ میں نے ہار مان لی۔

ایک پل بھی رکنا نہ چاہتا تھا۔
 ”نہیں ہوی“ سبحان کی بات پر میں نے غیرت سے
 اسے دیکھا۔
 ”کیوں؟“ میرے لیے کی تنک پر وہ گڑا سا گیا۔
 ”وہ دراصل نوید آج میری طبیعت شکیب نہیں ہے
 فی الحال پروگرام کینسل سمجھو“
 ”فی الحال باہمیہ کے لئے؟“ میرے لیے کی کاٹ
 میری زبان میں گل گئی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ لرزہ رہ گیا۔
 ”شکیب کہہ رہا ہوں۔ اچھا میں جیوں۔ خدا حافظ“
 میں نے مزید پوچھی چاہیا اٹھائیں اور لوٹ آیا۔ میری گاڑی
 قلعہ اسپینڈر پہنچ گئی تھی۔ گریما میرا دوست سبحان آتے تھے
 سے بچھن کیا تھا۔ میرے ذہن میں اس ایک بات کے علاوہ اور
 کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ روکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ یہی
 محبتوں کے جادو جلا کر ہم سے ہمارے دوست بھی جھین لیتی
 ہیں۔ میرا دوست مر گیا تھا۔ اب صرف مریم کا مکینئر سبحان کے
 فہن میں رہ گیا تھا۔ اس لئے میں کبھی اس کی طرف نہ گیا۔ اگر
 کہیں وہ ملتا تو...
 بارے میں نہ...
 میں نے مریم کو...
 کی تلاش میں...

رہنا...
 پر اسٹے پائے جاتے ہیں بسبھی کسی رستوران میں اور کبھی کسی
 کلب میں۔
 اس روز میں ویسے ہی بھولی یادوں کو تازہ کرنے کے کلب
 جا رہی تھی۔ پہلے ملنے والی منرا احمد تھیں۔
 ”ارے ہئی پتہ ہو؟“ انھوں نے مجھے پٹالیا۔
 ”نہیں کوئی اور ہے۔“ میں سنس پڑا تو انھوں نے بھی میرا
 ساتھ دیا۔
 ”اور سب خیریت ہے نامنرا احمد؟“ میں نے شرارت
 سے پوچھا۔ پچھلے دنوں ایک بوڑھا کرل منرا احمد کے پیچھے ہاتھ دھو
 چوکیا تھا اور وہ اس حادثے سے سخت ہراساں تھیں۔ میں نے
 ہشکل کرل سے انہیں پچا یا تھا۔ ورنہ وہ تو اتنی پریشان ہو کر تھیں
 کہ انھوں نے کلب آنا ہی ختم کر دیا تھا۔
 ”تم سناؤ وہ تمہاری جولی بھی ایک دم کلب سے غائب
 ہو گئی۔“

”ہاں دیکھو فٹ رائٹ ہو کر نا بچ چکیں گے“
 ”ہوں“ میں بادل ناخواست تیار ہو گیا۔ ولی تو اجاٹ
 سا تھا۔ یہی تیاری میں کافی دیر لگ گئی۔ اس کے گھر پہنچا تو وہ
 نہ ملا۔ ڈھونڈنا ہوا لابی سے گزر رہا تھا کہ وہ مجھے مریم کے کمرے کے اندر
 جاتا ہوا نظر آ گیا۔ میں کچھ سوچ کر کڑا اور کان ادھر دھڑ دینے جانے
 کیوں بار بار میں یہ کیسی حرکت کرنے لگا تھا۔ جہاں وہ اور مریم ہوتی
 کرتے ہیں چھپ چھپ کر ان کی باتیں سنتا۔ شاید لا شعوری طور
 پر میرے دل میں چھپے چور کو یہ حرکت پسند تھی کہ مجھے ہمیشہ بڑبڑایا
 رہتا کہ مریم میرے بارے میں اپنے سارے تاثرات کہیں کسی دوز
 اس کے گوش گزار نہ کر دے۔ ولی ولی آوازوں سے مجھے پچھاندلا
 نہ ہو رہا تھا۔ میں اور دوزخ سے لگ گیا۔
 ”میں نے کہا ہے نا سبحان تم نوید کے ساتھ اب آتے رہ
 نہیں جاؤ گے“ میرے دل پر ایک بھاری سا پتھر گرنا۔ اس ناک
 سی لڑکی کی آواز کتنی سخت تھی۔
 ”میری سچ میں نہیں آتا مریم آخر تم نوید سے اتنی نالاں
 کیوں ہو؟“

”زہر لگتا ہے مجھے تمہارا دوست“
 ”تو لگے دو۔“ مجھے کیوں لگتی ہو۔ وہ میرا دل عزیز دوست
 ہے۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ سنا تم نے؟
 سبحان بہت غصے میں آ گیا تھا۔
 ”نوید آج فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے مانی کیا تم میری خاطر
 بھی نہیں چھوڑو گے؟“

”اوہ گاڈ!“ مجھے سبحان کے چیخنے کی آواز سنائی دی
 ”مریم آخر تم لوگ دونوں کے دونوں اتنے باولے کیوں
 ہو گئے ہو۔ تم جانتی ہو مریم تم مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو
 اس لئے تم نے مجھے اپنا واسطہ دیا ہے مگر...“
 ”اگر مگر کچھ نہیں سبحان۔ تم دونوں میں سے کسی ایک کا
 انتخاب کر لو۔ میں یا نوید۔“

”اوہ“ میرا سر جکڑنے لگا۔ تو نویت یہاں تک آگئی تھی
 وہ مجھ سے میرا دوست تک چھین رہی تھی۔
 میں نے مزید کچھ نہ سنا جانا اور وہاں سے لوٹ کر لان
 میں آ گیا۔ دل بہلانے تو میں نے ویسٹنگ شروع کر دی مگر میری
 آواز میں کچھ ہٹ تھی۔
 ”ہیلو“ تب سبحان باہر آتا تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔
 میں نے دیکھا اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔
 ”چل رہے ہو؟“ میں وہاں اس ذلیل لڑکی کی موجودگی میں
 ”ہو گئی۔“

”اس کی شادی سو رہی ہے“ میں نے انہیں بتایا۔
 ”اچھا میں بھی بیگ میں تم اسی لئے آئے ڈیلے ہو رہے ہو؟“
 ”وہ ذمہ دار کا یہ بات نہیں ہے“ میں ان کی بات سمجھ کر
 ہنس دیا۔

”تو پھر کوئی اور؟“
 ”ہاں بھئی۔ اب تو دل سے بھی جا چکی ہے۔“
 ”اوہ ساری مگر تم نے جوگ کیوں لے لیا بھی تھا؟“
 ”جیو تو کلب سونا سا لگتا ہے۔“
 ”صرف آپ کو لگتا ہے؟“
 ”نہیں وہ جو وغیرہ کا رُپ بھی اکثر نہیں پوچھتا ہے۔
 باؤ وہ اندر بھی ہیں۔“

اور میں اندر نہ گیا۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گئے۔
 بے نیاز اس سوال تھے اور انہیں خوشبوؤں سے معتاد آوازیں تھیں۔
 ان نے سوچا میں نے کتنا پاگل بن گیا ہے اب تک۔ دنیا میں
 بھی انجائے کرنے کو سیکھ لوں رنگ بھرے پڑے ہیں۔ اس میں
 نے ان کیوں کے ساتھ خوب ہنگامہ کیا بلکہ آج ہی بھی کسی سی۔
 اور اس وقت جبکہ میں ڈانسینگ فلور پر ناچ رہا تھا
 رہا تھا وہ اور سجان اندر آئے دکھائی دیئے۔ میں نے منہ پھیر لیا
 رہش کرنا رہا۔ اور جب میوزک ختم ہوا، ہم ٹھیک گئے تو لوگ
 نے میں نے دیکھا وہ جو وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سجان جانے
 ان چلا گیا تھا۔

واپس آ کر اس کے قریب بیٹھ کر میں نے اسے قطعاً نظر انداز
 کیا مگر اس مراپے سے اٹھتی جہاں میرے ہتھوں سے اندر جا کر
 ن چار ہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا غالباً وہی دن میرا اپنا ہو گا
 ، دن وہ مجھے اچھی نہیں لگے گی۔ میں سچ، نادیدہ کے ساتھ کافی دیر
 منہ پٹ لگا تا رہا۔
 ”تب ہی سجان آ گیا۔“
 ”لو کھئی تمہارا دم آ گیا ہے“ سچو نے کہا۔
 ”ارے ہائے نوید تم بھی موجود ہو؟“ سجان نے مجھے بہت
 سے پوچھا لیا۔

”کیوں یہی موجودگی بہت حیران کن ہے کیا؟“ میں نے
 اسے کہا۔
 ”تم بہت دنوں بعد ملے ہو نا نوید؟“ سجان نے کہا۔
 ”مجھے ملنے پر پابندی نہیں ہے سجان، میں نے کیلنڈر
 بنایا۔“

”پابندی تو ہے ہی“ وہ آذر وہ سا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا
 ”پابندی تو ہے ہی“ وہ آذر وہ سا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا

اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ میں نے دیکھا مریم نے اس کی بات
 پر پہلو ہل لیا تھا۔

”بھئی کیا بات ہے نوید؟“ سجان نے اور سجان اسٹھ نظر
 نہیں آتے ہو کیا لڑائی ہو گئی ہے؟“ نادیدہ نے کہا۔
 ”ایسی بات نہیں، لڑائی نہیں بلکہ پابندی ہو گئی ہے؟“
 سجان نے ہنسنے ہوئے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“

”یہ مریم بیگم بہت روک ٹوک کرنے لگی ہیں کہ ادھر نہ
 جاؤ۔ یہ نہ کرو؟“ سجان کی بات پر سب لوگ بہت سنئے۔
 ”یعنی روایتی بوی؟“ نادیدہ نے کہا۔ پھر تو سب لوگ مریم
 کے پیچھے چلے گئے کہ اس نے سجان پر اتنی پابندیاں کیوں لگا دی ہیں۔
 ”ایک منٹ بھی لا مریم نے سب کو چپ کر لیا۔“
 ”سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سجان میرے ہونے والے
 شوہر ہیں۔ میں ان کا خیال نہیں کروں گی تو کون کرے گا؟“
 ”یہ خیال کرنا ہے؟“ سچو نے ہاتھ پچائے۔

”ہاں بھئی یہ خیال ہی تو ہے کہ میں نے ان کو ان کے دونوں
 سے پھڑا دیا ہے۔ خواہ مخواہ خراب ہو رہے تھے۔“ مریم نے جن انداز
 میں سمجھ پرچوت کی تھی میں تھلا کر رہ گیا۔
 ”تو پابنتیں بہت خیال سے؟“ نادیدہ نے شرارت سے کہا۔
 ”ہاں اس نے کہ مجھے سجان سے زیادہ اس دنیا میں
 کوئی عزیز نہیں ہے، وہ بڑے فخر سے بولی ہیں خود اچل کر اٹھ
 کھڑا ہوا۔“
 ”اے بس؟“ سجان نے جبر سے کہا۔
 ”ہاں بس چلوں۔“ میرے ذہن میں جھٹکنا چل رہے تھے۔
 جی چاہ رہا تھا اچھی دونوں کو شوش کر دوں۔

میرے جیسے ضدی انسان کے لئے یہ اس قدر حیرت کی
 بات تھی کہ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا تھا۔ ڈور میرے ہاتھ میں
 انگلیوں کو زخمی کر کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ خون رُس رہا ہے۔
 ٹپ ٹپ کرتا ہوں دل دھجک رہتا ہوں۔ برسا رہا تھا۔
 ”کسی دن آؤ نوید؟“ سجان نے شرمندہ سا ہوتے ہوئے کہا۔
 ”تم خود کیوں نہیں چلے آتے؟“

”میں کل جانی والا جا رہا ہوں۔ ایک ہفتہ ادھر قیام ہے گا
 پھر دیکھو۔“ اسی نے کہا تو میں بغیر کچھ بے کوٹ آیا۔ مسرہ زدہ مجھ سے
 پھر ملیں۔

”ڈرنٹ لی سو روکن ہارٹڈ نوید۔ جو ان لوگوں کے ہاتھوں
 میں تو وقت کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر

رونامت کہ جو انی کس حال میں گزار دی۔

”اوہ مائی ڈیر سوئیٹ مسٹر احمد آپ میری اتنی فکر نہ کیا کریں“ مجھے ان پر پیارا آگیا۔

”بھئی تم اتنے سوئیٹ اتنے ننگ ہو۔ جب تم اور اس محبت ہو تو اچھا نہیں لگتا“

”اب اور اس نہیں ہو کروں گا“ میں نے ان کے مضامین کو کھینچ لیا۔

”ہاں بالکل ٹھیک۔ کلب بھی آتے رہا کرو“

”ٹھیک۔ میں نے سیٹی بجائی اور واپس آگیا۔

اسی رات میں نے بغیر سوچے سمجھے تاپا آٹو کی اسٹیٹ سے دو بد معاش بلا کر سجان کے پیچھے بھیج دیئے۔ میری ہر سوچ اب میری اپنی تھی۔ مریم کو توڑنے کے لئے یہ بہترین طریقہ تھا۔ اس نے خود

اقرار کر لیا تھا کہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ سجان عزیز ہے اس نے مجھ سے سجان کو چھینا تھا۔ میرا عزیز دوست سجان مجھ سے چھین

لیا گیا تھا۔ صرف مجھے چوٹ دینے کے لئے۔ لیکن سباط پہ ایک دو ٹھہرے پڑ گئے تھے۔

بدلہ لینے کے لئے میری سوچ بالکل واضح تھی۔

میں اس سے کوئی انتقام نہیں لے رہا تھا۔ یہ ایک معمولی

سایڈ لم تھا۔ اور ان دو آدمیوں کو بیچ کر میں بالکل مطمئن تھا۔

شام کو مجھے آٹو کا گھبرا ہوا فون ملا۔ سجان کا ایک سنڈ

ہو گیا اور وہ ہسپتال میں پڑا موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

میں کھانگم بھاگ دہاں پہنچا۔ اس کے زرد چہرے پر موت

کی زردیاں تھیں۔ ان سب روتے دھوتے لوگوں میں میں نے اسے

دیکھا۔ وہ بہت سوگوار تھی۔

میرے تمام تر جذبات ختم ہو چکے تھے۔ ہاں صرف ایک

احساس سامنے تھا۔ میرا عزیز دوست سجان مر رہا تھا۔

میں نے اس کا کمزور ہاتھ تھام لیا تو اس نے اپنی بند پکلیں

کو کھول کر مجھ پر کھینچ دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں جانے کیا تھا۔ مجھے

اس وقت کتنے کا وہ پکایا یاد آگیا جسے میں نے گاڑی کے نیچے چلا

تھا۔ اس نے بھی مرتے سے مجھے بو بھنی دیکھا تھا۔ دونوں میرے ہی

شکار تھے اور دونوں کے دیکھنے کا انداز ایک سا تھا۔ میں اس سے

نظریں نہ ملا سکا اور اس کے پلنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

انکل مجھے باہر لے گئے اور جب میں دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو

سجان ختم ہو گیا تھا۔

بہت سے احساسات نے ایک دم میرے ذہن پر ڈیرہ

جبا لیا تھا۔ میں نے فوراً اسٹوڈنٹ ویزا لیا اور امریکہ آگیا۔ لاکھوں

روپے خرچ ہو گئے تھے۔ مگر مجھے کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔

میں کروڑ پتی باپ کا بیٹا تھا۔ بابا بہت خوش تھے کہ میں پڑھنے جا

رہا تھا۔ مگر مجھے پڑھنا کیا خاک تھا۔ فی الحال میں اس جگہ سے دور

رہنا چاہتا تھا۔ اسٹیٹ میں جا کر میں نے غائب آوارگی کی۔ دو چار

معاذ تھے اور لڑائے اور اس سب کے ہمراہ میرے پاس ایک

مغول ڈگری بھی ہو گئی۔ تب ایک روز ڈانسنگ کلب پر پانچ لاکھ فرینڈ

کے ہمراہ قرض کرتے ہوئے میں نے دیکھا وہ بڑے پیارے مجھے دیکھ

رہی تھی۔

”نوید تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟“ اس کی سرگوشی

پر میں چونک گیا۔ اس کے سنہری بالوں پر سے اپنے لبوں کو ہٹاتے

ہوئے میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ تب مجھے مریم یاد آگئی۔

”ہاں جینی“ میں نے فوراً اقرار کیا۔

”تم بہت پیار کرتے تھے اس سے؟“

”ہاں بہت“ یہ کہتے ہوئے میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ گریہ افرا

تو کرنا ہی تھا کہ واقعی میں نے اسے چاہا تھا۔

اور وہ بہت لکڑی ہو گئی نوید“

”نہیں۔ بہت ان لکڑی تھی“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”میں نے اسے توڑ دیا تھا جینی کبھی کبھی محبت کرنے والے

ایک دوسرے کو توڑ بھی تو دیتے ہیں نا“

”مجھے مہتاری بات پسند نہیں آئی نوید۔ یہ کیسی محبت

ہے جس میں ایک دوسرے کو توڑ دیا جائے؟“

”تم محبت کو کیا سمجھو گئی جینی ہم مشرقی لوگ بہت عجیب

ہوتے ہیں“

”تم اسے توڑنے کے بعد کبھی اس سے ملے؟“

”نہیں“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم نے اسے توڑا کیوں نوید؟“

”میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا“

”اب بھی نفرت کرتے ہو؟“

”نہیں۔ میں نے ریٹائر کیا ہے میں پہلے ہی اس سے نفرت

نہ کرتا تھا“

”اوہ ویری پور“ جینی کو یہ سب بے حد عجیب لگا۔

”ہاں“ اور میں نے اسے قریب کیا۔ اس شام مریم بھی

چیز میں دل نہ لگا۔ رات کو ڈھنگ سے سو بھی نہ سکا۔ اگلے تو

کا فی بدلہ بلا ہوا رہا تھا۔ مجھے اتنی جان، بابا اور سب اچھا

بہت یاد آ رہے تھے۔ اسی روز میں نے لوہے کا پرہ لٹایا اور

آج میں اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔
 آج مجھے کبھی کچھ تو یاد آ رہا تھا۔ اپنا عزیز دوست سبحان
 اپنا گھر بار اور وہ سب جہاں میں نے حد سے زیادہ اجڑائے
 کیا تھا۔ جب میں تانگے میں بیٹھا تو بہت خوش تھا۔ مگر اب جوں
 جوں منزل قریب آ کر ہی تھی میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

میرا دوست میری کسی بھی بات کا جواب نہ دے رہا تھا۔ میں
 نے فاتحہ پڑھی اور جب میں لوٹے لگا تو میری نگاہیں ساتھ ہی ہی
 قبر کے سفید سنگ مرمر کے کتبے پر اٹھ گئیں۔
 میری پلکیں ساکت رہ گئیں۔ وہ نام کس قدر گہرا دوا گیا
 تھا۔

تو مریم احسان جیت پھر بھی تم ہی گئی ہو۔ میں نے اس
 کے نام پر اپنا ہاتھ پھیر کر اسے مخاطب کیا۔ میری ناگہیں کا پ
 رہی تھیں۔ میں ہر بار نئی بار چکا تھا۔ وہ خود ار اور کمالت
 والی لڑکی آج بھی اسی طرح میرے سامنے تھی جیسی اس روز بھی جب
 اس نے مجھے ہفتہ مارا تھا۔
 مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے سب کچھ گٹا دیا ہو میں
 نے اس کے قبر کے کتبے پر کبھی اس کی تاریخ وفات پڑھی۔ وہ سبحان
 کے مرنے کے شیک چھ ماہ بعد چل بسی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ
 مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم نے نہیں جدا کر کے مجھے توڑنا چاہتا تو یہ
 یہ ہتھاری محبت تھی۔ مگر محبت کرنے والے کبھی تو نہیں جانتے ہیں
 محبت اسے نہیں کہتے ہیں۔ یہ دیکھو ہیں دیکھو تو یہ یہ محبت
 کا سمبل ہیں۔ جدا کر سکتے ہو تو کر لو کہ اب یہ ساتھ ایک تک کا ہے
 اودھ کا ڈ۔ میں جکارتے ہو کر بکشل تمام کر دیاں بیٹھ جانا ہوں
 مجھے تاکہ بیکان کا نقشہ یاد آئے نہ لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے
 ان عزیزوں کو میری آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھیں مجھے دیکھ
 رہی تھیں۔

یہ میں نے کہا کر لیا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں اس
 لمحے اپنے اندر کے نوید کو قتل کر دیتا ہوں۔ میں وہی مٹی کا ایک
 گڈھا کھود کر اپنے وہ بہت سارے آسودہ دفن کر دیتا ہوں، میرے
 اندر کا نوید جو مجھے ہمیشہ منفی سوچ دیتا تھا وہ ابھی امر کیا ہے
 مجھے اس کے مرنے پر ڈر ابھی دیکھ نہیں ہے۔ میں اس نوید کی قبر
 پر فاتحہ پڑھنا نہیں چاہتا ہوں۔

مجھے اس نوید سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس نے میری محبوبہ وار
 میرے دوست کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں پلٹ کر اپنی محبوبہ مریم
 کی قبر پر جانا ہوں اور وہاں جھک جانا ہوں۔

”مجھے معاف کر دینا مریم مگر میں نے تمہارے قاتل نوید کو
 ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ یہ الفاظ کہنے کو نے میری آنکھ سے دوا سو
 چکے اور اس کی قبر پر پڑی مٹی میں ہی جذب ہو گئے۔ اس لمحے میں اپنے آپ کو
 بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں میرے اندر ایک اور نوید ہمیشہ کے چکا ہے
 جو مریم کا عاشق ہے اور جو سبحان کا عزیز دوست ہے۔

میں بہر حال ایک مجرم تھا۔ دنیا کے سب سے عظیم اور
 خوبصورت رشتے دوستی کا مجرم۔ میں نے سوچا مریم نہ جالے کیسی
 ہوگی۔ جب میں امریکہ گیا تھا تو آنٹی اور انکل سے ملنے سے مجھے وہ
 بھی ملی تھی۔ وہ بالکل ڈر ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کے تمام شادیاں
 اور سرخیاں کہیں غائب ہو گئی تھیں اور اب صرف وہ ایک ٹوٹی
 ہوئی منظر مسمی لڑکی لگ رہی تھی۔
 ”بابا لوگ تم اب کتنے عرصے بعد گھر لوٹتا ہے؟“ خان بابا
 نے مجھ سے پوچھا۔

”بہت عرصے بعد بابا“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔
 ”لو آگیا تمہارا گھر“ بابا نے تاکہ روک دیا۔ میں نے مندر
 جھکا سپیٹ اور کیا اور کوٹ کی جیبوں سے دستانے نکال کر پہنے
 اور اپنا سامان گھر کے دروازے پر رکھ کر سیل پر مل کر رکھ دیا۔
 میرے گھر والے مجھے باکر بہت خوش ہوئے۔ رات میں میری آنٹی
 حلو میں شہر وا سا بننا بیٹھا رہا میری اتنی مجھے دیکھ کر بہت آزرہ
 ہو گئی تھیں کہ میں کمزور ہو گیا تھا جبکہ بہنوں کا خیال تھا کہ میں
 مزید چارونگ ہو کر آیا ہوں۔

باقی رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ میں نے سوچا میں صبح اٹھ کر
 سب سے پہلے قبرستان جاؤں گا۔ اپنے دل پر جمع گلہ بغیر اپنے دوست
 کو سناؤں گا۔ میں نے ہمیشہ ہر بات اسے بتائی تھی اور یہ سب سے
 بڑا راز بھی میں اسے بتانا چاہتا تھا کیونکہ تمنا عرصہ اور دل کے باوجود
 میں نے کبھی کسی کو اپنا دل کھول کر نہ دکھا تھا۔ اب صبح سویرے
 اٹھا۔ سنا پڑھنے مسجد گیا اور جب لوٹا تو میری جھوٹی مہین وضو کر
 رہی تھی۔ ”بھیا تم بھی نیک ہو گئے ہو؟“ وہ بہت زیادہ نہیں رہی تھی۔
 ”ہاں بھنو یہ جاؤں بھی ہو گیا ہے“ میں نے آہستہ سے کہا۔
 ”بھیا میری سیلیوں کو آپ سے ملنے کا بڑا شوق ہے؟“
 ”کیوں؟“

”آپ ملتے زبردست سکیر ہیں نا۔“
 ”ہاں بھئی اور سنو میں ذرا قبرستان کی طرف جا رہا ہوں ابھی
 انھیں تو انہیں بتا دینا“ میں نے اس کی بات پر غور کے بغیر آہستہ
 سے کہا اور جب میں قبرستان آ گیا۔ میں نے سبحان کی قبر کے قریب بیٹھ
 کر ساری داستان سنا دی۔ اٹنے آسٹو ہوا کے گریبے دل پر پہنچ
 غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ مگر یہ سب کس قدر لا حاصل تھا۔



السمکات

طاہرہ جیکین

اور اماں نے کتنے ہی گرم گرم آنسوؤں کے پڑوس جذب کر لئے اس رات گھر میں کھانا نہیں پکا تھا اور سرشام ہی سب لوگ منہ لیٹ کر سو رہے تھے کئی روز تک درویدیا پر ماتم کی سوگاری چھائی رہی تھی تب اس کا نام اللہ معافی تجویز ہوا یوں بیسے ماما کو لوگ عجیب عجیب ناموں سے پکارنے لگے میں۔

اماں صبح سویرے ٹالی کی موٹی سی شاخ کے ساتھ ایک کپڑے کو دوڑوں ہروں سے باندھ کر جھولا سنا دیتی اور وہ سارا دن اس میں بڑی رہتی۔ وہ کبھی کبھار لپٹی ہی سہم سی گئی تھی کسارا دن اپنے پاؤں کے انگوٹھے گوند میں ڈالے حیران حیران سی آنکھیں اوچی اوچی شاخوں اور چوبچوبے یوں خاموش بڑی رہتی جیسے نکلی رگڑے ہوئے ہو۔ اور پھر جب اماں دوبارہ اُمید ہوئی تو اس کے لئے جھولا باندھنا بھی بھول گئی اور وہ سارا دن دھول میں نہت پت کھٹنوں کے بل رہی گا کرتی سوکھی سوکھی رگوں سے بھری ٹانگیں لیکروں کے سفید کانٹوں سے زخمی ہو جاتی اور وہ کنگر چتر ہو جاتا جس میں آتا چٹا یا کرتی۔

ایک دن صبح سے ہی گھر ورا ایک پڑھول سی خاموشی چھائی ہوئی تھی ہر شخص ایک دوسرے سے یوں کترا تا گڑ رہا تھا جیسے نظر ملتے ہی دوسرا کوئی موت ہمیں بڑی خیر خدا کے گاموں میں پڑا ہوا ہے سنجیدہ جہرے لئے اس کوٹھری میں آ جا رہی تھی جس میں اماں صبح سے بندھنیں اور جس کے طاق سے لگی وہ دیر تک بیٹھی رہی تھی مگر اسے کسی نے اندر نہیں جانے دیا تھا اور وہ قدم قدم چلتی گلی میں لٹکائی تھی اور بڑے بڑے لیکروں کے زرد زرد پھول چن چن کر چستی رہی تھی اور پھر وہ وہیں دھول میں تھوڑی بھٹتی سی بنی مڑک کے بچوں بیچ سو رہی تھی ایک بل گاڑی گزری اور اس کے دائیں بازو کو روندتی ہوئی بڑھتی چلی گئی۔ وہ پہلے تو کسمائی اور آنکھیں جھپک جھپک کے بھینتی رہی اور پھر بازو کو سینے کے ساتھ پیچ کر صبح کو رونے لگی۔ وہ مڑک

یہ پہلی برقیی اس کی سہی تھی کہ وہ اُس وقت تیسری مڑکی کے روپ میں والدین کے سینوں پر موٹک دلتے چلی آئی جب کے ہر ایک کو کامل یقین تھا کہ اب کی بار تو ان کی منتیں اور تعویذ دھارے رائیگاں نہیں جائیں گے۔ مگر کیا کیا جاتے اس بڑے مقدر کا کہ بیسیوں ہی پیروں فقیروں کے تعویذ گول گول کے پینے منتیں ماننے اور چلے کاٹنے پر بھی بش کو کے ہاں جب ایک اور لڑکی نے جرم کیا تو ہر ایک نے دانتوں سے انگلیاں دبائیں اور گاؤں کی عورتیں کئی روز تک ان کے گھر امنوس کرنے آتی رہیں۔

وہ جب پیدا ہوئی تو اس کی دادی نے دو چتروں سے اپنا منہ پیٹ ڈالا اور اس کو شست کے ننھے ننھے لال لال دھڑلے کو دائی کے ہاتھوں میں پھینک کر کوٹھری سے نکل گئی اور پھر سارا دن منہ پر دوپٹے کا پتو ڈالے بین کرتی رہی اسے لگتا تھا کہ اب وہ گاؤں کے کسی فرد کا سامنا نہ کر سکے گی اس کی اماں بھی جس پہلو پڑی تھی وہیں ساکن ہو گئی جیسے کسی بھاری شیشین کا پتہ سننا تھا ہوا دانا ہر سے گزر گیا ہو مغز ناک کے راستے بہہ نکلا ہو اور انھیں ابل کے آرہی ہوں اور اس نے جو چڑیا کے لٹے کی طرح لال لال کیا کچا فرسا منہ گول کر دنا شروع کیا تو کوٹھری ہی سربراہی تھا اماں کو کوٹھری کی دھنیں سے سیاہ ہڑ جانے والی تپتی آگت پر پھٹی پھٹی سی آنکھیں جھاتے ہوئے دائی سے پولیں۔

”ہاں اٹھا کے دے مار لکھو ہی کو۔“

دائی اس کی چپ چپ سی ہاشت بھر لوتھ کو کپڑے میں پھیلتے ہوئے لگی۔

”نہ نہ یہ کیا کہتی ہے۔ اللہ کی دین ہے لڑکی ہو یا لڑکا۔ خدا بچا ہے کوئی تیسری جون نہ دکھائے چھر لڑکیوں بچا یوں کا ہے ہی کیا کچھ عرصے بعد تیجے رانی بنا پٹنگ پر بھٹائے گی پھر پرائے بھر ہانک دی جائے گی یہ تو اللہ میاں کی گائیں ہیں بچا ہی۔“

اور جب دو چار اور لوگوں کی چپتیں پڑیں تو وہ سہم کر
گلے کے اندر ہی اندر گھٹی گھٹی زندگی زندگی آواز میں رونے
لگی اور پھر وہ ساری رات تڑپا رہی تھی ابھی سیدھی اور
ایسی بیخون کو حلق میں گھونٹتی رہی اور پھر ٹوکسی لے یہ بھی زد کیا کہ
زندہ ہے یا مر گئی کیونکہ اسی رات اماں نے ایک اور لڑکی کو
جسم دیا تھا۔ گھر پر ایک ایسی مائیں سوگاری چھا گئی تھی جیسے ایک
ہی وقت میں کئی جنازے اٹھاتے گئے ہوں۔ دادی کئی روز
ملک گھر سے باہر نہیں نکلی تھی وہ اسٹتے بیٹھتے اماں اور ان سب

پر یہاں سے وہاں تک موتمنی تھی اور چلاتی تھی مگر آج اس کا
یہ واویلا کون سنتا تھا۔ کافی دیر بعد اس کی بڑی بہن نکلی تو اسے
اٹھا کر گھر لے گئی اور چار پلوں پر لٹا کر تھپک تھپک کے چپ
کراتے لگی۔
مگر وہ تو یوں تڑپ تڑپ کر چلاتی تھی جیسے مری جائے
گی تب دادی اماں نے آکر اسے بری طرح دھنک ڈالا۔
چپ کر کم بخت موئی سب کی جان پر بی ہے اور یہ
اللہ ماری اپنا یا بجا بجا رہی ہے۔



بہنوں کو جانے کیا کیا صلواتیں سنایا کرتی تھی۔ بٹھ کوئی
دوڑن لکھ کر شکل نہیں دیکھی تھی اس نے دن رات کھیت میں
رہنا شروع کر دیا تھا اماں نے کڑھ لکھ کر جانے لکھی عجیب
عجیب ناموں کی بیابان لکھی تھیں رو رو کر لکھوں کے گرد لکھنے
سیاہ حلقے پڑ گئے تھے وہ وہی ہل میں ان سینکڑوں فقیر
اور پیروں کو کوسا کرتی تھیں کے پاس بھاگ بھاگ کر تلوسے ہی
چرخ گزرتے تھے۔

ان حالات میں اسے کون دیکھتا کہ کہاں ہے وہ دونوں
بازو کو سینے کے ساتھ چمٹا سے پھرتی رہی سارا سارا دن درختوں
کے تنوں کے ساتھ لگی بیٹھی رہتی کبھی بھوسے کے ڈھیروں میں
بازو کو چھپا لیتی گرم گرم بھوسے میں اسے کون سا ملتا پھر دونوں
بعد بازو کو سینے سے جدا کر لیتی مگر اسے اوپر نیچے نہ کر سکتی۔
انہیں دونوں اماں اور دادی نے درگاڑوں اور پیروں فقیروں
کے چکر بہت زیادہ کر دیئے تھے اماں جانے کہاں کہاں کا غنہ
بھنگو کر نہایا کرتی تھی رات تاروں کی چھاؤں میں کبھی اندھیری رات
کسی کے بھجوا دے اور کبھی سات مختلف جگہوں کے پانی سے
اس کی گردن اور بازو و توتیوں سے چھو لے رہتے اور اگر لاری سے
اترنے والا ہاری بھی کسی پر فقیر کا ٹھکانا بنا تا تو اماں اور دادی
اسی وقت دوڑ پڑیں بغیر خدا نے رحم کھایا اور اماں نے ایک
لوٹے کو سبم دیا تب وہ جیسے سب خوشی سے دیوانے بنی ہو گئے سانسے
گاتوں میں بتاتے بٹاتے گئے۔

بٹھ کو چھوٹا بھائی اسی وقت شہر سے لاؤڈ اسپیکر لے آیا،
اور دو دن اور دو راتیں ٹہلی گاؤں سے گاؤں والوں کے کان میں
رہے۔ جہیہ بھر گاؤں کی عورتیں بٹھ کو کے گھر رات کے ٹھک گیت
گاتی رہیں اور ہر رات ان میں گڑ بٹتا رہا۔ اب تو لوں لگتا تھا جیسے
ان سب بہنوں کا وجود ہی گھر والے بھولی گئے ہیں انہیں اس
کو شہری میں جانے کی ممانعت تھی جہاں اماں سارا دن پیراں دتا
کوئے میٹھی رہتی وہیں اسے نہایا جاتا مبادا نظر لگ جائے،
دادی سارا سارا دن اماں کے لئے طرح طرح کے پکوان پکواتیں تاکہ
خوب دو دو اترے کہاں تو وہ دادی جو اماں سے خالی ہل کی طرح
کام لیا کرتی اگر اگر شہر سیاری میں بھی اماں دو گھڑی دم لیتی
تو طوفان اٹھا دیتی تھیں اور جانے کیا کیا طعنے کسے دیا کرتیں مگر
اب تو چار پالی سے نیچے پاؤں تڑپا رہے دیتی تھیں۔
وہ اب چار برس کی ہو چکی تھی اب اسے بازو کا درد تو نہیں
ہوتا تھا مگر ساتھ کھیلنے والے لڑکے لڑکیاں اسے ٹنڈی ٹنڈی

کہنے لگے تھے اس کے ہجلیوں نے ایک کھیل سا بنالیا تھا۔ ایک
کتہ۔
ٹنڈی اپنے سر کو ہاتھ توڑ گاؤں؟

دوسرا کہتا۔
”نرین سے مٹی کی ٹٹھی تو پھر وہ؟“
وہ پوری قوت سے مل دے بازو کو اوپر اٹھاتی تو وہ
بے جان لکھ کر طرح طرح کا کھارو ہیں ڈھرا ہو جاتا اور لڑکے....
لڑکیاں ہنسنے ہنسنے دھول میں لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک دن
دادی کی لڑکی بھی اس پر نظر پڑ گئی پولیس۔
”اے ری۔ اسے ہاتھ سے روٹی کیوں نہیں کھاتی؟“
وہ بولی۔

”کھاتی نہیں جاتی۔“
”اری کلہو سی کیوں نہیں کھاتی جاتی؟“
اسے ہاتھ سے کھانا چھانٹیں ہوتا۔
دادی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے ہاتھ سے کھانا
گھر بھر کے لئے ٹھوس ہوتا ہے اس کے سری ہو گئیں کہ سیدھے ہاتھ
سے کھاؤ لکھ کر چھینے کھاتے پڑے جی جب وہ وہی کہتی رہی ہے ہاتھ ایسے
ہی ہیں میں یوں ہی کھاتی ہوں تو اس کی بڑی بہن بولی۔
”دادی! معافی کے ہاتھ ایسے ہی ہیں سب بچے کہتے ہیں یہ
ٹنڈی ہے۔“

تب دادی نے جھٹکے اس کا بازو سیدھا کر کے دیکھا تو
وہ بے جان لکھ دسا لنگ گیا۔ بازو اوپر سے سوکھ گیا تھا کندھے
کے پاس یوں لگتا تھا جیسے بڑی الگ ہڈی ہو اور صرٹ کو شت
جدا رہ گیا جواب دادی کو فکر ہوئی کہ کسی جیانے کو دکھائے
آخر بیٹی کا دھن بے کل کپڑے لوگوں میں جاسے گی مگر ان
دو دن اس کی اماں کا پھر یہ بھاری تھا اس لئے بزرگوں کے
آستانوں اور فقیروں کے کیوں میں جھانکے بھاگتے وہ اس کے
بازو کے متعلق بھولی گئیں اور جب ایک اور لڑکا پیدا ہوا تو منٹوں
کے پڑھا دے پڑھا دے ہی ایک عرصہ گزر گیا۔

اب وہ کافی سمجھ دار ہو گئی تھی جب وہ بچوں کے ساتھ
مل کر کھیلتی اور لڑکیاں بھٹ پٹ دوڑن ہاتھوں سے مٹی کے
گھر دندے بنا ڈالتیں اور وہ گھنٹوں ایک چھوٹی سی دیوار ہی بناتی
رہتی مگر اس میں سوراخ ہو جاتے وہ پھر بناتی پھر لڑی سی بنتی
اور لوٹ جاتی اس آشنائیں لڑکیاں کسی کئی گھر دندے بنا ڈالتیں
ایک بڑا کوٹھا دو کھرہاں (مندو دو) پڑھت چار دیواری اور اوپر

پھولی پڑے وہ بار بار نظر اٹھا کر اتنی دیکھا کرتی۔ اس کی نظر ان سونڈھی سونڈھی سر میٹھی کے گھر وندوں سے زیادہ ان بازوؤں پر ہوتی جو تیزی اور جذبے سے اس ٹھنڈی اور بھر پوری مٹی کو مضبوط اور یک جان کرتے جاتے تھے اور پھر وہ صرست سے اپنے بازو کو دیکھتی اور سختی پھیل تو دونوں بازوؤں سے ہی ہوتا ہے ایک بازو سے پھلا کیا کھیل ہے۔

تب وہ متین کی آستین بازو سے اوپر بڑھا دیتی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سوسکے ہونے پر جان بازو کو ٹٹو لاکھتی اور ہر جگہ کتھ سے کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو چومز دیتی اور اپنے اپنی اور صحنی لپٹتی اگر ایسا ہو جائے مگر ہاتھیں پھر سے جدا ہو جائیں۔ بازو بریدہ شاخ کی طرح لٹک جاتا اور وہ جی طرح روی جاتی۔ اب دادی کو جب دو لڑکے پاؤں کچھ اطمینان ہوا تو اسے دوسرے گاؤں ایک بڑی بوڑھے والے آدمی کے پاس لے گئیں اس آدمی نے بازو کو اچھی طرح ٹٹو لے اور مردوڑنے کے بعد کہا۔

”اب یہ بڑی چڑھ نہیں سکتی کیونکہ بہت عرصہ گزر گیا ہے سب گھر والے اس کے رے پر مشورہ پر تیار ہو کر چھپ ہو رہے مگر وہ جب مولویوں کے گھر باقاعدہ بڑھنے کے لئے جایا کرتی تو ملامتیاں اسے دیکھتے ہی پاس بیٹھی غور کر لیا کرتیں۔ دیکھو تو خدا نے کتنی اچھی شکل و صورت دی مگر بے رحم والدین جنہوں نے لڑکی کے دھن کو روکی کر دیا۔ اتنی بھی کیا لڑا رہی چلو اب لڑکوں کی اس بھی پوری ہوئی آس یہ بھی کسی سیلے کے پاس لے جائیں تو اس کا بازو ٹھیک ہو سکتا ہے۔“

وہ جھٹکتی ”ہم کئے تھے سیانے کے پاس وہ کہتا ہے یہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“

”ملائیوں کہتے ہیں۔“

”اوی کیوں نہیں ٹھیک ہو سکتا کہیں لے کر بھی تو جائیں اس بڑی بوڑھے والے کو کیا پتہ ہے کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں تو ٹھیک کس طرح نہ ہو۔“

پھر اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں لے کر ٹٹولتے ہوئے بولتی۔

”یہ بوڑھی تو نکلا ہے۔ جاے پھولی سی کو کیا کیا کہ بختوں نے کہیں دیکھا بھی نہیں ورنہ اسی وقت جوڑ لگ جاتا تو آج یوں روگی تو نہ ہوتی۔“

ملائی کے بار بار کہنے پر اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا بازو ٹھیک ہو سکتا ہے اگر وہ شہر کی بڑے ڈاکٹر کے پاس اسے وہ جب لڑکے لوگیوں کو چھوا دے کی طرح درختوں پر

چڑھتے اور کچے کے پھل تو چتے ہوئے دیکھتی اور جب اس جتنی لوگیاں دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر گنگا ڈال کر تیں تہہ کی گھیلوں سے ۔۔۔ اپنے بازو کو دیکھا کرتی اور پھر اسے یوں اپنے نختے نختے سر پٹ کے ساتھ چپکا لیتی جیسے شفیق ماں اپنے ڈرے ہونے کے لیے کہیں سے چپکا لے۔

”یہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ دلی میں چپکتی۔

میں دادی سے کہوں گی وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں و میرا دوسرا بازو بنادے گا۔“

اور اسے ڈاکٹر پر نواہ مخواہ پیار کرنے لگا۔ جو اس کا دوسرا بازو بنادے گا یا شاید نیا لگا دے۔ اور جب ایک دن اس نے دادی سے کہا۔

”دادی! آج کبھی میں بڑا ڈاکٹر تھا ہاں بازو ٹھیک کر سکتا ہے۔“

تو دادی نے ایک سرواہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہاں اب کہاں اس بے جان تو تھڑے میں جان پڑنے کی لے تو گئی تھی سیانے کے پاس اب تیرے لیکھ ہی رے ہوں تو کوئی کیا کرے۔“

تب وہ رات بھر جا پائی میں سرویتے روتی رہی اندر ہی اندر سکتی رہی کتنی کتنی بے بسی سکایاں۔ وہ اب بھی درختوں پر نہیں چڑھ سکے گی وہ کبھی جھولانہ ڈال سکے گی یہ بازو کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

دوسرے دن جب ردھلانی نے اسے پھر کہا۔

”اپنے باپ سے کہو نہیں بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جائے تو وہ قاعدے پر سر رکھ کر صحت چھوٹ کر روئے گی۔“

”ارے بھئی روتی کیوں ہے۔“

آج کبھی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”آج کبھی۔“

وہ کتنی کتنی آوازیں منٹاتی۔

”کیا ہے۔“

آج کبھی اس کے لمحے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے بولیں۔

”آج کبھی۔ دادی کہتی ہیں تمہارا بازو کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔“

اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر پچھ چمک کر رونے لگی۔

”نہیں معافی نہیں۔ دیکھو رو نہیں۔“

آپاچی اسے چپ کر اتے ہوئے بولیں۔

”تمہارا بازو ضرور ٹھیک ہو جائے گا یہی ہے ناچار ہے ملک جائیں گے۔“

پاس بیٹھی ایک عورت نے کہا۔

”تمہاں آج تیرے پاس کا نام نہ لو جان نہ نکل جائے گی اس کے باب کی ہر سال ہزاروں کی فصل اٹھا ہے مگر کامیوں سے بڑھ کر سوم ہے اسے تو بس زمینیں خریدنے کا چہرہ ہے چاہے دھن پیچھے ہر گاؤں میں جو بڑی بن جائے ابھی تو پچھلے دنوں تو لوں کی کھڑی دے کر چار گھیر زمین خریدی ہے۔“

آپاچی اس کے اسٹو کو پچھتے ہوئے بولیں۔

”دیکھ معافی میری بات غور سے سن آج جا کر اپنے ابا سے کہنا کہ آپاچی کبھی نہیں اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ بیٹی کی ذات کو کچھ بیسیوں کے بدلے روٹی بڑی ہے اتنے تو بھوکے نہیں مر چکے ہو کہ علاج ہی کروا نہ سکو بس یہ بات اپنے ابا سے ضرور کہہ دینا پھر وہ تمہارا علاج کروا دے گا۔“

وہ صوب کا عدے کو جھینٹ کے بچو لدا کر کپڑے میں لپیٹ کر آئی تو شکو سامنے ہی نیم تلے بیٹھا سستی پی رہا تھا وہ قاعدہ اندر پھپھتی پر رکھ کر پاس ملی آئی اور جاتے ہی بولی۔

”ابا آپاچی کبھی نہیں تمہارا بازو زمینیں خرید سکتا ہے مگر بیٹی کا علاج نہیں کروا سکتا۔“

آپاچی جوتستی سے جھپکی ہوئی مونچھوں کو بل دے رہا تھا کوک کر بولا۔

”جا کہہ دے نہیں کروا سکتا اتنی جلد روہنتی ہے آپاچی تو کروا دے علاج۔ دس لوگوں سے پوچھا ہے نہیں ہو سکتا ہے علاج تو کدھر جاؤں دیکھ کھانے۔ پھر وہ کون ہوتی ہے میری زمینوں کی بات کرتے والی۔ زمین خریدی ہے تو اپنا دھن لگایا ہے کسی کے گھر ڈاکہ نہیں ڈالا کہ ساری دنیا ہی چیمچے ہی بڑی ہے۔“

دادی پٹری پر بیٹھی روٹیوں کو مکھن سے چوڑی تھی بولی۔
”لوگوں کے چولہوں میں تو اس دن سے پانی بڑ گیا ہے۔“
”بشو جھٹکے سے چار پائی سے اٹھا تو لیان کی چار پائی پوچھنے لگی کہ جتے ہوئے بولا۔

”خیریدوں کا زمینیں۔ جل کر لاکھ ہو جائیں شریک۔ بس چلا تو سارا گاؤں خرید ڈالوں گا۔“
پھر اس کی طرف پٹیا ہویم کے تنے کے ساتھ یوں پھکی ہوئی

تھی جیسے اندر گھس جانا چاہتی ہو بولا۔

”دن لڑکی تو کھل سے ملانی کے پاس بڑھتے نہیں جاتے گی۔ بازو اسے ایسی بڑھا لی سے۔ لڑکی کو اور بھی بڑھا رہی ہے کہ اب باپ کے منہ بھی گئے۔“

اس دن سے اسکا سجدہ جانا بھی موقوف ہو گیا وہ سارا سارا دن نیم کے تنے کے ساتھ لیان کیوں کو اچھلتے کودتے اور کھیلنے ہوئے دیکھا کرتی ہوا اپنے لمبے لمبے مضبوط بازوؤں سے بیسیوں ہی قسم کے کھیل کھیل کرتے جانے کیوں اس کی نظر ہمیشہ ہرنچکے کے بازوؤں پر بھی پڑتی تھی اس کے لئے بچے صرف دو صحت مند بازوؤں کا نام نہیں جن کی مدد سے وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں نہیں سب کچھ کر سکتے ہیں اسے ہر شخص کے پورے وجود پر اس کے دو بازو ہی جھانے نظر آتے اسے لگتا جیسے ہر کچھ اپنے صحت مند بازو ہوا میں لہراتا ہوا اس کے سامنے گزرتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے بچا کہتا ہے یہ دیکھ ٹھنڈی ایسے ہوتے ہیں صحت مند بازو اور وہ خشک خشک ویران آنکھیں لئے سپروں ان بازوؤں کو تسکا کرتی۔ انہیں دنوں اس کے چلے شیعہ وک شادی ہو گئی۔ بشکو کا بس چلنا تو وہ مولوی کو نکاح کے چپاس روپے بھی نہ دیتا کیونکہ اس پر زمین خریدنے کا ایک شرط سوار تھا وہ ہر فصل کے پیسے اپنی ماں سے کہہ کر لمباؤں کی سلائی اڈھیر کر ان کے اندر چھپا دیا کرتا تھا اور پھر انہیں کہیں ہوا بھی لگنے نہ دیتا تھا۔ اگر ہو سکتا تو وہ لوگوں کو چھوڑ کر گھر والوں پر پابندی لگا دیتا کہ ایک سے زیادہ روٹی نہ کھا کر مگر یہاں ناگ کا سوال آگیا تھا اور ناگ بچانے کے لئے تو لوگ جان کی بازی لگا دیتے ہیں اس لئے اس نے بھی برادری میں اپنی پگڑی سنبھال کر رکھی تھی حالانکہ ایک ایک روپیہ نکالتے ہوئے اس کے دل کیوں بڑھتی تھی جیسے کئی دن کے بھوکے شخص کو پیدل چلتے ہوئے سہڑتی ہے۔

برادری کے سب لوگ اٹھتے ہوئے تھے اس لئے بچوں کے رشتے ناتے بھی ملے ہونے لگے۔ بشکو کی لڑکیاں ابھی تو چھوٹی ہی تھیں مگر برادری میں بچوں کو بھی منسوب کر دیا جاتا ہے اس کی چڑی لڑکیاں تو فوراً ہی لوگوں نے مانگ لیں اس نے ماں بھی کہہ دی دوسری چھوٹی لڑکیوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ معافی تو اس کی بہن اپنے لڑکے کے لئے مانگ لے گی مگر بہن نے سوال کیا بھی تو سب سے چھوٹی لڑکی کا کہ اس کا لڑکا بھی چھوٹا ہے اور چھوٹی لڑکی ہی اس کے سوتیلی ہے۔ مگر

یو بھی اگلی فصل بھی آگئی وہ فصل بھی اچھی ہوئی مٹی بنشکونے اپنی ماں کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔
 "اماں دواڑھانی پڑا رکھیں ادھر ہی رکھ لیتا۔ ضرورت پڑے گی۔"

اماں نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔
 "یوں مٹی ہے ناٹو کھسورٹ، اکتیس ہی دو تین ہزار اٹھ چائیس گے لڑکیوں کا کیا کال تھا ہمارے ہاں کسی لڑکے پر ملنے تو حیرت بھی کرتے کہ کل کلا سے گا۔"

بشکونے حق کر گزرتے ہوئے کہا۔
 "اماں برادری میں شملہ اونچا رکھنا بھی تو بڑا مشکل ہے، مگر جانے کیوں دن گزرتے ہی چارے تھے جیسے ہر شخص کسی سبجے کے کاغذ پر کھتا تھا وہ مجھ کو دینا ہو گیا۔ شیر و کے ہاں پہلا ہی لڑکا پیدا ہوا۔ شیر و نے جب پر خیرستی تو خوشی سے دیوانہ بنی ہو گیا وہ بولیں گتا ہوا بشکو کے پاس کھیت میں گیا۔ جیسے پندرہ برس قبل جیل گا کر تھا بشکو کئی پڑے کھیت میں پانی دے رہا تھا شیر و جا کر اس سے لوٹ گیا اور بے ربط گفتگوں اور بچوں کی ہونی سانسوں کے درمیان بولا۔
 "بشکو ہماری ہی کٹی۔"

"اب ہیں لڑکی کو کہیں نہیں لے جانا پڑے گا۔"
 اور جب بشکو کو معلوم ہوا تو وہ بھی کسی چنگک کر یوں شیر و سے لوٹ گیا جیسے وہ ہوا میں اڑنے لگا ہو۔ دونوں بھائی یوں خوش تھے جیسے ہل چلا تے چلا تے انہیں خزانے کا صندوق مل گیا ہوا اور ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں کافی دیر بعد جب دونوں کی سانسیں تو ریمائی ہوئیں تو شیر و بولا۔

"میں برور اسی لئے تو نال جاتا تھا سوچتا تھا اگر لڑکی گھر ہی میں کھپ جائے تو بارود چلے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر کا سال تو اچھا ہی ہوتا ہے چاہے کھٹیا ہو چاہے بڑھیا۔ بشکونے گھر سیاہ دھواں منہ سے نکالا اور منہ کی نے واسپے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے یوں مسکرا کر شیر و کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ میرے دل میں بھی تو غصی طور پر یہ بات تھی تھی تو کام ختم نہیں ہوتا تھا۔ گھر اگر بشکو نے اپنی ماں سے کہا۔
 "اماں وہ دو ہزار منائی میں ڈال کر بلی سی سلائی کو دے اب ضرورت نہیں رہی۔"

ہر ایک جانتا تھا کہ اسے بازو کی وجہ سے ہر کسی نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اب بشکو کو ایسا لگا جیسے ہزاروں روپے شادی پر بچوں کے دینے پر بھی اس کی ناک ساری برادری کے بیچ کٹ گئی ہے اور لوگ اسے سرباز اور جوتیاں مار گئے ہیں اس کی لڑکی کو لوگ اس لئے ٹھکر گئے ہیں کہ وہ زائدہ کام نہ کر سکے گی اسے لگا جیسے اس کی بیٹی نیم کے پیڑ تلے تنے سے لگی بیٹھی رہے گی کہنے ہی موسم آ رہی گے اور گھر جا میں گے گزرتے دوں کی دیر نہ کر اس کے چہرے پر حیرت رہے گی اور لوگ اپنی بیسی بیسی انگلیاں اٹھا کر کہیں گے۔

وہ دیکھو بشکو کی لڑکی باپ کی دبیز بار بیٹی بیٹی عصر کھا گئی اور برادری میں کسی نے پوچھا ملک نہیں بڑا زمینوں والا بنتا ہے اب بشکو کو ایسے لگا جیسے اس کی بگڑی اس کے ہاتھوں میں آ رہی ہے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑی کو مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا اور بڑبڑایا۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا میں اپنی عزت بچاؤں گا جیسے جی ہوا اس دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کا علاج کروائے گا پائے جتنے پیسے لگ جائیں جب شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو اس نے ایک دن شیر و سے کہا۔

"یار شیر و سوچنا ہوں لڑکی کا علاج کروا دیں۔"
 شیر و جو عجم میں انگارے بھر رہا تھا بولا۔
 "کہنے تو خلیک ہو مگر پیسے کافی اٹھ جائیں گے۔"

وہ بولا
 "ہاں پر برادری میں ناک کڑانے سے تو مرجانا بہتر ہے، شیر و عجم جاتے ہوئے بولا۔
 "دو ایک ہزار تو لگ جائیں گے۔"

وہ بولا۔
 "اس وقت تو اچھی فصل ہوئی ہے ہم ہمیں گے کہ اچھی تر ہوئی۔" کا سال تو اچھا ہی ہوتا ہے چاہے کھٹیا ہو چاہے بڑھیا۔ بشکونے گھر سیاہ دھواں منہ سے نکالا اور منہ کی نے واسپے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے یوں مسکرا کر شیر و کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ میرے دل میں بھی تو غصی طور پر یہ بات تھی تھی تو کام ختم نہیں ہوتا تھا۔ گھر اگر بشکو نے اپنی ماں سے کہا۔
 "اماں وہ دو ہزار منائی میں ڈال کر بلی سی سلائی کو دے اب ضرورت نہیں رہی۔"

ابھی تو کام کے دن ہیں جب فرمت دی تیب چلے جانا۔
 وہ دونوں بھائی اب عمو اسی موضوع پر باتیں کیا کرتے مگر یہ ختم نہ ہوتا تھا جب بھی جانا ہوتا کوئی ناکام نہیں ہی آتا،



شیخ گلابلہ (جلد سوم)

بالاؤ آخر تر شہود



تھا۔ اس نے سب کچھ خود ہی سوچ لیا تھا اور پوچھنے کی جرت اس لیے گوارا نہیں کی تھی کہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی اسے اتنا معلوم تھا کہ انہر کو پورے بسترو سوٹتے ہیں۔ مگر وہ اسے صرف ... نو سو دیتا تھا۔ اسی روپے میں حازری سے لے کر مکان کا کاریہ، بچوں کی فیس اور سگریٹ ملنے بکٹ بنتے تھے۔ انہر لاکھ کھنڈرا، بے فکر اور بے حس ہی مگر فضول خرچ تو کبھی نہ تھا۔ پھر کیا معاملہ ہے ... ۶۹ روپیہ کے ذہن پر پلے درپلے کئی پتھوڑے پڑے اور وہ ایک دم چکا لگتی جب سنبھلی تول سے بری طرح غصہ آ رہا تھا۔

نیو کی اینٹ اگر ٹیٹھی رکھی جائے تو پوری عمارت کج ہو جائے گی۔ اس نے جو پہلا قدم غلط اٹھایا تو صحیح راستہ ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک دو دن نہیں پورے اٹھارہ سال تک لمبے کے بعد بھی اگر کوئی دھوکا کھا جائے تو اس کا اپنا قصور ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ وہ کئی سیڑھیاں نیچے اتر گئی غلوت وال اٹکائی میں غامد اور رشید کے ساتھ بیٹھی وہ چھوٹوں کا سہرا گوند رہی تھی اور سفید چاندنی پر پہنچی ہوئی بہت سی ٹوکیاں ٹوہوک پر شہادتِ درگیت کی ایک قسم، آگاہی تھیں۔ شام میں بلات جانے والی تھی ابھی سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ خود دو لہا کی ماں رفیعہ بار بار اپنے بیٹے کی باتیں لے رہی تھیں۔ کتنا خوبصورت تھا اس کا بیٹا ابھی ابھی ولایت سے آیا تھا یعنی چار پانچ دن ہوئے تھے کہ چھوٹے آبا بھتر کے بیٹے سے خرید کر دے گئے تھے پھر اچانک رنگ میں بھنگ ہو گیا تھا۔ دولہا انوار کر لایا تھا۔ رفیعہ خوب روٹی و مزو تر مے اڑا لیا ہے، غامد اور رشید دونوں انہر کے پیچھے لگ گئے اور آخر انہوں نے گڈا انکار اہی لیا مگر اس کی ایک ٹانگ شہید ہو چکی تھی۔ رفیعہ نے کڑے کو اس حالت میں دیکھا تو مارے تانے کے جلتے چوہے میں گھسیڑائی۔ ملک جھپٹے لگا جمل کر لکھ ہو گیا۔ پھر وہ دیرینک حلق چھاڑ بھاڑ کر روئی رہی اور جب روٹنے سے بھی دل بھر گیا تو اس نے خوب جی کھول

آئی تھی کہ پتھر ورنی ہو تو جو دم کر مہنتی چھوڑ دینا چاہیے مگر اس نے جو اٹھنے کی کوشش کی تو کچھ بد نہ ہو گیا اور وہ ایک دم بلبل اٹھی قصور اپنا تھا، الزام اس کو دیتی۔ وہ آنکھوں میں آنے ہوئے آنسو بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ پی کٹی پھر اس نے جھپکی ہوئی قمیض کو پھوڑ کر الگنی پر پھیلا دیا اور باقی پٹروں کو دھوٹے غیر میلے پٹروں میں ڈال آئی۔ قمیض کی جیب سے نکلا ہوا خطاب تک اس کی مٹھیوں میں بند تھا۔

”میں نے ان دس سالوں میں تم سے ایک دھیلے کی بھی فرمائش نہیں کی اور خدا کے فضل سے مجھ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر ماں ہرنے کے ننھے تہار یہ فرض تھا کہ لپٹے پیسے سے نہ سہی کم از کم دو لفظوں سے تو کبھی کبھی یاد کر لیتے۔ تم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہو میرے لیے یہی بہت ہے“ یہ خط ہندوستان سے چھوٹی اماں نے بھیجا تھا جو بھانے کب سے اس کی جیب میں پڑا سر رہا تھا۔ حد ہو گئی ہے، بے حس کی گویا انہر کو دنیا میں کسی سے کوئی سروکار نہیں، کیا کہتی ہوں گی چھوٹی اماں یہی تاکہ سکھا پڑھا کر میاں کا دل پھیر دیا ہے۔ کیسا نہ ہر بھرا خط تھا۔ خط کے ایک ایک لفظ میں ... تم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہو میرے لیے یہی ... ہے، اس جملے کی دھار بہت تیز تھی۔ رفیعہ اتنا بڑا الزام اپنے سر لیتے تو کیا نہیں تھی۔ اس جملے ... ”تہا فرض تھا کہ روپے بیسیوں سے نہ سہی کم از کم دو لفظوں سے تو کبھی کبھی یاد کر لیتے ...“ اس کے ذہن پر کاری مزب لگائی تھی خط سے صاف ظاہر تھا کہ آج تک انہیں ایک دھیلہ بھی نہیں بھیجا گیا۔ ادیر بھی سچ تھا کہ انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر وہ اس خوش فہمی میں کیوں بلبل ہو گئی تھی کہ روپے چھوٹی اماں کو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ روپے بھیجنے میں سینکڑوں قبا حلیں ہیں۔ انہر نے تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا

کر کوئے دیئے اللہ کرے اظہر امتحان میں فیل ہو جائے ۔
 اسے موت آجائے، جیسے میرے گڑے کی ٹانگ توڑی ہے
 اس کی ٹانگیں بھی ٹوٹ جائیں ۔
 وہ سانس لینے کے لیے رکی تو اظہر نے ٹوک دیا ۔
 ”بس ختم ہو گیا اسٹاک ؟“
 ”وہ دو کرکھڑا ہنس رہا تھا ۔
 ”اللہ کرے تم ریل کے پہیوں کے نیچے آ جاؤ ۔۔۔۔

تمہارا قیام بن جائے گا
 اظہر نے نظر پڑی تو وہ دانت کچکچا کر زور زور سے
 کوئے بگھی ۔ جیسے سچ میچ اس کا قیام بنا رہی ہو ۔ پھوپھی اماں اس
 کی دکالت کہنے لگی تھیں ۔
 ”دور جو جا میرے گھر سے کیونکہ کہیں کا ۔ ہر وقت اس کی بیان
 کے پیچھے ہے نالائق مردود ۔“
 انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے دور ہی سے جوتی پھینکی اور وہ



سب کی نظروں میں دھول جھونک کر فرو چکر ہو گیا۔ اظہر تو اسے پھوٹی آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ ذرا بھی نہیں، رفیعہ کا بس چلنا تو وہ اس کا قہر بنا کر رکھ دیتی۔ ایک دفعہ اس نے چھوٹے آبست شکیات کی تھی۔

”چھوٹے آبستیں پھوٹی اماں کے یہاں نہیں رہوں گی یہ اظہر کا بچہ میری ہر وقت ستا کر مٹا دے گا پھر کڑے کا ذکر کرتے ہوئے اس کا ننھا سادل دکھ گیا تو چھوٹے آبائی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”جلنے دو میں اس سے بھی اچھا لادوں گا“

انہوں نے گود میں بٹھاتے ہوئے پیار سے تسلی دی اور جب وہ ان کے پاس سے اٹھ کر چلی آئی تو انہوں نے اظہر کو ملا کر بچایا

”اظہر بیٹے تم سمجھ رہا ہوتا، رنی تھی اچھی بچی ہے تمہیں اس کے ساتھ پیار سے رہنا چاہیے۔ بڑے انوس کی بات ہے اتم

اتنا بچی نہیں سمجھتے کہ بن ماں باپ کی بچی ہے اس کا دل ٹوٹ جائیگا“

اظہر گردن جھکائے کھڑا تھا جیسے اپنے کئے پر نادم ہو۔

”اچھا اب جاؤ آئندہ سے خیال رکھنا“

چھوٹے آبست نجات سے کہا۔ اس دن کے بعد سے رفیعہ

کے ساتھ اس کی شرارتیں بہت کم ہو گئیں تھیں مگر موقع مل جاتے تو

چھیڑنے سے چوکتا نہیں تھا۔ کچھ عرصے ہی سال گزر گئے۔ مگر اظہر

نے اس دن کی طرح کبھی اس کا دل نہ دکھایا۔ گور رفیعہ نے

سچے دل سے اسے معاف نہیں کیا تھا مگر اب پہلی سی کثرت

اس کے دل میں باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ

مستقل طور پر وہ ساتھ نہیں رہتا تھا۔ بس چھٹیوں میں آتا تھا

وہ بھی دو چار برس دن کے لیے۔ اظہر نے بی اسے کر لیا تو

پھوٹی اماں نے شادی کے لیے دھوم مچا دی۔ انہیں یہ خطرہ

پیدا ہو چلا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی ہو گئیں تو بیٹیا ہاتھ سے نکل جائے

گا۔ اظہر نے لاکھ غرافت کی مگر پھوٹی اماں اپنے فیصلے پر اٹل

رہیں۔ رفیعہ بہت خوش تھی کہ اظہر کی مرضی کے خلاف گئے

میں چھنا ڈالا جا رہا ہے۔ اس کا بس چلنا تو ہاتھ پاؤں میں ٹپاں

ڈال کر چھوڑ دیتی۔ رفیعہ نے رشیدہ کے ساتھ مل کر اظہر کو اتنا

چھیڑا کہ زندگی بھر کی کسر پوری ہو گئی۔ آخر میں اظہر نے بھنا کر دو

چائے رشیدہ کے کال پر رشیدہ کر دیئے حالانکہ رشیدہ کا قصور

اتنا نہیں تھا جتنا رفیعہ کا۔

”جوان بہن پر کوئی ہاتھ چھوڑتا ہے!“

پھوٹی اماں نے ملازمت کی۔

ایک دن جب گھر میں بہت مارے رشتہ دار جمع تھے

اور اظہر کے بیاہ کی بات بحیثیت ہو رہی تھی تو وہ اپنے کمرے

میں بیٹھا شب کو کمرے ہوئے بھائی میمون سے باتیں کر رہا تھا

اسی وقت رفیعہ کسی کام سے اس کے کمرے میں گئی تو اس نے

رفیعہ کو دلیل کرنے کے لیے بھائی میمون کو مخاطب کر کے کہا۔

”کیا یہ ہنگامہ ہے بھائی۔ ہ کون جا رہا ہے شادی کرنے

میں نے تو زندگی بھر رنی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کتنی

اچھی لڑکی ہے۔ بے چاری۔“

وہ ہنستے ہوئے اس بے حیائی سے بولا کہ ایک لمحے کے

لیے بھائی میمون بھی حمید پگئیں۔ حالانکہ بعد میں انہوں نے

پورے گھر میں ٹھنڈا درا پیٹ دیا۔

”خدا نے چاہا تو تمہاری زبان میں کیڑے پڑیں گے تو

وہ کمرے سے نکلے ہوئے جھپٹا کر بولی۔ مگر تھوڑی دیر بعد

جب وہ کوئی چیز لینے کمرے میں دوبارہ آئی تو بھائی میمون چاٹتی

تھیں۔!

”کیوں رنی جی! تمہیں میرے ساتھ رہنا منظور ہے یا نہیں؟“

اظہر کی آنکھوں میں اب تک شرارت ناز رہی تھی۔ رفیعہ

نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور جواب دینے بغیر جانے

کے لیے مڑی تو اظہر نے پیچھے سے اس کی لمبی چوٹی پکڑ لی۔

”چھوڑ دو مجھ کی بات نہ کر رہی ہے۔ دیکھو میں ابھی پھوٹی اماں

سے جا کر کہتی ہوں“ رفیعہ نے جھٹکا دے کر اپنی چوٹی چھوڑ دے

ہوئے رونا سنی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں سچ بیچ آنسو آ

گئے تھے۔

”سچ بتا دو رنی تم پر امان لگیں“

اظہر اس کا راستہ روک کر کھڑا تھا۔ رفیعہ کے پاؤں زمین

میں گر گئے۔ اور لاکھ کوششوں کے باوجود کھا جانے والی نظروں

سے گھورنے کے لیے اس کی بوجھل پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں چہرہ

دلکھ میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح دھنس کر رہ گئی۔

⚡

پھوٹی اماں کا خیال غلط ثابت ہوا۔ شادی کے بعد

بھی اظہر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ وہ تو ہر بھی بری

چیز کو کہتے تھیں میں اٹا دیتے کا عادی ہو گیا تھا۔ کچھ روز تک

رفیعہ اسے مروا دے نیازی پر مجبور کرتی رہی مگر بعد میں

بے نیازی سے جس کی حد تک بیچ کر اس کے سینے کا ناسور بن

گئی۔ دوسری عورت ہوتی تو اس پر ہر شے ایکے دور سے پڑنے

لگتے مگر وہ رفیعہ کو ضبط کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ ہر قدم پر آگ

آتی تھی کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے اتنی احتیاط کے بعد بھی ٹھوکر کھا کر گر گئی گئی آج وہ اظہر سے اتنا ہی دوسری جتنا شادی سے پہلے ... اظہر کی نگاہ میں اس کی کون سی بڑی اہمیت تھی کبھی اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اس نے بلکہ اسے یہ کہہ کر مذاق اڑایا کرتا تھا کہ "عورت ذات کی بحالت دیکھ کر تو بے چارے قادروں کی طرح بھی شرمندہ ہوجاتی ہوگی۔ بھلا اس روپے کے لیے اتنا جھگال اپنے سر لینے میں کیا مزہ ہے؟ تو گویا اس کی ساری خدمات کا یہی صلہ کہ اسے بھول لکھا جائے تو کچھ کے بعد آپریشن کروایا۔ مجھے نہیں چاہیے بٹالین، تمہارا کیا ٹھکانہ چوتھے پانچویں کی آند پر سدھار گئیں تو بے کمانڈر کی فوج ایک دم باقی ہوجائے گی؟"

اظہر سگریٹ کے لمبے دار دھوؤں کے درمیان ہستارہ۔
"تو کیا ہوگا میں نہ ہوں گی کوئی دوسری آجائے گی؟"
رفیعہ میاں کا دل ٹھٹھنے لگواولی۔
"بابا یا بکون ایسا بد قسمت ہوگا کہ ایک پھندا لوٹنے پر دوسرے گکے میں ڈال لے؟"

وہ ... زور سے ہنسا اور رفیعہ کا دل خون ہو کر بہہ گیا۔ وہ بیوی نہیں لگے کا پھندا ہے؟ ہائے ذرا بھی تو محبت نہیں تھی۔ اس کے دل میں کیس مزے مزے میں دل کی بائیں کہہ جاتا تھا۔ وہ تو شروع ہی سے سنجیدہ بالوں کو مذاق میں کہنے کا عادی تھا۔ شادی والی بات بھی تو اس نے ایسے ہی چھوڑ دیں تھیں کہہ ہی تھیں۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ساڈن تھی یعنی مفت کی کوٹری بنا لیا جائے اسے اس طرح زندگی بھر کا انتقام پورا ہوجائے گا۔ مگر وہ مجھ کی قدیم جھوٹی محبت کے پیار کے اس کھوٹے سبک پر زندگی بھر کا سودا کر ڈالا۔ کاش اس وقت اظہر سے اس کا الٹی بغض ہی اڑے آتا۔! کیا عاصم اور رشیدہ جیسا شوہر اسے نہیں مل سکتا تھا۔؟ اللہ میاں نے بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بچپن میں ماں باپ سے چھین کر چھپوٹی کے ٹکڑوں پر

ڈال دیا اور جب وہ اس قابل ہوئی کہ کسی کے پیار کو حیت سکتی تو اظہر بچ بچا بن گیا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کے رنگ میں جھنگ ڈال کر مٹاتا تھا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کا دل محبت کے میٹھے بول کے لیے ہمیشہ ترستا رہا۔ خالی غولی جرت بھی جینے کا بڑا سہارا ہوتی ہے۔ کیفیل بھائی کون سے رئیس شہر تھے مگر بھائی جیو نہ کی زندگی پر غمی تو ملی دھنیں تک رشک کرتی تھیں۔

بھائی بوڑھی ہونے کو آئیں مگر کیفیل بھائی اب تک ان کے نانا ٹھکانے رہتے تھے۔ ملازم بھاگ جائے تو ہٹیا چوہا نمک میں بیوی کا ہاتھ بٹانے سے نہیں چوکتے تھے۔ اور ایک اظہر تھا کہ پچھلے سو ملوار وہ ساری رات بیمار میں جلتی رہی اور جب صبح میں فلاں کی آنکھ لگی، تو اظہر نے فوراً اٹھا دیا۔
"رفی جی! مجھے دیر ہو رہی ہے ذرا جلدی سے اٹھ کر کپڑے نکال دو تو؟"

"ہائے اتنا بھی نہیں کر سکتے اپنے ہاتھوں سے اور اگر میں مچاؤں تو۔۔۔"

وہ آنکھیں ملے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"پھر کیا ہے جس کم جہاں پاک؟"

وہ حسب معمول مسکراتے ہوئے بے پروائی سے بولا اور کسی نے رفیعہ کا دل چیکو میں مل دیا۔ اتنا کچھ کرنے پر بھی اس کی موت کا انتظار دیکھا جا رہا ہے۔ اس کا دل پرکا چھوڑا بن گیا تھا۔۔۔۔۔ آج ایک بات آنکھوں میں تصویر بن کر پھر رہی تھی۔ ٹھیک کہتی تھیں پھوپھی اماں کہ اظہر کا ضمیر مٹی سے نہیں پتھر سے تیار کیا گیا ہے۔ جی تو اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں رفیعہ کو بڑی ادبیت ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ خود بھی اس بے رحمی کا شکار ہو گئی۔ ورنہ پہلی دلی رفیعہ ہوتی تو اس طرح دس سال تک زندہ رہنا محال تھا۔ جانوروں کی طرح پیٹ پالنا بھی کوئی انسانیت ہے۔ اس نے جب بھی کوئی بات سنجیدگی سے کہنے کی کوشش کی تو بات مذاق میں ٹل گئی کہ۔

پھندا زور اور میری جان فقط چند ہی روزہ بھاری بوجھ بھی دوکان دھوں پر پڑ کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر اظہر تو اس کا ذرا احساس نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتی تو ابھی پھوپھی چھوٹی باتوں کو کر کے گھر کو جنم بنا سکتی تھی مگر شادی کے بعد سے اب تک اس نے اظہر کے ساتھ مجھوتے کی کوشش کی تھی آدھی بات بھی منہ سے ایسی نہیں نکالی تھی جو اس کے جذبات کو جروح کرتی۔ مگر اس وقت تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اظہر آجائے تو ابھی فیصد کرے۔ اس آنکھ پھولی سے آخر کیا مفصلہ ہے تمہارا۔؟ کیا میں غنیم سے چھینتی ہوئی کینز مہوں کہ زمانا پر مہر لگے بڑی مہوں۔ تم انسان نہیں پتھر ہو۔ جس میں بیش ٹھونکنے کی کوشش بے سود ہے۔ تم زندگی کے چھوٹے بڑے کسی شے پر سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتے۔ شاید اس لیے کہ تم اپنے

چہرے پر فکر کی جھڑپاں برداشت نہیں کر سکتے ہو۔ تمہاری اگ سے جھٹکے ہوئے شعلوں کو تم قہقہوں کی پھونک مار کر پھیلنے کی ناکام کوشش اس بات کا ثبوت ہے کہ تم خود اس آگ میں جل کر رہا ہو جلنے سے ڈرتے ہو۔ تمہاری بے نیازی دراصل تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔

کتنی ہی باتیں تھیں جو اس کے سینے سے نکلنے کو تیار تھیں۔
 ”تم بھی عجیب کوہِ ذوق ہو، ذبیحہ و دوقم پر رہ کر بھی کائنات دیکھتے نہیں دیکھتے۔ انسان کو اتنا مردہ دل نہیں ہونا چاہیے؟
 میں چلائے ہوئے رشیدہ نے ذبیحہ کو یوں ٹوکا جیسے تینہ پر کمر رہی ہو۔ ذبیحہ نے نمائش کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا اور سوچتی بھی کیا نظر تو ایسا کوہِ ذوق تھا۔ کہ ان دس سالوں میں اس نے کبھی معمول کر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم جو اس پجرے میں مندر رہتی ہو کبھی باہر نکلنے کو دل چاہتا ہے تمہارا۔“
 نمائش اب جلنے والی تھی مگر اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ جھوٹے ہی منہ پوچھ لے۔

”نمائش دیکھنے چلو گی رخی۔“
 یہی بے اعتنائی تو ذبیحہ کے دل میں خاہشیں کر رکھتی رہی تھی۔ رشیدہ نے کئی بار چلنے پر اصرار کیا تھا مگر وہ میاں کے غصے میں ڈال گئی تھی۔ رشیدہ لاکھ سہی اپنی مگر تھی تو چھوٹی ننڈا پھر ذبیحہ خالی ہاتھ اس کے ساتھ کہاں جاتی۔

”آج اظہار کے بعد سنا چلو گی ذبیحہ۔“
 رشیدہ رشیدہ کا بگڑا ہوا موڈ بھانپ کر نہ بولی۔
 ”نہیں بھئی! بچے عید کے لیے بچوں کے پڑے سینے ہیں؟“
 اس نے خوشنودی سے ڈالنا چاہا۔

”چھوٹی جان کی طرح آپ بھی عید میں گامدانی کی ساڑھی مگائیے نا می۔“

غوثی جو پاس ہی بیٹھی ہوئی ابلے ہوئے اڑے کا چھک کا آثار رہی تھی بڑی عصویت سے بولی۔

”اے امی کیا یہ سچ ہے کہ انگریزوں نے ڈھاکہ کی محل اور گامدانی بنانے والے دستکاروں کے ہاتھ کاٹ دیئے تھے؟“

لوٹا گنج تیر کرتے ہوئے خاور میاں کا ذہن نہ جانے کہاں پرواز کرنے لگا اور ذبیحہ چوہنے ہی خیالوں کے مندرہ میں غوطے کھا رہی تھی۔ بیک وقت کئی سوالوں سے گھبرا گئی مگر خاور ملنے والا بت تھا۔۔۔ کیسے ہوا۔۔۔ اسے تو دماغ

چلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

”امی بولیں نا۔۔۔؟“ اس نے ماں کو خاموش دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

”میں نے تاریخ نہیں پڑھی ہے خاور بیٹے، جب تم ادبچے درجے میں پڑھو گے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“
 ”اس نے اپنا بیچھا چھڑانے کے لیے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا۔ حالانکہ اس وقت اس کا دل کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

”اے امی آپ نہیں منگائیں گی چھوٹی جان ایسی ساڑھی؟“
 غوثی نے اپنی باتوں کا جواب نہ پا کر سچ پوچھا۔
 ”اب تمہاری شادی پر ہمنوں کی گامدانی؟“
 وہ رشیدہ کے سامنے اپنے موڈ کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”نہیں امی غوثی کی نہیں میری شادی میں پہنیے گا؟“
 خاور نے ناپختہ ہوئے لٹو کو ہتھیلی پر لے لیا۔

”اونہہ! اڑے آئے پہلے میری ہوگی کہ تمہاری!“
 غوثی فرائی جھاٹتی ہوئی احتیاجاً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اور لاکھ غصے کے باوجود ذبیحہ بے اعتیاد ٹپٹپٹی۔
 کل رات نمائش سے رشیدہ اپنے لیے گامدانی کی جو ساڑھی لائی تھی اس کی جھک دمک نے خاور اور غوثی کو بہت متاثر کیا تھا۔ جس سے دونوں بھائی بہن کئی دفع اس کا ذکر کر چکے تھے۔ غوثی نے تو کئی مرتبہ نمائش ہی میں رشیدہ سے پوچھا۔

”اے چھوٹی جان ایسی فکر نہیں کیجی؟“ اور ہر مذہبی میں جواب پا کر مایوس ہو گئی تھی۔ مگر واپس آکر اس نے جو سب سے پہلی بات ذبیحہ سے کہی تھی وہ یہی تھی کہ ”امی چھوٹی جان بہت خوبصورت ساڑھی لائی ہیں جیسے انے سارے تارے ٹانگ دیئے گئے ہوں؟“ اور جب ذبیحہ نے دیکھنے کے لیے ڈبے میں سے ساری نکالی تو سچ آکھیں چند ہیا گئیں پونے پر رہی جان بنا ہوا تھا۔

”کتنے میں ملی۔“
 ”چھ سو پچیس!“ رشیدہ نے فخریہ ہجے میں کہا۔

”سی۔۔۔!“
 ذبیحہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ایک وہ ہے کہ دس سالوں میں کبھی تو کبھی جسم پر بھی ٹوہنگ کا کپڑا نہیں پڑا

اظہر کہ پہننے پہننے کا شوق ہی کب تھا۔
 ”کیوں نہیں پسند نہیں آتی۔؟“
 رفیعہ کہیانی سنی ہو گئی۔

”اس کا نیلا رنگ بہت ہی پیارا ہے۔ جیسے سچ آسمان
 پر تنا سے نکل آئے ہیں۔“

اس نے نفث مٹانے کے لیے دل کھول کر ساڑھی
 کی تعریف کی۔
 ”تو پھر دنگ کا لونام بھی اس میں کی ایک اور سچ رہی ہے
 اس کے پاس۔“

”اب یہ عمر کا دانی پہننے لگے ہے۔؟“
 ”حکمرتی ہو رفیعہ بس ان دس گیارہ سالوں میں تم
 اتنی بوڑھی ہو گئیں؟“
 ”تب اور کیا؟ وہ طنز ابولی۔

”چلو ہٹو! بندگی کا شوق چرایا ہو تو یہ الگ بات ہے
 ورنہ تمہاری عمر کی تو کتنی کنواریاں بیٹھی ہوں گی ابھی؟“
 رفیعہ ہنس کر سر پیچ ہو گئی۔ جی تو چاہتا تھا کہ کہہ دے
 تمہارے بھائی کو اتنی توضیح کہاں ہے۔ میں تو اسی دن بوڑھی
 ہو گئی تھی۔ جس دن اظہر سے شادی ہوئی تھی۔ میری جگہ پر کوئی
 دوسری ہوتی تو اتنے دن تو تو میں ہوتی رہتی ہی تو تم کتنی
 ہو کچھ کم مصیبت ہے۔ میں نے کہا تھا ”دیکھو اظہر رمضان آ
 گیا ہے تو اس نے بات پوری کرنے سے پہلے یہ کہہ کسا پنا
 بیچھا چھڑا لیا کہ ”ناقون میں تو غائب بھی کھایا کرتے تھے کون
 کہتا ہے تمہیں روزے رکھنے کو؟ اور جب میں نے کہا۔
 ”ریشیدہ بھی تو آگئی ہیں۔ تو کس بے نیازی سے فرمایا یہ نہیں
 تکلیف ہو تو کہہ دو جلی جانیں سچ بولنے میں کیا تکلف ہے۔“
 مطلب یہ ہوا کہ میں کچھ نہیں جانتا جو میں آئے وہ کرو کہتے
 ہر کار میں۔ چاہتے ہیں میں بُری بن جاؤں سب کی نظریں بخود
 بہن سے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ چلی جاؤ۔

ریشیدہ کے پاس کھڑے ہوئے اظہر سچ اچانک رفیعہ
 کی نظر پڑی تو قریب تھا کہ وہ ڈانٹا منٹ سے اڑ جانے لے
 پہاڑ کو طرح پھٹ پڑتی۔ مگر یہاں بھی اس کے ضبط نے سنبھال
 لیا اور اس نے یہ سوچ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کہ تھوڑی
 دیر کے لیے روزہ خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ اظہار کے بعد
 ریشیدہ سینا چلی جائے گی تو دل کی بھڑاس نکالے گی۔

نیارنگ
 نیا ڈھنگ

آپ کے پسندیدہ ماہانے



عمران ڈائجسٹ

کے شمارے کو
 دل چسپ کہانیوں سے سجایا ہے
 اب عمران ڈائجسٹ میں ہر ماہ
 جیمس ہیڈلے چیز
 کا مکمل ناول دیا جاتا ہے
 چمپا کلی
 اور ایک اور حقیقت سے قریب تر
 حیاتِ انجیز سلسلہ وار کہانی
 ملک کے مشہور لکھے والوں کی حیاتِ زندہ کہانیاں
 اس ماہ کے شمارے میں پڑھیے
 آپ کا اپنا

عمران ڈائجسٹ

ہر بکسٹال پر دستیاب ہے!

تنبہائی تھی۔ اس بھری دنیا میں وہ تنہا پیدا ہوئی تھی اور اب تک تنہا ہے۔ اس کا دل ایک مرتبہ پھر انڈے لگا۔ سیکہ پہلے ہی بھیگ چکا تھا۔

”کیوں رنی جی! اب بھی روزہ لگ رہا ہے۔“ دیکھونا میں تمہارے لیے مدد کی وہ ساڑھی خرید لایا ہوں۔ جس کے بارے میں رشیدہ کہہ رہی تھی۔ اب بچوں کے کپڑے تم خود خرید لوگی، ہے نا۔“

اظہار نے پت لپیٹی ہوئی رفیعہ کے سینے پر ساڑھی کا خوبصورت ڈبہ رکھ دیا۔
”ہو بھی، مجھے یہ مذاق...“ رفیعہ ایک دم بلبل اٹھی۔

”کیا ہوا۔“
اظہار بھونچکا دکھ گیا مگر دوسرے ہی لمحے بھیگے ہوئے ٹیکے پر نظر پڑی تو سنبھل کر بولا۔

”جانتا ہوں رنی تمہیں میری وجہ سے بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں مگر یقین کرو اب تمہیں کبھی نہیں ستاؤں گا۔ میں نے بچوں کی تعلیم کے لیے جو بیکریاں کرائیں تھیں اس کی مدت پوری ہو گئی آج کاغذ بھی لگ گیا ہے۔“
”اب کیا کہا۔“

کسی نے ابلتے ہوئے دھارے پر بند باندھ دیا۔
یہی کہ دس سال پہلے جو بیکریاں کرائیں تھیں آج اس کی مدت پوری ہو گئی ہے۔ میں نے بار بار کوشش کی تھی کہ کھانے بتا دوں مگر...“ وہ چپ ہو گیا۔ شاید اس وقت بھی اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ رفیعہ کا منہ حیرت سے یوں کھلا تھا جیسے کہنا چاہتی ہو۔ یہ سب جھوٹ ہے سراسر جھوٹ ہے کہیں تم جیسا بے حس انسان بھی زندگی کے سنجیدہ مسائل پر سوچ سکتا ہے۔

”کیا پھر جھوٹے ٹھانوں سے شکایت کرنے کی سوچ رہی ہو رنی جی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکایا۔
”تم کتنی اچھی ہو کہ کتنی پیاری ہو رنی! اسی لیے تو میں نے زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج اگر خدا خواستہ تم نہ ہوتیں تو میری یہ چھوٹی سی جنت... اس کی زبان خود بخود رک گئی اور رفیعہ کا دل چاہا کہ وہ تمام عمر اسی طرح بولتا ہے۔

”آج افکار کے بعد راتیں جلا جائے کیا خیال ہے رنی جی۔“ وہیں دو تہہ گئے ہیں دیکھنے کو، اب بھیڑ بھاڑ بھی کم ہو گئی ہوگی۔“

اظہار غیر متوقع طور پر باورچی خانے میں اپنے کمر فیسے سے بولا۔ مگر رفیعہ کے غصے کی آگ ٹھنڈی کیا ہوئی کہ اتنا شعلہ بھڑک اٹھا۔ شاید اب تک وہ بھی بھڑکے کہ رفیعہ اتنی بے وقوف ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی۔ آخر ایک ہیٹھ سے یہ بات ذہن میں کیوں نہیں آتی تھی۔ اتنی انہی تو نہیں ہے وہ کہ دل کا چور بھی نہ بچاں سکے۔ اسے اپنے حلق میں تھوک گولہ بن کر لگا ہوا محسوس ہوا۔

”کیا ہوا آج روزہ لگ رہا ہے۔“
اظہار نے کوئی جواب نہ دیا کراپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے جلنے ہوئے گال چھو لیے۔

”مجھے یہ چھوٹے اچھے نہیں لگتے!“
وہ اس کا ہاتھ جھٹکنے ہوئے تڑپ کر بولی۔ جیسے پھوٹنے اس کے گالوں پر ڈنک ماریا ہوا اور جب اظہار کوئی نوش لے بغیر ہنستا ہوا باورچی خانے سے نکل گیا تو ایک مرتبہ پھر اس کے دل میں سینکڑوں نشتر لوٹ گئے۔

رفیعہ نے پیٹ میں گدائی کا بہانہ کر کے رشیدہ، اظہار اور بچوں کے ساتھ روزہ افطار نہیں کیا۔ پانی سے روزہ کھول کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہی اور جب اظہار رشیدہ کے سینہ جانے سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا تو وہ کچلی ہوئی ناگن کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔ رشیدہ غوٹی اور خادو کو ساتھ لے کر سینہ چلی گئی۔ مگر اس نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی تک نہیں لگائی ایک گھنٹے تک لیٹر بریوں کو گم سم لپیٹ رہی جیسے عذاب خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ جس کے سینے پر صدیوں پرانی تاریخ کا وزنی پتھر رکھا ہوا ہو۔ پھر یہ پتھر ہٹ گیا اور اس کے پیچھے دہی ہوئی روح بلبل اٹھی۔ وہ ٹیکے سے پیٹ کر جھوٹ پڑی۔ اس کا سارا وجود بچھلے ہوئے موم کی طرح بہہ رہا تھا اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ نوزی جو دوسرے کمرے میں سو رہی ہے اٹھ جائے گی۔

جب آئینوں نے دکھائی ہوئی جھٹی کو کسی حد تک ٹھنڈا کر دیا تو وہ اپنی زندگی کے دیوان گوشوں میں بھانکتی پھر پڑ گئی۔ جہاں غموں میں تھیں۔ تاریکیاں تھیں۔ سناٹا تھا... بھیاں تک



محبّت آشنا

افسر سلطان



سنجے ہی بات کر لیا کہ رشیدہ - راجہ تم سے عمر میں کم ہے
 سچ بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بہت کوشت ہوتی ہے۔ لگتا ہی نہیں
 اس گھر میں دو عورتیں رہتی ہیں۔ مرزا صاحب ان گھبراہٹوں میں سے
 تنگ آتے ہوئے ہوتے۔

”مرزا صاحب! رشیدہ بیگم کی ساری تلخیاں ہیجے میں عود
 کرتا ہوں۔ شادی کی اجازت دینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر معاملے میں
 ٹھیکتی چلی جاؤں گی اور اتنی عمر نہیں میں راجہ بانو چھٹی آپ سے سچے ہیں
 رہی آپ کی گھبراہٹ اور کوشت تو آپ ایک شادی اور کر لیں۔
 مجھے دو روٹیاں دینے بیٹھے گا۔ اس لئے.... اس لئے کہ یہ طائفہ
 کہلوانا نہیں چاہتی“

رشیدہ بیگم کی آنکھیں جھلکیں تو مرزا صاحب کا کلیہ کٹ کر رہ گیا۔
 یہ حقیقت تھی کہ وہ رشیدہ بیگم کے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس
 بات کا گواہ سارا ہی عقد تھا۔ اپنی کھوپڑی کی ڈکان تھی۔ وورٹے ساتھ
 میں کام بھی کرتے تھے لیکن بہر حال ٹھکان تو ہو ہی جاتی تھی۔ پھر بھی
 جیسے ہی گھر میں گھستے اور رشیدہ بیگم سر میں پٹیاں باندھ لیتیں تو ساری
 ٹھکان بھول باورچی خانے میں گھس جاتے۔ صبح ناشتے میں مرد دنیا
 ایک ایک چیز کا خیال رکھنا اور اس پر بھی رشیدہ بیگم کی آوازیں
 عود پر پہنچتیں تو میں میں کرتے رہ جانا مرزا صاحب کی کا دل گروہ
 تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب چالیس سالیں سال کے تھے اور بیوی
 بیس بائیس سال کی۔ اوپر سے شکل صورت بھی معمولی نہ تھی۔ جوان
 اور خوبصورت بیوی کے ملنے ہی مرزا صاحب مجھے ساری دنیا کی
 دولت ہاتھ آگئی۔ دنیا کا کوئی پوش نہ رہا۔ اپنی فقر سی دنیا میں ایسے
 گن ہونے کو آگے کے متعلق کچھ بھی نہ سوچتے۔ خوب کمائی تھی دنیا میں
 ٹھکان مسکرا نہیں تھیں۔ مرزا صاحب کی تو نعمت ہی بدل گئی۔ کم عمر
 بیوی کے چلنے چوٹ اٹھا سکتے تھے۔ جتنے ناز خرچے سہم سکتے تھے
 سب ہی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے اور اس محبت کا
 تقاضا تھا کہ وہ بھول کر بھی دوسری شادی کے متعلق نہ سوچتے۔
 اولاد کی تنہا اپنے نام کو آگے لے جانے کی خواہش نے مرزا صاحب
 کو بار بار اکسیا یا۔ وہ کافی عرصہ اس تناکودل ہی دل میں گھومتے
 رہے۔

لیکن
 مرد کی آنکھ بدلے لگتی دیر لگتی ہے۔ یہ ساری محبت سارا
 لاؤ اس وقت دھرا کا دھارہ گیا جب بیس سال گزرنے کے بعد
 بھی رشیدہ بیگم نام نہ نہ سکیں۔ لمحہ لمحہ مدت واری ہونے
 والے مرزا صاحب کا مزاج ہی چوٹ ہو گیا تھا۔ ایسے گھر سے
 اکھڑے رہتے، پیشانی پر ہاتھ تکیں کہ رشیدہ بیگم سارا ناز خرچہ

بھول گئیں۔ وہ وطن، وہ چھینا چمکا ناوہ روٹھنا سب ہی تو ہوا
 ہو گیا۔ اب ان کے آنے سے پہلے ہی وہ مندرست و نوا نا ہو کر
 خدمت کے لئے تیار ہو جاتیں
 ”کھانا لے آؤں؟“ وہ سہے سہے انداز میں پاس آ

کھڑی ہوتیں۔
 ”نہیں۔ کھالیا تھا؟“ وہ غلاؤں میں گھورتے گھورتے لگا
 سا ہاتھ پر رکھ دیتے۔
 ”چائے پی لیتے؟“ وہ جلدی سے ٹرے میں بڑے سلیقے
 سے چائے سی کرتے آتیں۔ وہ اتنے سارے خلوص پرورداسی
 مروت دکھانے کے لئے کپ ہاتھ میں پکڑ لیتے۔
 ”بڑی بد مزہ ہے“

ایک گھونٹ پینے کے بعد پورا کپ واپس رشیدہ بیگم
 کے ہاتھ میں آجاتا تو وہ اندر ہی اندر گھونٹنے کے بعد بھی دلی ذہنی
 ہی رہتیں۔ وہ زنجیر کہاں تھی جو میاں پوری کو تلخ حالات میں بھی جھٹکتے
 رہتی ہے۔ وہ مضبوط پھندہ ہی نہیں تھا کہ مرزا صاحب اور
 رشیدہ بیگم ایک دوسرے سے الگ ہونے کی بھی نہ سوچتے
 پھر مرزا صاحب بالکل ہی بدل گئے تھے۔ یہ بات صرف رشیدہ بیگم
 ہی جانتی تھیں۔

اور
 لوگوں کی آنکھیں ایک باپھی کی بھیڑی رہ گئیں... سارے
 لوگ حیرت کے مارے دم بخود تھے۔ مرزا صاحب شادی کر رہے
 تھے۔ دوسری شادی اور وہ بھی اٹھارہ سال کی لڑکی سے۔ دولت
 کا جادو بھی کیا چیز ہے کہ اس کے اثر سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔
 ”کمال ہے...“ مرزا خان نے کانوں کا ہاتھ لگاتے ہوئے کہا
 ”جدھر ہاتھ ڈالیں مرزا صاحب کامیابی قدم چومتی ہے۔ کیسے مزے
 سے لڑکی ہاتھ لگتی؟“

”دیکھ... دیکھ بیٹا رشیدہ بیگم آنے والی کو کچا ہی کھا
 جا میں گی۔ کیسی میاں کی ڈرگت بناتی تھیں۔ گھر میں گھستے ہی چوٹے
 میں چھنے پھنچ جاتے تھے۔“ راجہ کی آواز نے سرگوشی کرتے ہوئے تیار
 بالکل ہی ملاوٹا گھر تھا انداز تو کی اماں رشیدہ بیگم کی رتی رتی خیمہ
 رکھتی تھیں۔

لیکن
 سب کے خدشات خدشات ہی رہے حقیقت کا روپ
 نہ دھتار سکے۔

رشیدہ بیگم نے کچھ بھی نہ کہا سوائے اس کے کہ رات کے ہمک
 بھگت بھگت اپنے کمرے میں سسکتی رہیں۔ اور ساتھ ساتھ سوکھ سوکھنے

دیسے جاہلین۔ شاید یہ ان کی آہوں کا اثر تھا کہ راجہ بیگم بھی یوں ہی محروم رہیں۔ نہ لڑکا نہ لڑکی... مرزا صاحب کی توجہ پھر بھی نئی بیوی کی طرف زیادہ رہی۔ رشیدہ بیگم اب بھی خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ راجہ بانو سے توجہ سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا مرزا صاحب سے بھی بس مختصر سی گفتگو اور لمبی لمبی اور طویل خاموشیاں جو مرزا صاحب کو توجہ بھی نہ خود مرشد بدہ بیگم کو اتنا پریشان کرتیں کہ رونا سنت کرتے سب کچھ بدل رہا تھا اور اعصابی تناؤ کی شکل میں جلدی سامنے ہی سامنے آگیا۔ وہ بھی اپنی غمگینی ایک... منہ سے بھاپ نکالتیں بس اندر ہی اندر گڑھ گڑھ کر پڑیوں میں اضافہ کرتی رہیں۔ اور مرزا صاحب اس دھانچے کو دیکھ کر عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوتے گئے۔ راجہ بانو نے تین سال کے بعد چوتھا سال کو بھی بنت دیا۔ اس دوران کچھ عرصہ کسی بچے کی کوئی نگہاری سامنے نہ دی۔ کسی بچے کی مسکرائشیں مرزا صاحب کی زندگی میں خوشیوں کے دیپ نہ جلا سکیں۔ !!!

ایک بڑی تبدیلی جو رشیدہ بیگم میں آئی وہ ان کی آواز کا جو دھن تھا۔ جو ایک بار پھر سر جھک کر بول رہا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں بیٹھی اوٹ پٹائی بولا کرتی۔

وجہ شاید یہ اہتمام کمزوری تھی جو چڑچڑاہٹ پر اور غصے کی شکل میں ابھرتی تھی۔ وہ بات سے بات مرزا صاحب کو مرزا صاحب راجہ بانو کو بھی سامنے رہتیں۔ عجیب عجیب سے طعنے۔ ظاہر ہے حکم کھلا مگر مدد نہ تو کچھ کہتی تھیں اس لئے راجہ بیگم بھی اپنے کمرے میں سوائے کھو لئے اور چلنے کے کچھ نہ کر سکتی تھی یا کچھ وہ اپنا سارا غصہ رشیدہ بیگم کی طرح مرزا صاحب پر اتار کر لیتیں۔ مرزا صاحب کینڈیوں پر تھک دھڑکے وقفے وقفے سے اپنی دونوں بیویوں کی باتیں سنتے رہتے۔ انہوں نے کاہے کو بہ سب سوچا تھا۔ ایک بیوی کا اولاد نہ پیدا کر سکی تو دوسری ان کا نام روشن کروا دیتی۔ صبح شام کی حج حج بیچنے سے پریشان کھنڈوں بوس میں بیٹھے ہتے دونوں ہی تو باری باری ان کا اکٹو ناہیجا کھا کھا کر بھی نہ تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ہر مرتبہ یا تو اپنے ہتھکڑوں کو کھینچتے یا ان کھنڈوں پر لعنت بھیجتے رہتے جب ان دونوں کو بیاہ کر لائے تھے۔

پورے آٹھ سال بعد پھر ایک زبردست بھونچال آیا اور اس کی زمر میں رشیدہ بیگم اور راجہ بانو برابر باری کی شریک تھیں۔ مرزا صاحب نے تیسری شادی کی اطلاع دی تو رشیدہ بیگم تڑپ کر بھی وا کر گئیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر ضرور کرو... اس بار بھی منہ کی کھاؤ گے“

دونوں بیویوں کا تسنن انداز سچی کو ایسا کاٹتا کہ مرزا صاحب کی پسلی اور آخری تھانیں جند کا غصہ بھی شامل ہو گیا۔ اور

پھر دوستوں کی مدد سے مرزا صاحب کو تھوڑی ہی بھاگ دوڑ کے بعد اپنا گھر مقصود گوہر جہاں کی شکل میں مل گیا۔ گوہر جہاں بیوہ تھیں۔ عمر بھی رشیدہ بیگم اور راجہ بانو سے بڑی اس لئے وہ ان دونوں کے ساتھ کیوں نہ جاتیں۔ لہذا مرزا صاحب کے گھر میں اب تین عورتیں تھیں اور تینوں آپس میں بات چیت تو کیا شغل بھی دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ نئی بیوی کے جو بیچلے ایک بار کچھ پر پونچ گئے مرزا صاحب اگر گوہر جہاں کو لے کر کھوئے نکل جاتے کہتے وہ رشیدہ بیگم اور راجہ بانو سے بھی تھے لیکن دونوں ہی بڑی خوبصورتی سے انکار کرتیں اور اپنے کمرے میں بیٹے پر کوسے تپا پ لے کر کوستی رہتیں۔ یہ کو سنے گوہر جہاں کے لئے بھی ہوتے اور غصے آنے والے جہاں کو بھی نہ بٹھا جاتا۔ گوہر جہاں ٹوہر کے نزدیک ہو جاہلین یہ نہ راجہ بانو جاتی تھیں نہ رشیدہ بیگم۔ ہر بار کو سنے بھی نیٹے۔ دل سے بھی چاہیں قدرت کو جو منظور تھا وہ ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ مرزا صاحب کی پہلی اولاد اور وہ بھی لڑکا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ دنیا کو کس طرح بتادیں۔ کیسے اپنی ترسی ہوئی خوشیوں کا اظہار کریں۔ مرزا صاحب اور گوہر جہاں کی خوشیوں میں راجہ بانو اور رشیدہ شامل ہوئیں۔ عزیزوں میں خیرات بڑی فراخ دلی سے بٹوائی۔ مہا لڑکی کی خاطر قرآن بھی کی اور مرزا صاحب کو مبارکباد بھی دیتی رہیں۔

مرزا صاحب سمجھتے تھے اس خوشی میں سبند بائیں ضرور کھل جائیں گی۔ مستقل طویل طویل خاموشیوں سے بچات مل جائیگی ذہنی کوفت سے چھٹکا مارا حاصل ہو جائے گا لیکن مرزا صاحب کی خوش فہمیاں خوش فہمیاں ہی رہیں۔ تین عورتیں اور اچھین بڑھا والی مرزا صاحب کی تنہا زندگی۔ کیسے سنائے دوڑتے تھے چاروں طرف۔ مرزا صاحب گھر کر باہر نکل جاتے۔ خوشی بھی تو کیسی ادھوری بڑھاپے کی پریشانی اور وہ ہوتی تھی تو کیسی نامکمل !!!

○
کے تینوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ گوہر جہاں بچے کو لے کرے میں بیٹھی رہتیں۔ مختصراً بیچ کر دوتا تو رشیدہ بیگم اور راجہ بانو باری باری کھڑکی میں سے سر نکال کر بے چینی سے دیکھتیں اور اندھ ہو جاتیں۔ پھر مرزا صاحب نے بیٹے کے آبا کا انتقال کیا تو وہ اسے صحن اور لان میں لے لئے پھر پتی ممتی۔ یوں تو بچہ مکمل طور پر آبائی متول ہیں رہتا لیکن اس پر نگاہیں گوہر جہاں کم اور رشیدہ بیگم اور

راجہ بانو یا دہ رکھتیں۔ کچھ کیا پہنے ہے، وہ وہ کس وقت آیا گیا، سو یا کس وقت، کب اٹھا۔ آیا بچے کے کام کرنے سے پہلے ہاتھ دھوتی ہے یا نہیں، بچے کی پہل کرے تو آباد و بارہ مہینے دینے سے پہلے صاف کرتی ہے یا غرض دیتی ہے، اس کی رتی جڑی جانے لگی۔

لیکن

یہ سب کچھ خاموش تماشا یوں کی طرح دیکھا ہی جاتا رہا۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ گوہر جہاں کو کرے کی تکلیف شروع ہوئی تو۔ وہ صبح دیر سے اٹھنے لگیں۔ اس دن گوہر جہاں کو سوتا دیکھ کر آئے بچے کو اٹھایا اور باہر لے آئی۔ رشیدہ بیگم بہت دیر تک اپنے ہی کمرے میں سے چھپ چھپ کر دیکھتی رہیں۔ بھی اس کھڑکی سے کبھی اس کھڑکی سے میرے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس قدر تیری سے باہر آجیں کہ خود کو بھی پتہ نہ چلا کہ کیا رہی ہیں۔ گلابی کپڑوں میں لپٹا ہوا روٹی کے کالوں کی طرح نرم نرم گڈا.... پھر نہ جانے کیوں اچانک راجہ بانو کے کمرے کی طرف نظر ڈالی تو جلدی سے آیا کو دیکھا۔

”ادھر... ادھر لے آئے میرے کمرے میں“

وہ مہی ڈری رشیدہ بیگم کے پیچھے پیچھے آگئی۔ اس سے بھی تو کوئی بات نہ کرنا تھا۔

”پتو... ادھر آ بیٹا... آ بالاجھے دے“ انھوں نے مامتا کے جذبے سے مجبور دیکھتے دیکھتے پتو کو کھینچے لے گا ڈالا اور گرم گرم مہکی آغوش اور مہکا مہکا وجود پتو کو شاید آسے زیادہ اچھا لگا جیسی تو وہ بھی بیگم کی جیل حجت کے مسکرانے لگا۔ آبا میں فزٹش یہ بیگم کی مسکراتی رہی۔ وہ بھی آئے دن کی مسکوں کی لہچچا تانی سے ابھی طرح واقف تھی۔

”دیکھیں بیگم کیسا خوش ہے؟“

”ہمارا بیٹا جو ہوا“ انھوں نے پیار سے کسی مرتبہ پتو کی بیٹھائی جو ہم ڈالی۔ پتو وہ ہو کر لٹے لٹے باہر آ گئیں۔ مرزا صاحب نے شام کو پتو رشیدہ بیگم کی گود میں دیکھا تو کبھی جس طرح ہونے کوہر جہاں کی گود سے رشیدہ بیگم کی آغوش تک فاصلہ طے کر ڈالا ہے اسی طرح ایک دن بولنے کا سلسلہ بھی حل ہو جانے لگا۔

لیکن

ایسا نہ ہو سکا۔ پتو رشیدہ بیگم سے راجہ بانو اور راجہ بانو سے گوہر جہاں تک منتقل ہونا رہا۔ بازوؤں کے خلعے ٹوٹے پتے بندھے تھے لیکن نہ بان کے قتل نہ بھلے۔ چند ماہ بعد آیا کی بھی چھٹی کر دی گئی۔ عورتیں ایک بچہ۔ بعض مرتبہ تو گوہر جہاں بھی اپنی باری کی منتظر رہتی کیونکہ بچے کے معاملے میں وہ کبھی کبھی عورت ہو کر سوچا کرتی تھیں۔

ایک ماں بن کر خیال آہی جاتا تھا کہ وہ دونوں عورتیں تو اس منت سے مکمل محروم ہیں۔ اگر چند لمحے اس طرح تری ماں کو ٹھنڈک مل جاتی ہے، تشکین حاصل ہو جاتی ہے تو ان کا کیا نقصان ہوتا ہے اور پھر ایک گھر میں رہ کر یہ کیسے ممکن تھا کہ پتو سوتلی ماں سے الگ ٹھنڈک رہتا، اس لئے کبھی کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی۔

پتو جیسے جیسے بڑھا ماؤں کے رشتوں میں بھڑکی سی آتی رہی بھی ناموں کے حوالے سے کڑائی، لیکن بڑی اماں، چھوٹی اماں اور اماں جانی کی محبتوں میں کوئی فرق محسوس نہ کر سکا۔

”بڑی اماں مجھے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ وہ رشیدہ بیگم کے پیچھے اپنا پٹنسا دھو دھوٹیک دیتا۔

”جاؤ اماں جانی سے کپڑے لے آؤ، وہ اسے گوہر جہاں کے پاس بھیج دیتی ہیں۔

”بیٹا کپڑے چھوٹی اماں نے دھو کر جیت پر سکھائے ہیں وہ لیٹے لیٹے کروٹ لے لیتیں۔ پوچھوئے چھوئے پیروں سے دوڑتا ہوا راجہ بانو کے گلے میں جھول جاتا اور یوں... اپنی لاڈوں میں پل کر حب وہ چار سال کا ہوا تو مرزا صاحب نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ صبح صبح بھاری بستہ اٹھاتا ہوا مرزا صاحب کے ساتھ ساتھ تینوں کو خدا حافظ کہتا تو سب ہی اس پر باری باری گرائی آیات دم کرتی جاتیں۔ وہ ایسا بھاری سانسستہ اور نشن اٹھا کر بس کے بارن کی آواز پر بھاگ جاتا اور وہ تینوں اسی وقت سے اس کا انتظار شروع کر دیتیں۔

نچھا ڈال کر جب آفس سے واپس آتا تو پھر پورے سواگت شاندار استقبال دیکھ کر حیران حیران ماؤں کو دیکھتا رہتا۔ گوہر جہاں کھانا لاکر بھی نہ رکھتیں کہ راجہ بانو پانی لینے دوڑ جاتیں، رشیدہ بیگم کبھی پکھا تیز کرتی کبھی کم... وہ منید میں جھومتا جھومتا چند لمحوں کے طے سے اتار کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر اس کی مرضی تھی وہ چھوٹی اماں کے کمرے کی طرف جاتا۔ رشیدہ بیگم کے پاس سوتا یا گوہر جہاں سے کہا یا اس میں کس کو روری دور گر ادو دیتا۔ رات کو بھی یہی سلسلہ جاری رہتا۔ گوہر جہاں پڑھانے بیٹھتیں کوئی کام یاد آتا تو اسے بوہی بھوڑ کر کے کی طرف دوڑ جاتیں۔ تنہا دیکھ کر رشیدہ بیگم آ بیٹھتیں۔

”پوٹو بی اماں سے کہنا اردو میں پڑھاؤں کی۔ راجہ بانو کھڑکی میں بٹھا کر دیکھتیں اور پھر وہیں سے چلا بیٹھتیں۔“ بڑی اماں آ کر وہ چھوٹی اماں پڑھانے لگی۔ وہ بازو لگا کر راجہ بانو کا وہ پیغام جو رشیدہ بیگم پہلے سے چکی ہوئی

تھیں ان تک پہنچا دیتا۔

”میرا بیٹا کیسا ہے؟“ انھوں نے اس کی جلتی پیشانی پر ٹھنڈے لبوں کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔

اب میں بیٹھوں گی اپنے چاند کے پاس : بیو کا ننھا سا ہاتھ اپنی مٹھی میں لپیٹے ہوئے انہوں نے پٹنگ پر تجھ بانی۔

گوں جہاں اپنا تھا تھا خود اور لرزا دل سنبھالے
و منو کرے چلی گئیں۔ منو لوٹ لوٹ کر دیکھی دامن میں جذب
ہوتے رہے۔ رشیدہ بیگم راغبہ باؤ کو پوچھا گوں جہاں کو اللہ
کے حضور مصروف دیکھ کر خاموشی سے ہمارے چائے میں پہنچ
کر جلد جلد ناشتہ تیار کرنے لگیں۔ پہلے مرزا صاحب کو ناشتہ
دیا۔ پھر بے حد سادہ اور مختصر سا ناشتہ تھڑے میں لکھ کر کپ
میں آگئیں۔ وہیں زمین پر بیٹھ کر کئیوں نے ناشتہ کیا اور بیٹے
کے پاس بیٹھ گئیں۔

”بیٹا آپ لیٹیں میں دوپہر کا کھانا پکا لوں“ گوسہا
کھڑی ہوئی تو رشیدہ اور العزیز بھی اُٹھیں۔ دوپہر کے
کھانے پکانے سے تو فرصت ہوئی تھی۔ رشیدہ بیگم میں کھانے
لئے آئے ہوئے وال جاؤں صاف کرنے بیٹھیں اور رائیجا نو
اپنی میٹھی تربے لگیں۔ ساتھ بیوہ کو دوا بھی دی گئیں۔ بیات بھی
کیں۔ کچھ بدلے، منہ صلا بآ اور کھڑا اسادو دھ بھی اُڑھتی
یلا دیا۔

اتنی توجہ، اتنی مکمل تیار و اداری کے باوجود بھی سچی طبیعت میں دُورہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ بخار کے ساتھ تپ میں بھی ایسا شہید و دراختہا کہ بچہ کی تڑپ سے رشیدہ یکم، رابعہ بانو اور گوہر جہاں بھی ایسا ملک ملک کر رہیں کہ مرزا صاحب کو یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ ان بیٹوں میں بچہ کی سچی ماں کون ہے، مامنت کا نور کس چہرے پر زیادہ برافشا ہے۔ جہتوں کی شدت کا عکس کس چہرے پر زیادہ جھلک رہا ہے۔

پھر ایک دن مہواس شہرت سے تڑپا کہ بے ہوش ہو گیا۔
مرزا صاحب ڈاکٹر کو بلانے لائے۔ پتے کو اسپتال میں داخل کر دیا
ویا گیا۔ لیکن وہاں پر بھی پندرہ دن ایڈمیٹ ہونے کے بعد
ڈاکٹروں نے جواب دیا۔

”بچہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے۔“

ڈاکٹر کو کہہ کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی مینوں گھنٹوں
مسجد سے میں گری پڑی رہیں۔

”مرزا صاحب! شاید گوہرنے بکرا منگوا لیا ہے۔ کہیں

اس دن برابر والے گھر میں حاجی صاحب کا احاطہ
بارت فیل ہوا تو مرزا صاحب جو اس ہاختہ اندر داخل ہوئے۔
”گھر میں تینوں فوراً چلی جاؤ۔ جاؤ ورنہ شیدہ اور ربیعہ
سے بھی کچھ ہو.... ابھی دس منٹ پہلے ہی تو میں ملاقات خان سے۔
کیسی عجیب چیز ہے یہ زندگی بھی... لمحہ بھر میں غائب اور اس
پر بھی ہم سب کتنا غور کرتے نہیں۔ کیسا نبض اور کنبہ رکھتے
ہیں دل میں؟ وہ تینوں کو سنانے ہوئے ہوئے۔

”جائیں گے مرزا صاحب جائیں گے۔ آخر ہمارے پرانے جلنے والے تھے۔ رشیدہ بچک بات کا مطلب سمجھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رابعہ بانو نے بھی دو کپڑے بھوکا لیں۔“

”جاؤ بیٹا... آماں جانی ہے کہ وہ بھی تیار ہو جائیں۔“

انھوں نے نوکر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بھی آگ کر گھر جان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ بھی
پیشانی سے تیز تیز سبزی کاٹے جا رہی تھیں۔
”آماں جانی۔۔۔ جلدی سے تیار ہو جائیں“

اور
پتو کا لایا ہوا پیغام سن کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
رات کے سبک دینوں مرزا صاحب سمیت حاجی صاحب
مرحوم کے گھر والوں کو کسی دینی رہیں۔ سب عورتیں حیرت
سے ان مینوں سوکھوں کو تنگے گئیں۔ کیسا الیکا ہے کیسی محبت
لیکن لبوں کی جنبش انہیں کتنا دور رکھے ہوئے ہے کسی کو
خبر بھی نہ ہوئی۔

پھر سو اچانک بیمار ہو گیا۔ ایسا تیز بخار چڑھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ مرزا صاحب کے دل کا جو عالم تھا سو خدا کو مہربان کی طرح تشدد سے دیکھ اور اراکین خانہ کا تڑپا بھی کسی سے پوشیدہ نہ رہا۔ تیار داری میں بھی نینوں کا برابر برابر کا حصہ تھا۔ رات ایک بجے تک تشدد بڑھتا ہی رہا۔ مرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک دن صبح کو پھر تشدد بڑھ گیا۔ مرزا صاحب کی حالت اب اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ ان کے پاس سے کسی کو بھی نہ لے جاسکتا تھا۔ ان کے پاس سے کسی کو بھی نہ لے جاسکتا تھا۔ ان کے پاس سے کسی کو بھی نہ لے جاسکتا تھا۔

”میرا بچہ... میرا بیٹا اب چار بجے دوپہے کا زمانہ
پر رہ سکتے اور چھ بجے بارگاہ اور یہ سنتی ہو گویا نیند
بھری آنکھیں کھول کر پاس نہ بیٹھیں۔ ابھی چار بجے کچھ اور
وقت تھا کہ رات نہ آنا آگیا۔“

راہبہ بانو ساری گفتگو سن رہی تھیں اس جلدی سے خود ہی اٹھ آئیں۔ کہیں وہ مزید سوالات کی بھرمار راہبہ بانو سے بھی نہ کر بیٹھے۔

مرزا صاحب کے آتے ہی سب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔
 ”لیجئے مرزا صاحب... کباب چکھیں“ رشیدہ بیگم نے پلیٹ مرزا صاحب کی طرف بڑھائی اور چہرہ پاس بیٹھی ہوئی راہبہ بانو کے پاس پلیٹ رکھ دی۔ انہوں نے ایک کباب اٹھا کر پلیٹ کو گوبر جہاں کی طرف بڑھا دیا۔

”اماں جانی آپ بھی نہیں بولیں گی نا؟“ راہبہ بانو کو وہ شوخ سلکھا ہے تھے، افر فریو لے جا رہا تھا۔

”اماں جانی آپ کہیں نا بڑی اماں سے کباب کے لئے“
 ”کھائے بیٹا آپ کھانا کھائیں“ رشیدہ بیگم نے جلدی سے پتو کی پلیٹ جاووں سے بھر دی۔

”ساتن بھی ڈالیں بیٹا“ گوبر جہاں نے زبردستی سمجھے بیٹا سالن بھی بھر دیا تو مرزا صاحب اپنی منہی چھپانے کے لئے پلیٹ پر جھک گئے۔

پتو کے امتحان بھی نزدیک آ گئے۔ ادھر مرزا صاحب زائس کے سلسلے میں کافی اچھے گئے تو کچھ عرصے کے لئے مرزا صاحب گھر کی کھینچا تانی کو بھول گئے۔ مرزا صاحب کا زائس کافی پھیل گیا تھا۔ جب سے ہوئے اس گھر میں جنم لیا تھا مرزا صاحب کا زائس من و نوا رات چوتھی ترقی کر رہا تھا۔... اگر گھر میں پرسکون سی فضا بھی قائم ہو جائے، رشیدہ بیگم، راہبہ بانو اور گوبر جہاں خاموشیاں توڑیں تو یہ گھر جنت بن جائے، وہ آفس میں بیٹھے بیٹھے سوچتے۔ یہ حقیقت بھی کہ مرزا صاحب نے تین شادیاں اولاد کی خاطر کی تھیں... مقصد یہ تو اچھا تھا، بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، شاید بڑھاپے میں تنہائیاں پریشانیاں شدید ہو جائیں ہیں اور یہ شادی بڑا دکھ دیتی ہیں۔ بچتیاں دوں کی سسک بڑا زبانی سہ... خاموشیوں کے ناگ ایسے نوٹے کہ مرزا صاحب کی ذات الجھ کر رہ جاتی تینوں بیویاں ساتھ کھاتی تھیں۔ اکثر بیشتر ساتھ بیٹھتیں لیکن زبانیں حرکت میں نہ آسکیں۔ اس دن بھی نہیں...

جب گوبر جہاں کا جواں بھائی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔ مرزا صاحب کو جیسے ہی اطلاع ملی فوراً گھر آئے۔
 ”رشیدہ... گوبر کہاں ہو؟“ وہ باہر سے چلائے۔
 دونوں تقریباً بھاگتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کہ جلدی سے ذبح کروالیں۔ لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہ ہو“
 ”کمال ہے بھئی“ مرزا صاحب غصے سے سرخ ہو گئے سارا دکھ درد دل بھر کے لئے بھول بیٹھے۔ ”میرا بیٹا مر رہا ہے اور تم لوگ اب بھی اپنی اکاں میں مری جا رہی ہو۔ خود نہیں کہہ سکتیں۔ ہاں تم لوگ کیوں بولو گے۔ ہٹا رہی تو نشان کھٹ جائیگی“
 ”بول لیں گے مرزا صاحب۔ بول لیں گے۔ آپ کہاں وقت بھی پچھلی باتیں نہیں بھول رہیں“ رشیدہ بیگم بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر جھنجھلا کر نہ۔ تیز لہجے میں بولیں تو مرزا صاحب خاموش انہیں دیکھتے ہوئے قصائی اور بکرے کی طرف چلے گئے۔

منٹھا پوٹھیک ہو گیا۔ صحت کی خوشیاں بھی بڑی شان شوکت سے منائی گئیں لیکن باوجود کوشش تین عورتوں کی فید اپنی جگہ قائم نہ ہو سکی تھی پہلی کرنے کو تیار نہ تھی۔ یا شاید وہ ضرورت ہی محسوس نہ کرتی تھیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا اس کے لئے امدت انہیں پتو کی نعمت سے نوازا تھا۔

مرزا صاحب نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ پتو میں پاؤں کے کپڑے بڑی خوبصورتی سے منمل کیا کرتا تھا۔ تب انھوں نے پتو پتو کے سپرد کرنے کی ٹھان لی۔

”پتو۔ ادھر آؤ بیٹا... انھوں نے لان میں کھیتے پتو کو آواز دی۔

”جی آؤ“
 ”بیٹا یہ ہماری تینوں لائیں آپس میں بات کیوں نہیں کرتیں“
 ”پتہ نہیں آتا“ وہ گروں میں ملتا ہوا بھاگ گیا۔
 ”بات سنو“ وہ اسے دوبارہ آواز دے کر پتہ پاس بلائے
 ”ہوئے ہوئے“ تم ان سے پوچھنا کہ وہ آپس میں بات کیوں نہیں کرتیں... دیکھو میرا نام نہ لینا...“ وہ اسے کئی دنوں تک سمجھاتے رہے۔

اور
 پھر جب ایک دن رشیدہ بیگم نے ذرا ہی دیر بیٹھی ہوئی راہبہ بانو کو بلانے کے لئے پتو کو بھیجا تو اسے مرزا صاحب کا سکھایا ہوا سبق یاد آ گیا۔
 ”بڑی اماں آپ آپس میں بات کیوں نہیں کرتیں؟“ وہ وہیں جا کھڑا رہا۔

”ایں“ رشیدہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
 ”جاؤ بیٹا جلدی سے بلا لاؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ وہ بیچمی نگاہ کئے کئے بولیں۔ گوبر جہاں بھی پاس ہی بیٹھی بیٹھی اور جھک گئیں۔
 ”میں نہیں بلاتا۔ آپ خود بلائیں نا“ وہ کہتا ہوا بھاگ گیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
اسلافِ مفتون زندہ، روشن اور کیمیت
کتابوں کے اشاعت کا

عظیم سلسلہ

ہمارے پیغمبر (مصور)

”ہمارے پیغمبر“ حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی سوانح کا ایسا مجموعہ ہے جس میں جوہر سے نازک پیر اور نبیوں کے حالات شامل ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آپ مقدس نبیوں کے حالات پر بھی مناسبت جمع کیے گئے ہیں جس کی حدت برآلہد فی کتاب معتبر ”قرآن حکیم“ کی ہر قیت ہے۔ مقامات مقدس کی درجنوں تصاویر سے مزین، فوق آخست پر طباعت چار رنگ کا مثالی مضبوط جلد، سفید چمکا کاغذ، ڈھائی سو سے زائد صفحات قیمت صرف پندرہ روپے

ہمارے ولی (مصور)

اس کتاب میں حضرت عیسیٰ مہری، حضرت حمزہ رفیع ادوی، حضرت واثق عجیب، حضرت یحییٰ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت مہمان مہر، اور حضرت محمد زکریا ثانی کے علاوہ دوسرے درجنوں اولیاء کا تذکرہ اس افلاذ میں درج ہے کہ جس کو پھر کر آپ ان کی محبت میں دُوب جاتیں گے۔ مزارات مقدسہ کی درجنوں تصاویر سے مزین، فوق آخست پر طباعت، چار رنگ کا مثالی مضبوط جلد سفید چمکا کاغذ، دو سو کے لگ بھگ صفحات۔ قیمت صرف بارہ روپے

مسلمان فاتحین (مصور)

جن کو مسلمان فاتحین کے کارناموں کا اس کتاب میں تذکرہ ہے۔ وہ ہیں حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت طارق بن زیادؓ، حضرت محمد بن قاسمؓ، سلطان محمود غزنویؒ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، سلطان شہاب الدین غوریؒ اور سلطان محمد فاتحؒ تاریخی تصاویر سے مزین، فوق آخست پر طباعت، چار رنگ کا مثالی مضبوط جلد، سفید چمکا کاغذ، ڈھائی سو صفحات۔ قیمت صرف پندرہ روپے

اپنے قلم سے یہی سناکے یا
ہم سے طلبے قلم ماویہ

خیام پبلشرز

دو گانہ نمبر ۲۱۔ حلاکہ دینے (وقت) ہفتاک
چٹانہ اردو بازار، لاہور

گھر کے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تم دونوں فوراً چلو
میں ٹیکسی لے آیا ہوں“

”جی... جی... مرزا صاحب یہ اچانک کیسے ہو گیا؟“
رشیدہ بیگم نے جلدی سے اپنی چادر گھسیٹی۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو گھر کے آبا اہل بلا کر لے گئے تھے“ راہبہ بالو نے کانپتے دل سے رفیقہ کی ڈوریوں پر ہاتھ نہ مڑے پوچھا۔

”میں کہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی پھر وسعہ نہیں۔ نہ جانے کب کس وقت موت آ جائے۔ لیکن تم تینوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے۔“ مرزا ٹیکسی کی طرف جاتے ہوئے بولے اور وہ دونوں سوئیں اپنی اپنی جگہ سہمی ہوئی ٹیکسی میں جا بیٹھیں۔

گھر جہاں کے بھائی کا جنازہ اٹھا تو رشیدہ بیگم اور راہبہ بالو کی سسکیاں اور پچکیاں، ارونا بلکا گھر جہاں سے کسی طرح نہ نکل سکی۔ دونوں ہر کام میں پیش پیش رہیں۔ سر جھکائے ڈھیروں پسار ختم کر ڈالے اور جب مرزا صاحب لینے واپس آئے تو دونوں نے آہستہ سے خلاءوں میں گھورتی ہوئی گھر جہاں کے باغیچوں پر رخ رکھ دیئے اور جواب میں اس نے بھی ڈھیروں آنسو بہا ڈالے۔ تب رشیدہ بیگم اور راہبہ بالو ڈھکی ڈھکی باہر نکل آئیں۔

دو دھینگے گھر جہاں اپنے میکے سی میں رہیں۔ اسکول کی وجہ سے پوچھیں تھا۔ راہبہ بالو اور رشیدہ بیگم ہر دوسرے تھیرے دن مرزا صاحب کو پتوں کے ساتھ بھجواتی رہیں پھر ریت لینے... کٹنگی دولہے۔ خود نہ کبھی دوبارہ جانے کو کہا نہ مرزا صاحب نے زور دیا یہ وہی بیویاں تھیں جنھوں نے بات کرنے کے معاملے میں ان کا کہنا نہ مانا تھا۔ گھر جہاں کے بھائی کے جنازے میں جانے کے لئے وہ نہ جانے کیسے کبہ بیٹھے تھے اور کس طرح ان دونوں نے مرزا صاحب کا مان رکھ لیا تھا۔ سنے کی پیدائش کے بعد جس طرح مرزا صاحب نے برابری اور محبت کا توازن برقرار رکھا تھا وہ تینوں بیویاں اچھی طرح جانتی تھیں ہر پہلے کا برابر جیب خرچ، اچیل، سگریز کا کامی آنا جانا، کھانا پینا... جتنی چیزوں کے رنگوں کے معاملے میں بھی مرزا صاحب اس قدر خیال رکھتے کہ تینوں میں سے کسی ایک کو بھی کوئی شکایت نہ ہوتی۔

گھر جہاں جب میکے سے واپس آئیں تو درجنوں کا رنگ مدھم پڑ گیا تھا۔ زندگی کی رنگیندہوں میں اٹھنے آئی کشش در کھی ہوتی تو شاید وہ دنیا کی کوئی ماں، کوئی بہن، کوئی باپ زندہ نہ ہوتا کتنی ناہوشی سے اکیسایسکون سا مدھم مدھم ساحرہ ذات میں سرایت کرتا جانا ہو

مرنے والے کی شخصیت ایک یاد دہا رہ جاتی ہے اور بس !!!
یہی کچھ گوہر جہاں کے ساتھ ہوا۔ واپس آئیں تو زندگی کے معمولات
میں دوبارہ داخل گئیں۔

راہبہ بانو کی چوڑیوں سے کھیلنے موسے تجویز پیش کی تو انھوں نے
بے اختیار مسکرا کر تپو کو سینے سے لگا ڈالا۔ ابھی بچے سمجھ گئے گی
تو خود ہی بڑھنے کھنسنے لگے۔ انھوں نے انھیں موندلیں اور
پوچھی خراٹے لینے لگا۔

گفتگو کا واحد ذریعہ چوہا بھیل کی طرف زیادہ راغب
ہو گیا تھا جلدی جلدی اسکول کا ہوم ورک کر کے وہ گنبد لاسیٹے
باہر بھاگ جاتا۔ یوں بھی اسے اب گھر میں وحشت سی ہونے لگی تھی
اس کی ایک ماں بھی آپس میں بات نہ کر سکتی اور پیغام پہنچا پہنچا
کردہ ٹھٹھکے لگا تھا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں چوہا کا ذہن آج کل پڑھائی کی طرف
بالکل نہیں ہے۔“ کھانا کھاتے ہوئے مرزا صاحب بولے۔
”بیشکل ہوم ورک کرتا ہے۔“ گوہر جہاں نے بھی ان کی بات
کی تصدیق کی۔

”گھر سے باہر نہ جانے دیا کر دو۔“
”بچہ ہے مرزا صاحب... گھر میں بند کر کے تو نہیں
رکھا جاسکتا؟ رشیدہ بیگم نے طرف داری کرتے ہوئے کہا۔
”اب دیکھیں اس وقت بھی کھانے کے لئے لڑکی مرتبہ بلایا
لیکن مجال ہے جو سنا ہوئے راہبہ بانو نے بہتے ہوئے بتایا۔ ممتا کے
نور سے راہبہ کا چہرہ کھلا کھلا لگ رہا تھا۔
”ایک ہی تو ہے۔ میں چاہتا ہوں پر زندگی میں کسی کا فحشاج
نہ رہے۔“

”ایک کاشکوہ نیکر مرزا صاحب... راہبہ بانو جلدی
سے بولیں... اللہ اس کو زندگی دے... یہ ایک ہی کافی ہے۔
رہا عالمین ہمارے پوپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔“
”آمین! تینوں ساتھ ساتھ بولیں
مرزا صاحب کھانا کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
”میں آج رات فرادیر سے آؤں گا۔“

”کوئی بات نہیں میں دروازہ کھول دوں گی۔“ رشیدہ بیگم
بولیں۔ انہیں معلوم تھا قبیض تڑکے گوہر جہاں کو بھائی کی رسی ہیں اور
راہبہ کو میکے جانا ہے... گوہر جہاں مرزا صاحب کے جاتے ہی
اپنا سامان ٹھیک کرنے لگیں۔ اور راہبہ بانو پوپ کو لئے دیر تک
پینے کرے میں پڑھائی سے متعلق سمجھاتی رہیں تینوں کی مشترکہ امیدوں
کا مرکز اور محو رہو راہبہ بانو کی کوئی بات کا دھیان کئے بغیر اپنے
گنبد اور پتے میں کھو بارا۔

”چھوٹی اماں اگر آپ مجھے ان چوڑیوں کا گنبد اور تلبانوں
دیں تو کتنا مزا آئے۔ میرے پاس سونے کا گنبد بلبا ہوگا۔“ اس نے

شدید گرمی تھی سورج نے تو جیسے آج ہی ساری آگ اگل گئے
کی قسم کھا رکھی تھی۔ دیکتا چہرہ لے لے پوپ گھر میں داخل ہوا تو رشیدہ بیگم
اسے بیچ کرے میں لے آئیں گوہر جہاں نے کھانا اور پانی لا کر رکھ
دیا۔ راہبہ بانو پٹنگ پر بیٹھی بیٹھی مسکراتی رہیں پوپ اٹے سیدھے تو
بتا رہا۔

”ٹھیک سے کھانا کھا ڈینا۔“
”رات کو کھا لوں گا باقی کھانا۔“ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف
بھاگ گیا۔

ہاتھ دھو کر واپس آیا تو راہبہ بانو کے پٹنگ پر بیٹھ گیا۔
”چھوٹی اماں مجھے نئی قمیض سی دیں۔ پیلے رنگ کی۔“
”کیوں؟“
”آج بیچ ہے۔ سلیم اور میں کپتان ہیں۔“
”یہ سامنے والا سلیم؟“ وہ اس کے ریشمی بانوں میں انگلیاں
پھنساتی ہوئی بولیں۔

”قمیض کی بات کریں نا چھوٹی اماں۔“ وہ جھنجھایا جھنجھایا سا تھا۔
”آج جینا کوئی قمیض بہن کو کام جلاو۔ کل سی دوں گی۔“
”آج کیوں نہیں؟“ وہ جبر پر آمنا آیا۔
”کڑا کہاں ہے میٹا۔ اور پھر وہ جرسی جو کھیلنے میں پہنی جاتی
ہے وہ تو بازاری کی ہوتی ہے چندا... بازار سے خرید لاؤ نا۔“

”نہیں۔ آپ مجھے سی کر دیں۔“ وہ ضدی ضدی لہجے لے کھٹے تھا۔
”اچھا تو یہ سی کر دیں گی۔“ وہ اسے مطمئن کرتے کرتے نکلے
بہن نے لگیں۔ چھوٹی اماں سے یایوس ہو کر وہ بڑی اماں کے پاس گیا۔
رشیدہ بیگم جلے نماز بھیجائے نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیکھ کر انور
سے انہیں دیکھتا بھی رہا اور انتظار میں کڑا رہا کہ وہ نماز ختم کریں تو اپنی
بات منور کر رہی تھی۔ یا کم از کم بڑی اماں چھوٹی اماں سے کہہ کر اس کی
قمیض سلوا دیں۔

”لیکن یہ لوگ تو آپس میں بولتی ہی نہیں۔ روشنی ریتی ہیں۔“
وہ سوچ کر مسکرا نہ لگا۔... بچوں کی طرح روشنی کی عادت بڑوں میں
بھی ہوتی ہے۔ لیکن انا تو کہتے تھے کہ بچے روٹھتے ہیں۔ وہ خود سے
ہی پوچھتا رہا۔ رشیدہ بیگم نماز میں مشغول رہیں تو وہ بند بندہ ڈوبی
پنچیں لئے گوہر جہاں کے پاس جا پہنچا۔

رابعہ بانو نے روتی ہوئی گومر جہاں کے بالوں میں انگلیاں پھنسا دیں۔

”ختم نہ کرو گومر، پتہ سہارا بھی ملتا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ پتی انگلیوں سے گومر جہاں کے بالوں کو امر کو سہلاتی رہیں اسی طرح جس طرح پتہ کے ریشمی نرم بالوں میں انگلیاں پھنسانے کھنڈوں کی طرح رہتی تھیں۔

ریشیدہ بیگم نے نڈھال ہو کر گومر جہاں کی گردن میں سر ٹیک دیا۔ پتہ شادیاد ضبط نہ کر سکا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور چپکے سے مرزا صاحب سے پوچھا۔

”ابو! اب آنکھیں کھول دوں؟ دیکھیں یہ کتنا رورہی ہیں۔ اور اب تو باتیں بھی کر رہی ہیں۔“

مرزا صاحب نے آہستہ سے پتہ کے چہیت لگائی۔

”شریر دومنت تم سے خاموشی کہاں رہا جائے چلو اب اٹھ جاؤ۔ ان لوگوں کے لئے اتنی سزا کافی ہے۔“

ریشیدہ بیگم، رابعہ بانو اور گومر جہاں نے پتی بھی آنکھوں سے پتہ کو دیکھا اور بے اختیار تینوں نے پتہ کو گلے سے لگا لیا۔

”شیطان کہیں کے یہ کیا حرکت بھی ہے؟“

”آٹاں جانی آپ بات جو نہیں کرتی تھیں۔“

تینوں نے شرمندہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھٹکائیں۔

”آٹاں جانی آپ میری فیض سی دیں گی؟“ وہ وہیں پاس بیٹھ گیا۔

”آں۔ آں۔ ہاں۔“ نند کے غلبے سے ان کی زبان بھی لڑکھڑاہتی تھی۔ ”فیض... کوئی فیض؟“

”آپ آنکھیں تو کھولیں۔ بات سنیں نا! وہ انہیں ہلاتے ہوئے بولا۔

”چلو پتہ بیٹا۔ تم بھی سو جاؤ۔ انھوں نے لمبے سہر کو آنکھیں کھولیں۔ بہت غری ہو رہی ہے۔ بیٹا سو جاؤ یا وہ کروٹ لیتی ہوئی دوسری طرف سرک گئیں۔ پتہ کے لئے جگہ بھی بنائی کہ وہ بھی لیٹ جائے گا۔ لیکن وہ منہ پھلٹانے بیٹھا ہی رہا۔

”ایک تو یہ صیبت ہے کہ آپ لوگ بونٹی ہی نہیں ہیں ایک دوسرے سے۔ اب میں کھلے چلا گیا تو آپ چھوٹی آنکاں سے کہہ کر میری فیض بھی نہیں سوا لیں گی یا وہ بڑا تاربا۔ بڑا تاربا۔ اور ادھر سے مکمل خاموشی دیکھ کر چپکے سے کھڑکی سے باہر کود گیا۔

مرزا صاحب بے غشا دروازہ پیٹ رہے تھے۔

”کہاں ہو تینوں۔“ ہائے مہربانیو۔

اور عجیب سی پراسرار سی ٹینڈے سے نکل کر وہ تینوں بیک وقت دروازے کی طرف بھاگیں۔ مرزا صاحب پو پو کھاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ پتہ بے حس۔ خاموش تھا۔

”کیا ہوا میرے بچے کو؟“ تینوں نے بیک آواز پوچھا۔

”مڑک رہے ہو، خوش پروا تھا؟“ مرزا صاحب کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے بتایا۔

”رابعہ میں تو کسے تنہا رہے پاس بیٹا دیکھ کر چھوڑ گئی یعنی مجھے پتہ موتا کیہ یوں خاموشی سے باہر چلا جائے گا تو ساری دوپہر آنکھوں میں کاٹ دیتی۔“

ریشیدہ بیگم نے روتے ہوئے رابعہ کے کندھے پر سر ٹیک دیا۔

”گومر تم نے کسی اسے روک لیا ہوتا کیوں جانے دیا تھا اسے وہ تو ہم سب سے روک گیا۔ فیض سینے کے لئے تو میں نے منع کیا تھا مجھ سے روکھنا میں منا لیتی۔“

”ہم سب کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑ گیا تھا۔ روتی ہوئی گومر جہاں نے ریشیدہ بیگم کی گردن میں سر رکھ دیا۔

تینوں حصے سے بے حال تھیں۔ پتہ کی مامتا کا واحد سہارا تھا کسی کو جیسا ل بھی نہیں آتا تھا کہ مرزا صاحب اتنی خاموشی سے مناشہ دیکھ رہے ہیں۔ بچے کو ہسپتال باڈا کر کڑے پاس کیوں نہیں لے جاتے۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے پتہ ہمیشہ کے لئے ان سے روکھ کر چلا گیا ہو۔





کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟

بیوٹی بکسی کا ٹیلا کر دہ،

سوہنی سیر آتل

سوہنی سیر آتل تیار ہو کر کیا ہے،
بہت خرد و دقت دا دین ہے

بکری کے لوگ دی پنی سے بھی منگو سکتے ہیں

پتہ پتہ

بیوٹی بکسی

پورٹ بکسی کراچی

وہم

عطیہ پروین



اسپل خیالات آتے ہیں...
پچی کا موڈ چمکیلا ہو چلا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا
کر ڈھل دیا۔

”پچی اسپل نہیں اسفل!“
”یہ دیکھو! ہانگ برلر جھکوری چلی ہے مجھے نصیحت
کر لے! بھلا بتاؤ بی یہ حالت ہے زبان کی جیسے میرے بھٹ کی
کتنی رمال باوا ہائے ویلا چلنے پھرتے ہیں کہ نہیں آگے،
اے بر کہاں سے آئیں.... ایک تو بی بچی نے سر کھجائے
ہوئے کہا جب سے یہ مری بانٹ کھونٹ ہوئی ہے لڑکوں

کا کال بڑا گیس ہے جو حقوٹے بہت بچ رہے وہ اگر لڑکوں ہیں
تو چال چلن نہیں ٹھیک ہے! چال چلن اچھا ہے تو لڑکوں نہیں
اور اگر خدا کی ہر مافی سے دونوں باتیں نکل آئیں تو بی آپ
برلر نہیں.... اور ادھر سے لڑکوں کے یہ بچھن! ہوش
اڑے جاتے ہیں میرے تو.... قیامت کا سماں....!
”اے بھٹ کا رتہ ہاری بھواس پر!“ دادی اماں نے
ابھ کر کہا ”ایک بات میں ہزاروں باتیں نکال دیتی ہو
وہ بات تو بتائی ہی نہیں؟“

”نہ پوچھتے ممانی جان امیری تو جان سلگتی ہے! احمد حسین
والی بتا کو ڈیلے گا۔“

پچی نے دادی اماں کو پاں بناتے دیکھ کر ٹوکا۔
”نہ سے تو کوئی دوسری قبلا کو کھاتی نہیں جاتی یہ مراد اسی زبان
کو گئی ہے کہ سب کے منے بھول گئی!“

”مکھوچی تبا کو تو بہت نقصان دہ چیز ہوتی ہے!“ میں
نے کہا ”دانت خراب ہو جاتے ہیں، آنکھوں پر اثر پڑتا ہے
”کون کہتا ہے تبا کو نقصان کرتی ہے؟ اے جالو کی
بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرتی ہے! تم کیا جانو! ہمارے

دروازے سے بڑھ راتی ہوئی
گھسیں! اے ہاں! لو اور سنو!
پچی ہاں! آج کل چھو کر مای دو چار حرفیں بڑھ گئیں گئیں
تھکے لیکن بس بن گئیں، ملا فیصل! اٹنے لیکن آسمانوں پر
جو ہم ہیں سو کوئی نہیں خود تو موٹڈی کاٹیوں کی گھوڑوں کی چال
چلتی ہیں زمین تھرا جاتی ہے۔ زندہ مرے تک پناہ مانگتے
ہیں اور حلق ہیں ہماری چال کے دھرے اٹلے! بتاؤ بھلا
ہماری رفتار بے ڈھنگی ہے۔“

”دادی اماں بولیں! کیوں! کیوں! خیر تو ہے؟“
”خیر کہاں ممانی جان!“ پچی نے جل کر کہا۔ خدا کا ہنر
نازل ہونے والا ہے زمین کا تختہ اٹلنے والا ہے!“
بڑی ہمت کر کے میں پوچھ بیٹھی۔

”کیوں پچی؟“ پچی نے میری بات دہراتے ہوئے
مجھے ایسی غضب ناک نظروں سے دیکھا جیسے ساری خطا میری
میری ہی تھی! ”لو اور سنو! بی صاحبہ فرماتی ہیں کیوں پچی!“
”مگر بوا کیا؟“ دادی اماں نے پاندان کھولتے ہوئے

پوچھا۔
”اے ممانی جان کیا بتاؤں! لوٹیاں ہیں کہ آفت کی ٹپاں

اے کبھی ہم بھی ان عروں کے تھے کیا مجال جو بڑوں کے خلاف
کوئی ایک بات بھی کہتے، اگر سے زبان نکال لی جاتی!
اور آج سی نوٹیاں الہی پناہ! بزرگوں کو تو جیسے جوتی میں
ڈال کر پھین لیا ہے۔ اے بہت دن سے میاں افضل کے
گھنٹیں گئی تھیں جب دیکھو تب شکوہ کیا کرتے ہیں پر کیا
کروں ممانی جان! میری تو وہی مشن ہے ایک سر نہ اڑوئے
دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی اور ادھر کی روز سے جمال
کا خط نہیں آیا.... کوکھ میں ٹیسیں اٹھتی ہیں اور دل میں

نوملنے میں تو اس کا راج نہ تھا بہ شادی کے بعد لڑکی کی ماں
 پہچان تب کو ہی تھی۔ میر میں تو کنوارا بن سے کھاتی تھی۔ اماں
 موصوفے مار مار کر عادت ڈالی تھی۔ ہے ہے انہی دہنوں
 پر کیا نور اترتا تھا۔ ا۔
 ”کیسی شان ہوتی تھی کہ منہ میں ہان، ہونٹوں پر مسی،
 کا لاکھا ہاتھ میں ستاروں جڑا بیٹوہ، معلوم ہوتا تھا دہن ہے،
 اور آج کل کی لڑکیاں! دہن نہیں تو کیا نہیں تو کیا دونوں طرح
 سنوٹا ایسی کھڑی رہتی ہیں!“
 ”ٹھیک کہتی ہو جی؟“ دادی اماں بولیں۔ لڑکیوں کا یہ
 ”لپ اسٹک“ میں نے کہا۔
 ”اے ہاں مہمانی جان! زمانے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔“
 چچی نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ”موئے چونا ایسے دانت اور پھیکری
 ایسی نمبان! بس وہ لگا لیا ہونٹوں پر۔۔۔۔۔ اے کیا بولتے
 ہیں اسے؟ جس سے ہونٹ رنگتے جلتے ہیں؟“

حال ہے کہ ساڑھی شادی سے پہلے باندھنے بیگن لڑی تھی،
 مانگیں نکالنے لگیں، زیور کا چلن تو ایسا اڑا ہے کہ کیا بیاباں اور
 کیا کنواری سب سے بچے ہاتھ اور خالی کان لیے میموں کی
 طرح اڑتی پھرتی ہیں۔ دہن ملہن کیا خاک بیگن کی!“
 ”اے ہاں مہمانی جان! زمانے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔“
 چچی نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ”موئے چونا ایسے دانت اور پھیکری
 ایسی نمبان! بس وہ لگا لیا ہونٹوں پر۔۔۔۔۔ اے کیا بولتے
 ہیں اسے؟ جس سے ہونٹ رنگتے جلتے ہیں؟“



”ہاں! وہ موٹی لب شکب! بس وہ تھوپی لی ہنٹوں پر لادیں گئیں! بس ایک سیس اور کیسا لکھا! بس ہے مانی جان۔ میرا جوئی گھناتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بس ابھی ابھی، کوئی مرغی دانٹوں سے فوج کراہی ہوں.... توبہ! توبہ! بچس چیز اور نہ پرگی ہوئی! ہتھو!! ارے جتنا ان فیشوں پر پیسہ برباد ہوتا ہے اگر بچا کر رکھا جائے تو برس بھر دولت کام آئے۔ ہم اچھے تھے کبھی ان خاک پڑی چیزوں پر آنکھ نہ ڈالی۔ ایک بار کیا ہوا بیٹی کیچی مجھ سے مغالط ہوئیں۔ تہاے چچا حرم، لے لے تھی شادی ہوئی تھی! انگنوں کے دن تھے.... آپ تو جانتی ہوں گی مانی جان! میری شادی کتنی کم سنی میں ہوئی تھی؟“

”ہاں!“ دادی اماں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”ہو گی کوئی اٹھارہ بیس سال کی!“

”اٹھارہ بیس سال؟“ چچی تڑپ کر بولیں۔ ”ہائے کیا بات کرتی ہیں مانی جان!“

”نوج میرا بیاہ لے سن میں ہوتا.... یہی کوئی بارہ تیرہ کی رہی ہوں گی!“

”بیس برس کیا بہت ہوتے ہیں چچی؟“ میں نے

پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا! عورت بیسی اور گھسی تو شہر ہی ہے دس برس کے سن میں منگی ہوئی، تیرہ برس کی عمر میں گھر باری ہو گئی! اندر رکھے جو دس برس گود بھر گئی۔ جمال کے آبا اللہ بخشے انہیں مجھ سے ایک دو نہیں پورے سترہ برس بڑے تھے۔ میری بسم اللہ ہوئی تب ان کی مونچوں کا کوڑہ ہوا تھا۔ انگلی پکڑ کر مٹھائی دلانے بزار لے جاتے تھے۔ اور میں بھی فلاں بھائی فلاں بھائی رہا کرتی تھی!“

”فلاں بھائی؟“ میں حیرت سے بولی۔

”اے ہاں بیٹی! اب نام کیسے ہوں! شریف زادیاں کہیں میاں کا نام لیا کرتی ہیں؟“

”اور چچا کیا کہتے تھے آپ کو؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔

”چچی کے گھر پر ہلاک سازنگ بکھر گیا۔“

”اے وہ بہشت نصیب کبھی دلائیں آتے تو چھمن پکارنے لگتے تھے!“

”یہ چمن انہی کا دیا نام ہے؟“ خالہ جان نے کمرے

کے اندر سے پوچھا۔

”ہاں بی! ابھی آکر کر لیں۔“ اصل میں بات یہ تھی۔ میرے چڑھاوے پر جو توڑے گئے تھے ہوں گے کوئی دو سیر کے....!“

”دوسیر کے!“ میں غیر ارادی طور پر اپنے ٹخنے سہلانے لگی۔ ”اے توبہ! یہ سننے کیسے ہوں گے!“

”اے ہم لوگ کیا تمہاری طرح بھول رانی تھے جو ایک جوڑی کے بوجھ سے کلائی مکھن لگتی۔ سیر سیر بھر کے توڑے پہن کر گھر بھر میں پھر آ کر تھی۔ دن بھر چھم چھم کی آوازیں نکال کر تھیں۔ لے لی ایسا لگتا رسیوں گھنکھوڑے کپڑے والی بکریاں چھوڑ دی گئیں ہوں!“

خالہ جان ہنس پڑیں۔

”توبہ ہے بی توبہ! بھتیں کوئی اور مثال بھی یاد نہ

رہی۔“

”اے بھائی جان! میں تمہاری طرح تو بے پاس تو نہیں ہو ہر بات کے پیچھے عمدہ عمدہ مثالیں لگاتی پھروں! ہاں تو چھم چھما بھی رہتی بس وہ کہنے لگے چھن ہائے کیسا بھلا لگتا تھا.... مالو گلاب کے پھول گر رہے ہوں ان کے منہ سے!“

”منگنی کے بعد تو آپ پچاسے پردہ کرتی ہوں گی؟“

میں نے پوچھا۔

”اور چچی خیر ہے میں بولیں۔“ اسلکھ پرودہ تھا! ”شادی سے پہلے وہ میرے پیلو کی ہوا تک نہ پاس کرتے۔ مڑک پر ان کی آواز سنائی دیتی تو اللہ قسم کانوں میں انگلیاں دے کر کوٹھڑی میں گھس جاتی.... اور وہ ایک دم چونک کر بولیں۔ اے ہاں! وہ بات تو بھول ہی گئی.... ایک روز کیا ہوا۔ بی انہوں نے پکے سے مجھے کریم کشیشی لاکر دی اور کہنے لگے اسے لگانا۔ اے میں نے تو سونکھا تو ناک میں خوشبو آئی میں سمجھی انگریزی کا عمدہ والا سمکھن ہے!“

”مکھن!!“ دادی اماں حیرت سے بولیں۔ ”اسی پگلو! مکھن اور کریم کشیشی نہ ہوئی! اللہ کی سزا تو تم پر!“

”اے مانی جان اب تو ہے۔ اس زمانہ کی بات کاہنے کو! سی چیزیں دیکھی ہوں گی۔ سمجھی ولایتی مکھن ہے۔ اٹھا کر رکھ دیا۔ شام ہوئی تو ساس نے ناشتہ لگایا۔ سسر نے لوٹے میں پانی رکھا!“

”سسر نے؟“ خالہ جان نے تعجب سے پوچھا۔

سب سے کام لیتی تھیں؟“

جو کرسٹے چلے آئے ہیں۔ وہی میں بھی کروں گی۔ مجھ ان کھڑن
پاکھوں پر یقین نہیں۔

”بچی، جتنا تو دلالتی ہے؟“ میں نے بچی کو یاد دلایا اور
بچی کی زبان ہل چکی تھی تو ایسا ہوا۔ ایک دن گھر میں بلاؤں کے رات
کو بھر سیٹ کھا کر لیٹی تھی۔ ابھی تو قیامت کا عالم تھا! وہ درد
سیٹ میں کرا لیا۔ ایک دن گھر پر پہنچنے کی بجائی کی طرح بچی
رہی تھی۔ جیکوں کی لین ڈوری بندھ گئی۔ صبح سے شام ہو گئی مگر
درد میں کمی نہ ہوئی ایک سو بیس زمین پر تو ایک سو تیس آسمان پر تو اس
حالت میں بھی بندی ڈاکٹر کو دکھانے پر ملائی نہ ہوئی۔ سب
کہتے تھے کہ گئے۔ میں نے کہا کہ اپنا خون پیوں کی منکر ڈاکٹر
کی دوائی حرام سمجھوں گی۔ میری ساس اللہ انھیں بخشے کہ وہی
تھیں مگر دوسری کا پھر ہوا گیا ہے میرے دشمنوں پر۔ آخر
جب حکیم حکیم کچھ نہ کر سکے تو انھوں نے ملا سیالے بلوائے لے
لی۔ ایک شاہ صاحب سب سے آخر میں آئے! کیا تباہی کیسا اور
تھا مکھڑے پر! جیسے چاند کے گرد اگر دھولے۔“

”چاند کے گرد اگر دھولے۔۔۔ ہلے۔۔۔ میں نے لکھ
ضبط کرنا چاہا مگر مجبور ہو گئی۔ خالہ نے ہنسی سے جہاں ہو کر دیکھا۔
”لے ہے! اس مصیبت میں بھی تم نے انہیں آنکھ بھر کر
دیکھ لیا۔

”تو میری بیوی! ایسے نیچے ہونے پر بزرگوں کے منہ پر آنکھ
بھرے گی جھلا!۔ اللہ قسم جسے دشمنوں کے پرانے چھوڑ رہے
تھے۔“

میرے اور بھر بھری کا دور پڑا۔ چچی نے گھور کر مجھے دیکھا مگر
کہتی رہیں۔

”لے ہے! جن تو کانپ کر رہ گئی! بی! انھوں نے میرے پاس
آکر نصیحت کی، آنکھیں اٹھی پٹیں۔“

”پیٹ بھی دیکھا؟“ خالہ جان مذاق کے موڈ میں تھیں۔
”کیوں نہ دیکھتے؟“

”ہے ہے ناخرم کو دکھا دیا تم نے؟“

”لے ناخرم کیسے! بھلا پیر و فقیروں سے بھی پردہ ہوتا
ہے۔ اللہ دے لوگ۔۔۔“

”مردم در سب برابر چاہے اللہ دے ہوں یا شیطان
دے۔“

”لے کفر نہ بھوکھا بی! ایسے بزرگوں کی نیت خراب ہونے
لگے تو آسمان چھٹ کر زمین پر سا جائے!“

چچی خوشی سے پھول کر بولیں۔ ”لے بی! اسلامی حجت
کرتے تھے۔ گودوں تو کھلا یا تھا۔ جنت نصیب لے! کہتے
تھے! لکھتے! ہو کوسال بھر تک پٹنگ سے پیر نہ اتارتے دیں گے۔
اور یہ ہوا۔ سال بھر تک دہن بنی پٹنگ اور چمکے کے برابر
جاکے۔ ساس سارا دن رات داری تھیں ہوں۔ سسر چٹا چٹ بلا لیتے
لیتے۔۔۔“

میرے اور خالہ جان کے اوپر منسی کا خطرناک دورہ پڑ
گیا مگر چچی کی روانی میں فرق نہیں آیا۔ سال بھر تک منسی کا میں
انگلی نہ چھوئی۔ اللہ میرا ایسا گھرا ہوا ہر لڑکے کو دے۔ ہاں تو ناشہ
آیا۔ میں نے جھٹ وہ کریم کی شیشی اٹھائی اور روٹی روٹی پر
لگائے والی ہی تھی کہ جمال کے ہاتھ ”ہائیں! ہائیں! یہ کیا کرتی
ہو! کہہ کر شیشی ہاتھ سے چھین لی۔“

میں بے ساختہ ہنس پڑی۔ داری اماں بھی مسکرائیں۔
”اے غم سدا کی اول جلول رہیں۔“

”اول جلول کیوں؟“ چچی برامان کر بولیں۔ ”بھولی بھالی کہتے
”ہاں! بھولی بھالی! خالہ جان کمرے سے نکل آئیں۔“ آج

فرا وہ جنوں کا قصہ سنا دو۔“

”لے جتنا تو دلالتی ہے! کہو۔ تم کو بھی اب بڑھاپے میں داری
والی بولنے کا بڑا شوق چھرا یا ہے۔ چچی نے پتیرا بدلا۔ یعنی
پٹنگ پر پیر چڑھ کر ٹیٹھ گئیں اور شفاف فرش پر بڑی فراخ
دلی سے پیک کے گل بوٹے بناتے ہوئے نہن لگیں۔

”میری سسلال! بس ایک برائی تھی۔ ذرا کسی کو جھینک
آئی اور ڈاکٹر کی پرکار پڑی۔ مرنے میں درد ہوا ڈاکٹر کے یہاں بھلا گے
میرے میکے میں تو ڈاکٹر کا نام لینا کا کی بکنا برا سمجھا جاتا ہے۔“

”یہ کیوں؟“

میں نے پوچھا۔

”لے بیٹی! اللہ پچائے ان لوگوں سے! انگریزی پڑھے، نہ
جنس کا خیال نہ پاک کا لحاظ۔ اسے میں نے تو سنا ہے دوائی میں
شراب ملا کر پیتے تھے تویر! تویر! کون اپنا ایمان خراب کرے گا

خاک پر پڑے ایسے علاج پر! لے بی ایمان سلامت سے تویر
کچھ ہے۔ اور پھر ماری بڑی کفری ذری بات میں سوئیاں گھونپ
دیتے ہیں۔ بھلا بتاؤ! ہمیں ہے نزلہ اور انھوں نے گھونپ دی

زن سے سوئی! لے میں تو یہ جانتی ہوں کہ نزلہ ہوا مڑ گیا چار
پیسے کا جوشانہ ادٹا کر پی لیا دم بھر میں بھلے چلے۔ باپ دادا

”تم کیا جانو فی سب رنگے سیار ہوتے ہیں!“

پھر رواں ہو گئیں۔

”یہ سن کر میری ساس کی چیخ کل گئی۔ سرسراہٹیں مار مار کر دے گئے۔“

”اور چچا؟“ میں نے پوچھا۔

”اے بیٹی! ان کا حال نہ پوچھو۔ نگوڑے کا نڈکی طرح سفید پڑ گئے۔ شاہ صاحب کے قدموں پر ٹوپی ڈال دی کر شاہ جی اپنی خادمہ کو بچا لیئے اب اس کی زندگی آپ کے ہاتھ ہے!“

”چچی!“ میں اٹھی۔ ”یہ تو کھڑے ہوئے۔ موت و زندگی خدائے اختیار میں ہوتی ہے!“

”واہ ری لڑکی! تو نے تو مروجہ کو معاذ اللہ توبہ کا فریاد ڈالا ہے۔ زندوں تک غنیمت ہے بی! یہ گڑے مردے تو نہ کھڑو، لو اور نہ جیسے وہ کچھ... جانتے ہی نہ تھے۔ بڑے بڑے مولانا ان کے آئے مذکور سے ڈرتے تھے کہیں کوئی بات نہ پکڑ لیں اور تم ان کے سامنے کی پیدا چلی ہو ان پر اعتراض کرنے!“

”ارے نہیں چچی! توبہ! اچھی! اچھی! دادی اماں کی شعل بار لگا ہوں سے جھلس کر میں نے چھ سات طاپنے اپنے کلوں پر لئے اور سی سی کرنے بیٹھ گئی۔“

”جب یہ قدموں پر گرے تو شاہ صاحب کا دل پیچ گیا۔“

ایک تقوید کھڑکھڑا تھو پر باندا، ایک نقش گھول کر پلایا۔ لبان کے دھوئیں سے شعل دیا اور حکم دیا کہ آگھیر۔“

”مگر چچی! میری زبان پھر بھلائی گئی!“ آپ نے پلاؤ زیادہ

کھالیا ہوگا اسی وجہ سے درد ہونے لگا!“

”نوج!“ چچی تنگ گئیں۔ کیا میں ہوسے زندہ ہوں، جو

اناٹھی کی بندوق کی طرح پیٹ بھرتی چلی گئی۔“

”تو پھر جادل میں کئی رہ گئی ہوگی؟“ خالد جان بھی بولیں

”رات کا وقت ابھی گھوٹے پھر لیٹ رہیں اچھی طرح ہضم نہ ہو

سکا۔“

”اے ہی! کبھی میرے باپ دادا تک کا ماغہ خراب نہ

ہوا میرا کیا ہوتا۔ سیر کی جگہ سوا سیر کھالیا مگر میا کا دودھ ہو

کر لگا اور میری ساس ایسا پلاؤ پکاتی تھیں کہ بڑے بڑے باڑی

دنگ رہ جاتے۔ ان کی دیکھوئیں کہ دھوئیں تک میں مزہ ہوتا تھا

فی۔ اب وہ کیا ایسا ہو گئیں جو کئی رہ گئی۔ چچی برا سامنے بنا کر

کہنے لگیں۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ اصل میں پلاؤ اتنا عمدہ پکا

تھا کہ جنات با باغوشو سو گھڑ کر اتر پڑے۔ کھانا ہو رہا تھا۔

دندوں نے اوپر کے جھانی لٹنے لگے۔ ایک کہے میں خوشبو

ہم تو ہم دادی اماں اور چچی تک سنس پڑیں اور کھیا کر

جہر سے کوڑا میرٹ کر لاتی تھیں اسی طرف جھاڑو چلانے لگیں۔

”ہاں چچی پھر؟“ میں نے مودتہ غنیمت جان کر کہا اور چچی

رہیں۔

”چچی سنا ہے بہت زیادہ پیچھے ہوئے بزرگ عورتوں سے

”ہاں بیٹی! ہمارے ابا کے زمانے میں ایک بزرگ تھے وہ

عورت کے ہاتھ کا پانی تک حرام سمجھتے تھے۔ اور عورتوں کے سامنے

برقعہ اوڑھ کر آتے تھے!“

”چچی سنا ہے بہت زیادہ پیچھے ہوئے بزرگ عورتوں سے

”ہاں بیٹی! ہمارے ابا کے زمانے میں ایک بزرگ تھے وہ

عورت کے ہاتھ کا پانی تک حرام سمجھتے تھے۔ اور عورتوں کے سامنے

برقعہ اوڑھ کر آتے تھے!“

”برقعہ اوڑھ کر!“ میں نے اپنا بے تحاشا قسم کا قبچہ

روکنے کے لیے دانت پر دانت جمالیے۔

”ہاں بیٹی! تو پھر وہ شاہ صاحب نے خوب دیکھ بھال کر

کہا... چچی کو بھر بھری آگئی۔ اب بھی سوچ لیتی ہوں تو رونے لگتی

تھرا جاتے ہیں! کہنے لگے اس کے پیٹ میں ۴۰۰۰۰ دوجات

گھس گئے ہیں! اللہ اب تو پناہ رکھو اور جب وہ لڑنے میں

تو پیٹ میں اودھم مچتا ہے۔ اسی کارن درد ہوتا ہے۔“

”آکھ چچی کھٹے ہوں گے بابا لوگ!“ ابوالفین جھاڑو

لگاتے ہوئے ادھور اچھوڑ کر برآمدے میں آگئیں۔ اے

یہ ہجرت لوگ بڑے جندہ دل ہوت ہیں۔ ہمارے پر دادا پر ایک

خاتنی حاکم ہوئی گئی ہے تو ان نے ہمارے دادا کو سہکا مکھا

بنا کر دروے میں چپکے لیا رہے اور...“

”نیکو! ارے تم پھینچیں!“ خالد جان نے ہنس کر بو کو کھڑا

بڑے حسین ہوں گے نا ہمارے دادا... چلو اپنا کام کھو۔“

”ارے دلن بیٹم تم کا جانو، اندھ سون! اسے کھب صورت

رہیں کہ چاند میں میل پر ان ما دھبنا میں! بڑی بڑی موتی چور

آکھیاں! اتلیا مرچا ایسی ناک۔“

ہم تو ہم دادی اماں اور چچی تک سنس پڑیں اور کھیا کر

جہر سے کوڑا میرٹ کر لاتی تھیں اسی طرف جھاڑو چلانے لگیں۔

”ہاں چچی پھر؟“ میں نے مودتہ غنیمت جان کر کہا اور چچی

رہیں۔

”چچی سنا ہے بہت زیادہ پیچھے ہوئے بزرگ عورتوں سے

”ہاں بیٹی! ہمارے ابا کے زمانے میں ایک بزرگ تھے وہ

عورت کے ہاتھ کا پانی تک حرام سمجھتے تھے۔ اور عورتوں کے سامنے

برقعہ اوڑھ کر آتے تھے!“

”برقعہ اوڑھ کر!“ میں نے اپنا بے تحاشا قسم کا قبچہ

روکنے کے لیے دانت پر دانت جمالیے۔

”ہاں بیٹی! تو پھر وہ شاہ صاحب نے خوب دیکھ بھال کر

کہا... چچی کو بھر بھری آگئی۔ اب بھی سوچ لیتی ہوں تو رونے لگتی

تھرا جاتے ہیں! کہنے لگے اس کے پیٹ میں ۴۰۰۰۰ دوجات

گھس گئے ہیں! اللہ اب تو پناہ رکھو اور جب وہ لڑنے میں

تو پیٹ میں اودھم مچتا ہے۔ اسی کارن درد ہوتا ہے۔“

”آکھ چچی کھٹے ہوں گے بابا لوگ!“ ابوالفین جھاڑو

لگاتے ہوئے ادھور اچھوڑ کر برآمدے میں آگئیں۔ اے

یہ ہجرت لوگ بڑے جندہ دل ہوت ہیں۔ ہمارے پر دادا پر ایک

خاتنی حاکم ہوئی گئی ہے تو ان نے ہمارے دادا کو سہکا مکھا

بنا کر دروے میں چپکے لیا رہے اور...“

”نیکو! ارے تم پھینچیں!“ خالد جان نے ہنس کر بو کو کھڑا

بڑے حسین ہوں گے نا ہمارے دادا... چلو اپنا کام کھو۔“

”ارے دلن بیٹم تم کا جانو، اندھ سون! اسے کھب صورت

رہیں کہ چاند میں میل پر ان ما دھبنا میں! بڑی بڑی موتی چور



HAVE A PEPSI DAY

AUTHORIZED BOTTLERS OF PEPSI-COLA:
RIAZ BOTTLERS LIMITED. 32-N, Industrial Area, Gulberg 2, Lahore • Phone 873461 - 62



سا برادہ تھا۔ بھانک کر سپانی پیا۔ دو گھنٹوں میں تین چار لیٹا ہوا ہوئیں اور شام تک جھل چٹکی ہو گئی۔
 ”سسی ڈاکٹر سے دوائے کر بھیج دی ہو گی!“ میں نے پھر چچی کو چارنگ پکا کر دیا۔

”اے ہاں اور کیا! تم وہاں کھڑی دیکھ رہی تھیں نا، لو اور سنو، دوائے کر بھیج دی ہو گی! اے ممانی جان، وہ دادی اماں سے مخاطب ہوئیں۔ اس قدر تم یہ جنات بابا کا کرم تھا پلاؤ کی بخشش بھی تھی۔“

”ہاں بی! دادی اماں جھوم کر بولیں۔ کرم کی ڈال دیں جس پر نظر!“

”اے ہاں! وہ افضل میاں والی کون سی بات تھی؟“
 خلد جان کو ایک دم یاد آ گیا اور چچی انتہائی بے زاری سے بولیں۔
 ”ہواؤں پر اڑ رہی ہیں چھو کر ایں! میں گئی تو میاں افضل نے پوچھا کہ بھائی، کیا حال چال ہیں؟ اے میں تو منہ کھلتی ہی رہ گئی۔ اور وہ نہ بہت آفت کی پرکھا، مروی پرکھی، اپنے پیٹ پر ہلا کر پٹ سے بول پڑی.... کیا.... وہ.... ہاں....“

وہی رفتا رہے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے....!۔
 ”بہت اچھے!“ میں نے بے ساختہ کہہ بھیجی ”ٹھیک تو کہا اس نے!“

”یہ دیکھو! آٹے کا آواہی ٹیڑھ ہے.... ایک کا رونا تھوڑے ہے.... لومبلا.... اب بھی قیامت نہ گئے گی! آسمان پھٹ کر زمین میں....!“
 ”ممانی ٹیڑھ چچی چچن“ میں نے کہا۔ ”میں معافی چاہتی ہوں، ایک سیوزنی!“

”دیکھتے ہیں ممانی جان! اچھی نے فریاد کی۔ سر سر بھے انگریزی گا لیاں دے رہی ہے یہ چھو کر سی!“
 ”یہ گا لیاں ہیں.... یعنی یہ گا لیاں....! میں سنی سے بے تاب ہو کر سوتے ہوئے بھٹیا پر گر پڑی۔“

”ارے وہ پڑیں.... کیچی ا!“ بھتیانے ایک چھتہ شگاف جینے سے نہ بھر جھے دھکیلا تو سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دادی اماں کے پاندن سمیت زمین پر ڈھیر ہو گئی۔
 ”ارے ناس بیٹی! میری چھالیہ.... ہائے میرے چونا، تمباکو....!“

دادی اماں چلا کر جو قحی اٹھانے بھٹکیں مگر میں جھٹ چچی کی آٹے کر دیک گئی۔

”سو گھوں کا دوسرے کے میں سو گھوں گا۔ اسی جیس جیس میں دوزلی“
 ”پیٹ میں گھس گئے۔ ارے میری میا!“، بوالفصیح بن کپکپاتی ہوئی آواز میں چلائیں اور خلد جان نے مسکرا کر کہا۔
 ”اے لوگوں میں ان دونوں کو ایک تم ہی پسند آئیں!“
 چچی کے چہرے پر ہلکی سی لالی تڑپ اٹھی۔ مسکرائیں اور بولیں۔

”اے بی! یہ لوگ خوبصورتی پر جان دیتے ہیں خوشیوں پر فدا ہوتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کس نہی دہن تھی۔ عطر پھول، اہن کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی۔ وہ شادھی نے کہا کہ جب تک اس عورت کے ماتھ کا لکھا ہوا پلاؤ، ان بتاؤں کی نظر نہیں نہیں کیا جائے گا پتہ نہیں چھوڑیں گے!“
 ”پھر لکھا ہوگا پلاؤ اور شاہ صاحب کی پانچوں گھی ہیں سوں گی؟“ میں نے ہنسی روک کر پوچھا۔

”چچی بولیں۔“
 ”اور کیا اسی وقت سامان آیا۔ آٹھ سیر کا خوب عمدہ گھی ہی گھی ٹپکا پلاؤ پکا کر شاہ صاحب کے گھر بھیج دیا کہ وہ جنات بابا کی نیاز دے کر انھیں راضی کر لیں!“
 ”اور پھر در دیکھے کیا؟“
 ”اے بیٹی! شاہ جی نے ایک پڑیا بھجوائی۔ سفید میٹھا میٹھا

سستی کتاب چچی کتاب کون کتاب

ان کتابوں کے پیرائے لکھنے والی لکھنوی سی

کرن کشت پکاری	۹ روپے	پوٹی بکس	۵ روپے
کرن کشت خوان	۹ روپے	پوٹی بکس	۵ روپے
حنکے رنگ	۵ روپے	حنکے رنگ	۵ روپے
ہاتھ کے بھیند	۵ روپے	حنکے رنگ	۵ روپے
پن ورک وکریٹورک	۵ روپے	کرن رنگ جلد	۱۰ روپے
اپنا گھر سچا ہے	۵ روپے	۶	۵ روپے
پونہ کاری	۵ روپے	۶	۵ روپے
نپاس وکریٹورک	۵ روپے	۶	۵ روپے
پھول سچا ہے	۵ روپے	۶	۵ روپے

۵ کتابوں کا پورا سیٹ منگوانے پر ہر ایک خرچ اداسے کے دفتر ہوگا، منگوانے کا پتہ

مکتبہ کرن
 اردو بازار لاہور



کے چیلنج

کتون راہی



”ٹنکسٹ اے شمس“

”بھئی بات تو بہت معمولی ہے یعنی کہ تمہاری اس نوکری سے متعلق“

”ارے بابا... میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تم میری نوکری کی پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو... دیکھو... قرین نے کتنی دفعہ سمجھایا ہے... یہ لاش میں لے سوچ سمجھ کر اپنی ہے... مجھے اس پر کوئی ایشیائی نہیں ہے“

”میں کب کہتی ہوں کہ ایشیائی کی بات ہے... بس دیکھو نا... ہمارے معاشرے کی کچھ حد بندیاں ہیں۔ ان کا وجہ سے کہتی ہوں... ورنہ مجھے“

”ورنہ کیا... جب تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو... اور اگر ہے تو پھر کھل کے کہو... تاکہ میں سوچ سکوں کہ میرا

”میں اتنی دیر سے تمہیں اک بات کہنا چاہتی ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے“

”تم تو بس شمس... شمس کر رہی ہو... بات بتائی تم نے۔“

”بات کیا... تمہیں پتا تو ہے... کیا کہنا چاہتی ہوں“

”بھئی مجھے کوئی الہام تو ہوا نہیں ہے“

”اب انجان تو مت بنو“

”انجان بننے کی کیا بات ہے“

انتخاب کہیں؟“ نہیں... نہیں شمس یہ بات نہیں اصل میں آئی...
 ابو، بھیا... باجی... سب کا کہنا یہی ہے کہ آخر وہ افسردہ
 کیوں ہے کیا کمی ہے۔ اس میں... تعلیم ہے... اعلیٰ
 خاندان ہے... پھر اس نوکری میں کون سے سرخاب کے
 پر لگے ہیں... جو وہ اس طرح مضرب ہے کہ کرے گا تو یہی
 کام ورنہ اور تو جیسے سارے کام بند ہو گئے ہیں؟
 یہ کہتے ہیں تمہارے گھر والے... تو پھر میرا خیال
 ہے تمہارا رجحان بدلنے میں بھی زیادہ حصہ نہیں لے گا...
 اس لیے... ٹھیک ہے ابھی وقت ہے سوچ لو... بعد میں
 پچھتا نا نہیں؟ برہنہ پورے ہیم سے عیاں تھی۔
 ”اللہ میں کیسے بچھاؤں...؟“ اسو بہر نہ نکلے کو بے تاب
 ہوئے ”بکھو شمس... ابواتی... اک بس ڈرا تو رکھو کیسے
 دلہا بنالیں۔ تم میں کمی کوئی نہیں... بی اسے ہو... جہی غامی
 نوکری کر رہے تھے کہ بہتہ نہیں کیا خط سوا رہا... کہ بہتیشہ اختیار
 کر بیٹھے... کاش مگھی سے پہلے تم نے اپنے خیالات کا ذرا
 بھی اظہار کیا ہوتا تو میں اتنی دیر نہ کو قائل کر لیتی... مجھے
 تو بس تم سے متعلق ہے اور کسی شے کو نہیں جانتی؟
 ”جب ایسا ہے تو پریشانی کی بات کیا ہے... رہا می
 وغیرہ کا سوال... تو دیکھو جب ہماری زندگی شروع ہوئی نا
 اس وقت ان سے ملنے میں ہرگز نہ جاؤں گا۔ چاہے
 مجھے اس کی کسی بھی قیمت اد کرنی پڑے؟
 ”بسک بعد میں دیکھی جائے گی... اب بتاؤ کیسے،
 قائل کروں انھیں وہ تو کہتے ہیں کہ ناک کٹوا دی اس نے؟
 ”مگر... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں
 اس پیشہ کو اختیار کر کے وقت میری نیت صالح تھی...
 تم خود سوچو تم اگر ٹپڑھے لکھے لوگ اس پیشہ میں نہیں تہیں گے
 تو لوگوں کی شکایات کیسے دور ہوگی... ابھی لوگ ڈرائیو
 کنڈیکٹروں کو برا بھلا کہتے بہتے ہیں جب ہم جیسے لوگ موجود ہوں
 گے تو برائیاں چیلنے کے امکان کم ہوتے جائیں گے۔ لوگ بھی ان لوگوں
 کو وہ جگہ معاشرے میں دیں گے جس کے ہم ٹھیکیدار بن بیٹھے ہیں
 اور ان میں بھی احساس ذمہ داری پیدا ہوگا... ان میں بھی انسانیت
 پیدا ہوگی... کیا تم انھیں بے حس انسان سمجھتی ہو؟ ایسا نہیں ہے
 یہ محبت کے بھوکے ہیں... خدا کی توجہ سے صحیح ہو سکتے ہیں۔
 انھیں ہمارے معاشرے کے بے رحم قانون کے عجائظ اور سنگل

لوگوں نے بے حس بنا دیا ہے... ورنہ یہ عزت بھی کرنا جانتے ہیں
 تم بس میری مخالفت کر دو... خللا... میرا سا کھدو... تاکہ
 میرے جیسے اور نوجوانوں کی بھی ہمت بندھے وہ معاشرے کو
 بدل ڈالیں... ورنہ یہ نہ ہو کہ تمہاری اور گھروالوں کی مخالفت
 سے گھر اکریں... ہمت ہار جاؤں... پلیز... پلیز مقرر...
 تمہیں میری محبت اور اس رشتہ کا واسطہ جس میں چند ماہ بعد
 ہم بندھنے والے ہیں... ہمت کرو تھوڑی سی؟
 ”مگر... مگر... شمس یہ ساری باتیں... یہ ساری
 باتیں... کاش... کاش امی ابو وغیرہ سوس کر سکیں۔ صرف میرے
 کرنے سے کیا ہوتا ہے؟“ بے بسی سے ہونٹ کاٹ میٹھی۔
 ”ٹھیک ہے اگر تم کچھ نہیں کر سکتیں تو میں پھر اس رشتہ
 کی مضبوطی کی کیا گارنٹی دے سکتا ہوں۔ جس کی بنیاد میں انگوٹھی
 پہنانے کے رکھ چکا ہوں؟“
 ”میں... میں... شمس وعدہ کرتی ہوں اگر ہمت
 کو تمہاری بس میں اگر بیٹھ جاؤں اور میں نے انگوٹھی اپنی انگلی میں
 پہنی ہو تو سمجھ لیا کہ میں نے... سب کو راضی کر لیا... کہ ہمارا
 بندھن مضبوط ہے اور مکیشہ مضبوط ہے گا... اس وقت تک
 کے لیے خدا حافظ؟“
 ”خدا حافظ“
 ”استاد... بس روکو بہت سی لیڈر کھڑی ہیں۔
 ... آہیے بہن... بہن جی... آپ ذرا اوپر جائیں...
 شاباش دوسری بہنوں کے لیے جگہ بنائیں... جلدی
 جلدی!“
 ”ارے تم... اس کا دل جھوم اٹھا... وہ اسٹینڈ
 کے قریب کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شمس کا دل
 جھوم اٹھا... قمر کے اٹے کا تھک کی انگلی میں انگوٹھی جگہ لاری تھی۔
 جو اس کے مضبوط ہٹھن کی علامت تھی۔ اس نے ایک دم بس
 اسٹارٹ کر دی... چاروں طرف صرف قمر کی کاچہرہ دکھائی
 دے رہا تھا... اس نے گردن گھما کر اسٹینڈ کے پاس کھڑی قمر
 کی طرف دیکھا... تو قمر نے جلدی سے کتابیں ہٹھالنے کے
 بجائے نظریں جھکا لیں... وہ نظریں جو شمس کو صرف شمس
 دیکھتی تھیں اور اس کی کتنی اپنی تھیں۔ دل مستوں سے بھرنا
 اس نے ترمگ میں کیسٹ آن کر دیا... اور گیت پہنچا
 لڑکے کے گیت کی دھن ہسیوٹی، بھائی شرونگ کر دی۔

حمیدہ یانو

فریال

چوتھی قسط



بدلی ہوئی زندگی کی صبح فیدے کے لئے کتنی حسین تھی۔ مگر وہ اس صبح کا معنی نہیں سمجھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی رات ہی رہتی۔ سہانے سپنوں کی رات۔ ان سپنوں کی رات جن کی تعمیر اب اس کے ہاتھ آئے ہی والی تھی۔

سورج نکل آیا تھا اور اس کی شمع کرین فریڈک کی اجازت لئے بنا ہی مکے میں درانی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آج کی صبح بھی کتنی جمیل لکھی روشن ہے میری قسمت کی طرح۔ رات گزر گئی تھی، اپنی خوشبوئیں ساتھ لے کر اب صبح بھی تڑواڑہ خوشبوئیں لے۔ فریدان ہی نیا لوں میں غور رہنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی سوچوں میں مداخلت کرے ماسی لئے آواز آتی۔

”بھتیّا“ اور کشو کا بارشیں چہرہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔

”اول ہوں“

فرید نے پیچھے میں منہ چھپانے کی کوشش کی۔ سوتا بن گیا مگر کشو بھی شاید دل میں ٹھان کر آیا تھا کہ جگا کر ہی دم لے گا برابر پکارے گا۔

”بھتیّا۔ بھتیّا۔ اے بھتیّا“

ایک نویں حضرت بھی عجیب تھے۔ بیٹا، بابو یا صاحب بھی کہہ سکتے تھے مگر بھتیّا کہتے تھے۔ فرید نے کرٹ بدلی۔

”کیا ہے؟“

آنکھیں بند کئے ہی پوچھا۔ اب صبح ہی صبح وہ اس کے درشن کرنے سے تدرہ۔ فرید نے پلٹ کر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں ہی دیکھ ڈالیں کشو کی صورت سے تو بہتر تھیں۔

”کشنو نے کہا“ آج اٹھنے کا ارادہ نہیں کیا“

فرید نے پوچھا ”کیوں نہیں کوئی کام ہے مجھ سے؟“

وہ کشو کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے رات کو ہی اس کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا اور یوں بھی رابعہ بیگم کے دل میں فرید کی وقعت بڑھانے میں اس کا اہم حصہ تھا۔ اب کے کشو نے کہا۔

”بھتیّا اٹھو تمہیں کام پر جانا ہوگا“

فرید جل کر کباب ہو گیا۔ جھلا ہر معاملے میں ہمارا اٹنا کیا ضروری ہے۔ بولا۔ ”چلا جاؤں گا کام پر بھی“

”کشنو نے کہا“ اور جو ہماری بیگم صاحبہ ناشتہ پر انتظار کر رہی ہیں وہ؟“

نجانے فرید کو رابعہ بیگم سے کیا پڑ ہوئی تھی کہ کشو کے منہ سے ان کا نام سنتے ہی اس کا موڈ بگڑنے لگا مگر وہ خاموش رہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے بیٹھا دیکھ کر کشو نے ہلک لگائی۔

”لو اب جلدی سے نہادھو کر ناشتہ کے لئے پہنچو۔ بیگم صاحبہ کب سے انتظار کر رہی ہیں“

فرید نے جل کر کھڑکی کی طرف دیکھا مگر کشو جا چکا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ پھر سے پیٹ جلتے مکروں کو کھا کر اٹھنا پڑا۔ وہ بڑے میاں پھر پہنچ جاتے۔

”بھتیّا اٹھو بیٹا اٹھو“ اور ایک یہ بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ کے لفظ سے کان پک گئے۔

وہ بڑبڑاتا ہوا نسل خانے میں چلا گیا۔ اس دوران اسے ایک بار بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ابھی کل تک وہ دفتر جانے کیلئے تیار ہو کر ناشتہ کے انتظار میں سوکھا کرتا تھا صرف چہرہ سولہ گھنٹے پینتڑ اس کی قسمت یوں پٹی ہے کہ اب اس گھر کی مالکہ ناشتہ کی میز پر اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

فرید نے بڑی سہولت سے غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور کنگھی کرتے ہوئے مختلف زاویوں سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتا رہا۔ جب اپنے عیاں اسے ملتی ہوئی کہ رابعہ بیگم نے خاطر خواہ انتظار کر لیا ہے تو وہ اپنے کواڑ سے نکلا۔ چال میں بھی شان تھا۔ خیر ہوا چلا تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس گھر کا داماد بننے جا رہا تھا۔ اور کل کو اس گھر پر نوکروں چا کر دیں پر اس نے حکم چلانا تھا۔

”بھتیّا۔ اتنی دیر کیوں کر دی نہیں پتہ ہے بیگم صاحبہ بیا رہی ہیں اور پھر رات کو دیر تک جاگی ہیں۔ لیکن تھکے بھرے تم ناشتہ

پر انتظار کر رہا ہے ہوا اللہ ذکر سے ان کی طبیعت بگڑ جائے تو؟

اب فرید کو بھی اپنی زبانی کا تھوڑا سا احساس ہوا۔ ہونے والی ساس تھی اور سمجھا جائے تو ماں کے برابر ہی ہوتی ہے۔ ساس بھیے اور رابعہ بیگم تو بڑی امیر کیر ساس تھیں۔ ماں کے سامنے تو ذرا افسار چاہیے تھا اس نے فرید نے کہا۔
”بس کیا کہوں بیشتر بابا تم کو رکا کر گئے مگر میری آنکھ پھر لگ گئی ابھی اٹھا ہوں۔ بیگم صاحبہ ناراض تو نہیں ہیں؟“
سختو کی باجیس کھل گئیں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا:

”ارے ہماری بیگم صاحبہ تو فرشتہ ہیں فرشتہ۔ پھر دہری تھیں فرید میاں کی طبیعت تو ٹھیک ہے بابا میں نے ہنس کر کہا بیگم صاحبہ طبیعت تو ٹھیک ہے مگر جوانی میں نیند بہت پیاری ہوتی ہے اس لئے انھی ملک سو رہے ہوں گے؟“
فرید مسکرایا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس حرکت سے رابعہ بیگم خوش نہیں ملتی تھیں۔ انہیں جی حضوری کرنے والے ان سے مرعوبان کی دولت سے خوفزدہ داماد تو کب کا بل چکا تھا مگر انہیں تو ایسا دادا چاہیے تھا جو کسی سے ڈڑتا ہو۔ کسی سے مرعوب نہ ہو۔ اگر جبریاں کے ایک بار ملا دے پر سلام کرنا ہوا تو پہنچ جاتا تو رابعہ بیگم کی تو فتات کو شاید بھینس پھینچتی۔ اس لئے انہوں نے بڑے غوش غلطی سے فرید کا استقبال کیا۔ اس کے سلام کا جواب دے کر بولیں۔
”آؤ بیٹا ہمارے ساتھ ناشتہ کرو۔“

فرید کو محسوس ہوا کہ اس عورت میں اتنی کشش ہے کہ خواہ مخواہ احرام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ان کی غیز موجودگی میں اس کے بارے میں سوچ کر جھجھلا جاتا تھا مگر سامنا ہوتے ہی اسے احساس ہوتا کہ یہ عورت عزت کے لائق ہے۔ احرام کے قابل ہے۔ ایک عجیب سی نرمی رابعہ بیگم کے وجود کو اپنے حصار میں لئے رہتی تھی یوں جیسے تپتے ہوئے موسم میں مٹی کی ٹکڑی ٹھنڈی پھوار چڑ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بہت کی چمک تھی متالی چمک تھی۔ اس کے سارے چہرے پر ایسی چمک تھی کہ نظر بھر کر دیکھنا مشکل لگتا جس طرح سونا جلتا ہے تو نکل بن جاتا ہے اس طرح نکل کی آگ میں جل جل کر محض اپنے ماں ہونے کا ثبوت دینے کے لئے وہ بھی تو عذوں کی کٹھالی میںیں کود گئی تھیں اور اس جلتی ہوئی کٹھالی نے انہیں کدیرن بنا دیا تھا۔ ناہید کے لئے وہ مرا پائیاں نہیں تو ناہید کے دل میں بگاڑ پائی ماں کی عظمت کا بت۔ تھا جسے وہ چاہتی ہی نہیں پڑتی تھی۔ مگر نہانے کیا بات تھی کہ فرید کے دل میں آنکھ لئے عجیب سی کیفیت تھی۔ سامنے آتا تو احرام کر لے کو دل چاہتا۔ نظروں سے اوجھل ہوتا تو کوسے تک لگتا تھا جیسے اہلیک نے فرید پر کوئی ظلم کیا ہو۔ کوئی زیادتی کئے ہو۔ برابر کے کمرے کا پردہ ہٹا کر ناہید اندر داخل ہوئی۔ وہ فرید کو دیکھ کر لمحہ بھر ذرا جھجکی اور پھر آکر سائڈ بورڈ کے پاس کھڑی ہو کر اس نے نو ستر اٹھا یا اور اسے میز کے کنارے پر رکھ کر۔ بگ بگ لگا دیا۔ فرید نے دیکھا وہ گہرے سبز کپڑوں میں تھی۔ ایک بار پھر میتے کی سفید اچھوتی مٹی فرید کی نظروں کے سامنے آگئی۔ وہ اپنی لمبی سیاہ پلکیں جھکائے کھڑی ڈسٹ سینکے لگی۔ نرم نرم سے جذبے فرید کے دل میں سراٹھانے لگے تو وہ اسے پہلے بھی اچھوتی لگتی تھی۔ مگر اس وقت تو وہ سیدھی اس کے دل میں اتر گئی۔ محبت کے جذبے نے اس کے دل میں گلاز پیدا کر دیا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے جی شکل سے اپنے سینے میں رکھی سانس کو آزاد کیا اور جیسے جھک کر کسی کی پشت سے ٹپک لگائی۔ اس کا دل چاہتا تھا ان لمحوں میں وہ تنہا ہوتا۔ اس نے ذرا مسکرا کر رابعہ بیگم کی طرف دیکھا وہ بھی گاہے گاہے اس کی طرف دیکھ لیتی تھیں۔ یہ لوکا انہیں کتنا اچھا لگتا تھا۔ یہ بات وہ صرف ناہید کے باپ سے ہی کر سکتی تھیں۔ فرید کی۔ مسکراٹ کا جواب مسکراہٹ سے دے کر بولیں۔
”انجاء دیکھو گے؟“

انہوں نے اپنے سامنے رکھا انجاء اٹھ کر اس کے دائیں ہاتھ کی طرف رکھ دیا۔
سختو اپنی نگاہیں میں ناشتہ تیار کر دیا کرتے آیا تھا۔ فرید کی پسندیدہ چیز آدیت۔ جام مکھن اور پراٹھے بھی۔ پراٹھوں کی پیٹ بکترنے سامنے رکھ دی۔ ساتھ ہی ناہید نے سینکے ہوئے ڈسٹ اور مکھن کی پیٹ آگے بڑھا دی۔ کمرے کے نیم گرم سے ماحل میں اس کی استہا بڑھ گئی۔ اس نے پہلے تو دو ڈسٹ لئے مکھن اور جام کے ساتھ اور پھر آدیت اور پراٹھے سے انصاف کرنے لگا چونکہ اس وقت حسب ناہید نے پوچھا۔
”اسپ کے لئے چائے بنا دو؟“

فرید شرمندہ سا ہو گیا۔ ”جی ماں بنا دیجئے۔“

اب اسے ہاتھ کا نوالہ کھانا مشکل لگ رہا تھا۔ رابعہ یگم نے کہا۔

”تم نے ہاتھ کیوں روک لیا عزیز۔ کھاؤ بیٹا“

فرید نے کہا ”جی جی۔۔ کھا چکا“

”نہیں بھئی یہ رابعہ یگم بولیں“ تم نے زرات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اب ہمیں ناشتہ اچھی طرح کرنا چاہیے“

فرید نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ جام گئے دو تیس رابعہ یگم کی پلیٹ میں پڑے تھے اور ناہید نے ناشتہ شروع ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے جاتے بنا کر کپ آگے بڑھا دیا۔

”شکر“

فرید نے نیکیں سے ہاتھ صاف کر کے کپ تمام لیا۔ اس کا پیچا ملو وہ ناہید سے کہے ”ناشتہ تو کرو“

مگر ابھی اس سے اتنا بے لگفت نہیں تھا۔ جلدی جلدی چائے پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اجازت دیجئے مجھے انس بھی جانا ہے“

”جاؤ بیٹا۔ اللہ کی امان میں۔“

یہ دُعا فرید نے بڑی مدت کے بعد ہی تھی۔ اس نے مگر رابعہ یگم کی طرف دیکھا وہ انہیں اُمی کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا۔

”خدا حافظ“ انہوں نے بڑے خلوص سے جواب دیا ”خدا حافظ“

ناہید کی شہین بھی جاری تھی۔ اور ہرگز نئے دن کے ساتھ یہ معمول بن گیا کہ فرید صبح کو ناشتہ اور رات کا کھانا ناہید لایا جی میں کھانے لگا۔ عام طور پر اس کے ہمراہ رابعہ یگم اور ناہید ہی ہوتے تھے مگر کبھی کبھی سیٹھ جلیل بھی جاتے ان کی موجودگی۔ فرید کی طبع پر سنت ناگوار گزرتی تھی۔ اور اس دن وہ دھڑک سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ لیکن سیٹھ جلیل نے دوبارہ کبھی اس کی موجودگی پر اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی انس میں اس کا نوحس لیا تھا۔ اس لئے فرید کے دل سے وہ ہوا تو دور ہوا جو ان کی شخصیت نے قائم کر رکھا تھا۔

رات زیادہ دُگڑی تھی مگر رابعہ یگم سونے کیلئے لیٹ چکی تھیں۔ سیٹھ جلیل نے بڑے بلب لگ کر کے اپنی طرف کا لیمپ بٹن کیا اور رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ سوتاج کی ایک فکشن بابا راس کی پیشانی پر پڑتی اور سٹ جاتی۔ پھر اس نے پلیٹ کر رابعہ کی طرف دیکھا وہ اس کی طرف سے منہ موڑے لیٹی تھیں مگر وہ جانتا تھا کہ جاگ رہی ہیں۔ وہ کمزوری عورت کبھی قابلِ شہر تھی۔ یہ وہی جانتا تھا کہ چاہے کتنے برس بھی گزر جائیں مگر وہ اس عورت کو دبا نہیں سکتا تھا۔ اس باغی عذیبہ کو کچل نہیں سکتا تھا جو رابعہ کے دل میں تھا۔ وہ چند لمحے ان کے گھٹے سیاہ بالوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جو ان بیٹی کی بال بھین سگر کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ بیماری نے ان کا بدن اور نازک کر دیا تھا مگر انہیں بد صورت نہیں بنایا تھا بلکہ وہ اور بھی دلکش ہو گئی تھیں زرد چنبیلی کی طرح۔

اس نے ذرا سا کھنکھار کر کہا ”رابعہ“

”ہوں“ وہ بدستور اسی طرح لیٹی رہی۔ سیٹھ جلیل رسالے کے صفحے کو مڑتا رہا پھر بولا۔

”کل میں نے کاغذات نکالنے کے لئے سیف کھولا تھا“

”پھر۔۔؟“

اس پھر کے آگے وہ کیا بولتا مگر وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ اب کی بار وہ کروٹ بدل کر اس کے رخ پیٹ گئی۔ ان کی جڑی بڑی بھدروئی آنکھیں لو دے رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے ذرا سا رکا۔ دراصل سیف میں مہتا لے زلیورات نہیں تھے“

”مجھے معلوم ہے“ کمال اطمینان سے اس نے کہا اپنے ملاک سے ہاتھ کے سہارے ذرا سر اُدھکا کیا اور بولیں ”وہ میں نے بلا کر میں رکھا دیتے تھے زمانہ ہوا“

”مگر کیوں“

”سیٹھ صاحب یہ بات تو آپ کی آمد سے پہلے کی ہے۔ آپ اب یہ سوال کیوں کر رہے ہیں“

جلیل بولا ”میرے دوست کے بیٹے کی شادی ہے میں چاہتا تھا ایک بار تم میرے سامنے بھی زیورہ بن کر دکھاؤ۔ تم نے تو تو کبھی میری خواہش پوری نہیں کی“

دابعہ طغز مسکرائیں ”سیٹھ صاحب، میں بیاز عورت اور جوان پکی کی مال ہوں مجھے زیورات اور شادیاں سے کوئی شغف نہیں ہے۔ زیورات وغیرہ ناہید کے لئے ہیں، اس لئے میں نے اس کے حوالے کر دیے“
جیل کا چہرہ فنی ہو گیا ”لا کر کی چابی تو تمہارے پاس ہوگی؟“
”جی ہاں“

”تو کل میرے ساتھ بک چلو مجھے بھی چنچریں رکھواتا ہیں“
”رابعہ نے کہا ”جی نہیں اس لا کر میں اور کچھ بیٹیں رکھا جائے گا۔ آپ دوسرا لا کر لے لیں“
جیل نے ہار نہیں مانی ”دوسرا لا کر لینے کی کیا ضرورت ہے چند کا غذات ہی تو رکھتے ہیں ان کی گنجائش تو کھل ہی آئے گی۔“
”لا کر میں نے ناہید کے نام سے لیا ہے۔ اس میں ناہید بھی کی چیزیں ہیں، دابعہ عجم نے رکھا ہی سے کہا۔“
جیل نے بغیر بدلا۔ ”اچھا چلو پھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے ناہید کے بارے میں کیا سوچا ہے“
رابعہ نے کروٹ بدل لی ”سوچنا کیسا؟“
جیل نے اس کے قونچوں کی پرواہ نہ کی۔ رابعہ کا کندھا کچھڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا اور بولا۔
”لو کی سہانی ہوگی آجے شادی نہ سہی کیس رشتہ ہی طے کر دیتے ہیں“
رابعہ نے کمرے کے پیچھے کیم رکھ کر ٹیک لگا لی، اب فیصلہ سنانے کا وقت آگیا تھا۔ وہ بھی کسی ایسے وقت کی منتظر تھی۔
جیل نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

”تم کو تو سارے حالات میں نے ہسپتال میں بتا دیے تھے۔ اب اتنے دنوں میں یہیں بھی اعلان ہو گیا ہوگا؟“
رابعہ نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پا کر کہا ”کس بات کا اندازہ؟“
”ارے ہی، حزیہ۔۔۔ میرا مطلب ہے ناہید کا ٹیڈر۔ دیے تم نے اسے زیادہ ہی دھیل دے رکھی ہے۔ خیر میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں۔ دراصل تم میری صداقت کو پرکھنا چاہتی ہو۔ مگر بھی یہ طریقہ کچھ غلط سا ہے۔“
رابعہ کو اس طرز گفتگو سے لطف آئے لگا۔ بڑی سادگی سے بولی ”کون سا طریقہ؟“
”سمجھتی ہوئی۔۔۔ کہ“ اس نے نظر بھر کر رابعہ کی طرف دیکھا وہ جانتا تھا کہ رابعہ اس کے دل کی گہرائی میں اٹھنے والے خیالات کو سمجھ جاتی ہے۔ وہ ہر واقعہ پر فریب کو سمجھ جاتی ہے مگر پھر بھی اسے آج بات کرنا تھی۔ اس کا ادب باش بھیجی کسی اور لوکی کے چہرے تھا جو نہ صرف عزیز بلکہ براہم بھی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر رابعہ نے کہا۔
”ہاں ہاں بچپے۔ رک کیوں گئے؟“

جیل اب اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ تخی سے بولا۔
”قرآنے آخر اس لوکر کو اس قدر فنی کیوں کر رکھا ہے۔ میں نے اسے اور ناہید کے بارے میں سب کچھ بتیں بتا دیا تھا مگر تم اپنی ضد میں لڑکی کو تباہ کر دو گی۔ اور میرے گرد و دنگی بعد میں؟“
رابعہ نے کہا ”جیل صاحب! یہ میرا اور میری بچی کا معاملہ ہے آپ کو اس سے کیا مطلب۔ یہ میرا گھر ہے اس میں وہی کچھ ہوگا جو میں چاہوں گی۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے“ جیل نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی شادی کر دو۔ میں نے قسم سے اپنے بھتیجے کے بارے میں کہا تھا وہ نہایت ہی نیک اور چارھا لڑکا ہے۔ دولت مند ہے۔ پڑھا لکھا ہے، دیکھ بھال لو“
رابعہ نے بڑے اطمینان سے کہا ”رشتہ تو میں نے کب کا طے کر دیا ہے“
جیل کے اس پاس جیسے دھماکہ سا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی ہوئی رابعہ کو گھورا اور بولا۔
”مجھ سے پوچھ بچا تم نے رشتہ طے کر دیا۔ سچی نہ سچی سوچتی ہی سہی مگر پھر بھی لڑکی ہے۔ کیا تم نے مجھے مشورے کے لائق بھی نہ سمجھا؟“
ایک ذرا ہیر ہی مسکراہٹ رابعہ کے لبوں پر آئی آنکھوں سے چمکی اور لپٹا۔
”اس لئے کہ آپ اس رشتے کو پسند نہ کرتے“

جیل نے حیرت زدہ ہو کر کہا ”کس سے بات طے کی ہے تم نے جسے میں ناپسند کر دیتا۔“

رابع نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا " فریڈ سے " کیا... کیا کیا کہا! جیل کے منہ سے مارے حیرت کے لفظ نہ نکل سکے۔ وہ رک رک بولی " فریڈ سے... اسی تیرے جس کے نام سے تم میری بچی کو بدنام کر رہے تھے۔ " نہیں نہیں " جیل نے اپنا سر جھکے دیا " تم ایسا نہیں کر سکتی " وہ ہنس دی " کر سکتی کیا کر چکی ہوں! "

وہ جنوں کے عالم میں تھکے نوچنے لگا۔ یہ عورت یہ اسے بار بار شکست دینے والی عورت۔

" میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گا "

اس کے بال بکھر گئے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور گھٹی مڑکھیں پھوٹ کر رہی تھیں۔ مگر رابعہ ذرا خوف زدہ نہ ہوئی۔ اکیسے نیازی سے دیکھتی رہی۔ یہ نازیبا لڑکا کہ وہ سچ سچ خوش تھی۔ اس نے ایک ہلکا سا ہتھکڑ لگایا۔ اور اس ہتھکڑ نے جیل کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ " میں آج نہیں ہی تم کر دوں گا "

وہ جنوں کے عالم میں آگے بڑھا " تم نے مجھ سے ناہید ایک بار پہلے جھینڈی تھی۔ ناگن ایک بار پھر جھین رہی ہو۔ میں پہلے نہیں ہی مار ڈالوں گا تم نے میرے مارے منصوبے ناکام بنا دیے۔ تمہارے بعد ناہید اور میری ساری دولت میری ہوگی! "

اس نے دونوں ہاتھ اس کے گھٹے پر رکھ دیے مگر رابعہ کا ذہن دہرا رہا تھا۔

" میرے بعد ناہید اس کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اس شیطان کے قبضے میں جس سے پہلے کے لئے شادی کی بدنامی مول لی۔ رسوا ہوئی۔ نہیں نہیں مجھے ناہید کو بچانا ہے۔ یہ ضرورت بچانا ہے اس عفت سے! " ایک بے ساختہ بیچ ان کے حلق سے بلند ہوئی اور اس سے پہلے کہ جیل ان کا گلا دباتا۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور یہ وحشت ناک منظر ہنسٹا اور ناہید دونوں نے دیکھا۔

" خواب میں ڈر گئی ہے " جیل نے اپنے بال ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے کہا۔

انہوں نے لمحہ بھر میں خود پر قابو پا لیا تھا۔ ناہید دوڑتی ہوئی آئی اور رابعہ نے ہاتھوں میں بھر لیا۔

" میری بیٹی... "

" اٹھ کیا جوا تھا؟ "

ناہید نے بال کے ٹھنڈے ہاتھ تمام لئے بکشتو گو مگو کے عالم میں کھڑا تھا۔ رابعہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

" میں نے دیکھا بیٹی! " انہوں نے ہچکیاں لے کر کہا۔

" میں نے دیکھا ایک بڑا سا ناگ نہیں لنگھنے کی کوشش میں ہے۔ میں نہیں اس ناگ سے بچاؤں گی میری بچی! "

رابعہ نے بھر اسے سینے سے لگا لیا۔ جیل دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کھڑا تھا۔ بکشتو نے آگے بڑھ کر سائیڈ بیبل پر رکھے

جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور آگے بڑھ کر بولا۔

" پانی پی لیجئے۔ پیگ صابو! "

جیل نے کہا " اس شیشی میں سے ایک گولی بھی نکال دو بکشتو بابا! "

رابعہ نے آنسو بھری نظریں جیل کی طرف اٹھائیں تو جیل کے دل کو بڑی تسکین ملی۔ آج وہ پتھر پگھل گیا تھا جس سے سر پھکا

ٹکرا کہ وہ زخمی ہو گیا تھا۔

" تشدد... تشدد " اس کے ذہن نے کہا۔ یہ عورت تشدد سے رام ہوگی! "

جیل نے اپنے دامنے ہاتھ کی کھٹی بند کر کے دیکھی۔ کافی مضبوط بندہ بننا تھا۔ اس نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اب راستہ صاف

کرنا دشوار نہ تھا۔ جلد بازی کی کیا ضرورت تھی چابیوں کا چھٹا اٹھا کر بولا۔

" خلیل بھائی کے ہاں جا رہا تھا۔ اب تمہاری طبیعت کچھ بہتر ہو تو جھلجا جاؤں! "

کچھ لمبے لمبے طنز رابعہ نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ نئی چال چلے گا۔ اسے لئے آفتاب

میں سر ہلا دیا۔

”اچھا خدا حافظ“

وہ دو جوان لڑکوں کی طرح لہراتا ہوا کمرے سے نکلا کھل جاسم سم کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ اس کے جلنے کے بعد رابعہ نے اہید کو اپنے دھڑکنے سینے سے لگا لیا اور بولیں۔

”آج تم میرے کمرے میں سو جاؤ“

ناہید نے حیرت سے کہا۔ ”مگر امی... وہ میرا مطلب ہے“

”وہ آج رات نہیں آئے گا“

ناہید نے اپنا سر ہال کی گود میں چھپا لیا اور کھنکھاتا ہوا کہہ۔

”بیگم صاحبہ کیا بیچ تم آپ خواب میں ڈر گئی ہیں یا کوئی اور بات ہے“

رابعہ نے اشارے سے اسے منع کیا پھر ناہید سے بولیں۔

”بیٹا لا کر کی چابی کہاں ہے؟“

”میرے کمرے میں ہے امی“ ناہید نے کہا۔

”اچھا اب تم سو جاؤ۔ صبح ذرا بیگ چلیں گے“

”جی اچھا“

رابعہ نے بخشتوں سے کہا۔ ”بابا تمہیں تکلیف تو ہوگی مگر تم اپنا بستر میرے کمرے کے دروازے کے باہر لگا لو۔ میرا دل ابھی تک ڈر رہا ہے۔“

بخشتوں نے جھٹ سے کہا۔ ”بہنیں بیگم صاحبہ تکلیف کیسی ہیں ابھی بستر چادر لے آتا ہوں“

رابعہ نے یہ سوچ کر کہیں چیل ادرادھر نہ چھپا بیٹھا ہو بخشتوں سے کہا۔

”رہنے دو اپنا بستر چادر... میری الماری سے چادر نکال لو۔ گدا بھی لے لینا اور اب تم جا کر لیٹو“

وہ چاہتا تھا کہ لیٹ پر چوکیدار سے بھی پتہ کر داسکتی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بخشتوں دہل کے لئے بھی کہیں جائے بخشتوں نے

ان کی ہدایت کے تحت ضروری بستر نکالا اور راہداری میں دروازے کے آگے کچھ لایا اور بیٹھ کے بکائے بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن بہت

معروف تھا یہ تو کچھ کیا تھا کہ طبل نے جھوٹ بولا ہے بات کوئی اور ہی ہے مگر لوچھنا مشکل تھا خصوصاً ناہید کے سامنے کیونکہ وہ

جانتا تھا کہ رابعہ اپنی پریشانی کا شہر بھر علم ناہید کو نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔

”امی آپ لیٹ جائیں“

ناہید نے ہال کا سر نیچے پر رکھا۔ رابعہ نے اس کا سر سہلایا اور بولیں۔

”تم بھی لیٹ جاؤ۔ یوں میرے پاس میرے ساتھ جیسے ہمیں میں سوتی تھیں۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بغل میں منہ چپا کر“

ناہید ہال سے پٹ کر لیٹ گئی۔ کتنی مدت بعد وہ ہال کے نرم اور گرم پہلو میں تھی۔ ایک مٹی سی معصوم بچی کی طرح اور اس پہلو

کی نرمی اور گرمی اسے ٹولوں میں ننید کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ مگر رابعہ کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ وہ فٹانے

کے سرد گرم سے اپنی پھول کی پتی کو بچا نا چاہتی تھی۔ مگر زانہ رک رک کر نئی چالیں چل رہا تھا۔ اسے جلد ہی کچھ کرنا تھا۔ اس نے آہستہ

ناہید کا ہاتھ سینے پر سے ہٹایا اور ذرا جھک کر دیکھا۔ ناہید گہری نیند سو رہی تھی۔ رابعہ دھیرے سے انکھیں میٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا

اور پھر مست سے اٹھ کر دروازے کی طرف گئیں۔ مگر اطمینان کیا کہ ناہید سو گئی ہے۔ پھر وہ دروازہ کھلی کر باہر آگئیں۔ بخشتوں دیوار سے

ٹیک لگاتے بیڑی پی رہا تھا۔ بیڑی جھکا کر کھڑا ہو گیا اور سرمزاتی آواز سن بولا۔

”بیگم صاحبہ آپ... کیا بات ہے؟“

رابعہ اس کے بستر پر ہی بیٹھ گئیں اور بخشتوں کے احتجاج سے پہلے بولیں۔

”سب کچھ چھوڑو۔ اس وقت میری بات سن لو“

بخشتوں مرتن گوش ہو گیا۔ ”جی“

رابعہ نے کہا۔ ”یہاں بیٹھا جاؤ۔ تم میرے ملازم ہی نہیں ہو بلکہ میرے غیر خواہ بھی ہو“

بخشتوں جیسے جیسے بیٹھ گیا۔ رابعہ نے آہستہ آواز میں کہا۔

”بہنو! یہاں جیل اب اوچھے بھنگھٹوں پر تیار ہے۔ تم صبح فریڈ کو دفتر مت جانے دینا اور اس کے ساتھ جا کر نکاح خواہی کو بلا لانا پھر فریڈ کو کپڑے وغیرہ دلا دینا شادی کے لئے۔ میں چاہتی ہوں کہ عصر کے وقت ہمیں نہایت کی شادی کروں۔ تم اسٹیشن جا کر رات کی ٹرین میں لاہور کے لئے فرسٹ کلاس ہیں دو ٹکٹ بک کروالینا۔ اگر کنگ نہ ہو سکے تو زیادہ پیسوں سے کسی سے ٹکٹ لے لینا۔ مگر کل رات تک ضروری ہے“

سجشتر نے کہا : مگر بیگم صاحبہ ! جب نکاح اتنی جلدی کر رہی ہیں تو خیر دن اپنے پاس روک کر بھیجے گا ۔
اس پر رابعیہ نے ذرا دیر پہلے کے پورے واقعات سجشتر کو سنا دیے ۔ اندر دروازے کے قریب کھڑی ناہید سنائے میں رو گئی ۔
اے حالات کی سنگینی کا اندازہ اب ہوا تھا ۔ اس کا رواں رداں اپنی ماں کی ۔۔۔۔ سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا ۔ ظاہر ہے ناہید
کی شادی کر دینے کے بعد سارے عتاب اس کی جان نالوں پر اٹھنے لگے تھے ۔ مگر اپنی جان بچانے کے لئے وہ اپنے مرحوم شوهر کی بیٹی
کو آگ میں نہیں دھکیل سکتی تھی ۔ ناہید کے دل پر اپنی ماں کی عظمت کا ایک نقش اور بن گیا ۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ فرید کے ساتھ
تنبہا نہیں جائے گی ۔ اپنی ماں کو ساتھ ہی لے جائے گی ۔ برجنوی کی مالک وہ تھی اور جب وہ اپنی کل ملکیت لے کر فرید کے ساتھ جاگی
تو اس ماں کو یکے چھوڑ جائے گی جس نے اس ملکیت اور خود ناہید کو بچانے کے لئے زہر کا پیالہ پیا تھا ۔

رابعیہ نے سجشتر سے کہا ۔

”لو اب تم بھی آرام کر لو۔ دعا کرو کل کی صبح میری بیٹی کے لئے مبارک ہو۔“

بجھٹونے بڑے خلوص سے کہا: ”آمین“

اپنی اس کے اندازے سے پہلے ناہید بستر پر جا لٹی اور کیچے میں منہ چھپا لیا۔ راجہ آہستہ قدموں سے اندر آئیں۔ ناہید کو سوتا پا کر ملتی ہوئی نہ دیکھ کر حیرتوں نے کیچے پر سر رکھا تو دعا کی۔

”اے رب العالمین! میرے فیصلے کو اپنا بارگاہ میں قبولیت دینا۔ میری مظلوم بیٹی کی تقدیر
دھیرے دھیرے وہ ناہید کے بال سہلائی رہی۔ مگر دل کو کسی کی عین نہ تھا۔ اس نے اٹھی اور ہائے نماز بجا کر بیٹھ گئی۔
آنے والی صبح فرید کے لئے انتہائی کبیر آمیز اور سنسنی خیز تھی۔ جب شہر نے اسے سجا اور غصں سمجھتے ہوئے ساری بات سنا دی۔ کناج پرفرید
کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا یہ تو اس کی دلی خواہش تھی کئے خواب تھے جو تعبیر پا نے والے تھے۔ کتنی حسرتیں تھیں جو پوری ہونے کا دن
آگیا تھا۔ بس آکھادان گزرنے کی بات تھی۔ پھر وہ ناہید ہی نہیں اس ساری جائیداد و دولت کا مالک بننے والا تھا چند ماہ کے لئے اسے شہر
سے جانا بھیجی جان سے گوارا تھا۔ وہ تو تجانے کب سے فراغت کے دن گزارنے کا خواہشمند تھا۔ کتنی تنگدستی وہ بھی امیر دل کو طرح دن
چڑھے۔ ہک سوتا رہے۔ من چاہے تو بے نیازی سے فاعلوں پر دستخط کرے۔ درجہ موہ نہیں کہہ کر اگر کنوٹیشن کرے میں بند ہو کر بیٹھ
جائے۔ دوستوں سے بیٹی فون پر گپ شپ لڑائے۔ اچھا کھاتے اور بہت اچھا پہنے۔ دھیرے دھیرے مسکراتا رہا۔ گاہے گاہے غرور
بھی ہو جاتا کہ جیل کوئی قندہ ڈال دے رہر حال وہ بڑی تندہی سے سمجھو کے ساتھ مصروف رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کناج کے وقت
طیسی شیر دانی پہننے۔ صاف بارماندے اور سہرا سجاتے۔ مگر کپڑے والے کو شاید بالعموم بیٹی فون کر دیا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے
جاتے ہی اس نے کیم کمر کی انتہائی قیمتی شیر دانی کا کپڑا کھانا اور بنا پرچھے فرید کا ناپ لینے لگا۔

"مگر یہ کپڑا تو..."

مزید نے بے بس بحث کی طرف دیکھا مگر دکان دار نے دیمے سے کہا۔

”بیگم صاحبہ کا ٹیلی فون آیا تھا انہوں نے اس کا آرڈر دیا تھا۔“

فرید خاموش رہا۔ اسے رالپر پر غصہ بھی آیا کہ کھلا اس معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی مگر ہمیشہ کی طرح اسے اپنا دل مارنا پڑا۔ ناپ لینے کے بعد دوکان دار نے اپنی رست واپس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

”ایک بچے کو کڑائی کر لیجئے گا۔“

“吉”

مزید بڑے ہوشیاری کی طرح کہا یعنی تین گھنٹے میں کپڑے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں سے وہ لوگ نکاح خواں کے ہاں گئے اور ایک گھنٹے بعد وہ اسٹیشن پر تھے مگر کنگز اکٹھ دن سے پہلے کی نہیں مل رہی تھی۔

بے حد رش تھا۔ بکشتو نے کسی قلی سے بات کی، کوک کو متوجہ کیا، وہ اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی طرح بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ صبح سے ایک بار بھی وہ مسکرایا نہیں تھا، اس کا دھیان رابعہ اور ناہید کی طرف تھا۔ ان لوگوں کے ٹیک جانے کے بعد وہ دونوں نکلے تھے۔ اب وہ جلدی کام پیش کر گھرجا رہا تھا۔ صاحب کو خریدیوں میں سوچ رہا تھا کہ اگر لاہوری بھیجوانا ہے تو حوالی بھانسنے کو اسکی پیٹل دیوڑھی کا بھڑکرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے خبر نہیں تھی کہ رابعہ نے یہ اس لئے کیا ہے کہ اگر پہل کو اس کا روٹی کی خبر نہ ملے گی تو ناہید کو روکنے کے لئے اس پر رٹ ہی جائے گا۔ اتفاق سے بکشتو کی پریشانی ایک صاحب نوٹ کر رہے تھے۔ اگلے بڑے اور بولے۔

”بڑے سیال آپ بہت پریشان ہیں کیا محنت چاہیے؟“

بکشتو جھٹ سے بولا، ”جی ہاں صاحب آج رات ہی روانہ ہونا چاہتے ہیں بے حد ضروری ہے۔“

بکشتو کی پریشانی سے وہ صاحب متاثر ہوئے اور بولے۔

”کتنے چاہتیں آپ کو اور کہاں کے؟“

”جی دو لاہور کے لئے؟“

”بس“ وہ مایوسی سے بولے اور بکشتو نے پریشان ہو کر کہا۔

”کیا آپ کے پاس زیادہ ہیں؟“

وہ آہ بھر کر بولے۔

”ہاں صاحب ہم نے چار آدمیوں کا فرسٹ کلاس ٹکٹ بک کر دیا تھا۔ آج رات کی ٹرین سے ہنڈی ملک کا۔ مگر پروگرام ملتوی ہو گیا۔“

محنت واپس کرنے آیا تھا۔

بکشتو نے حاضر دماغی سے کام لیا۔

”صاحب چاہیے تو چار ہی تھے مگر میں نے سہا دو آپ سے مل جائیں باقی کیسے اور کوشش کریں گے۔“

ان صاحب کی باتیں کھل گئیں۔ آپس میں بات چیت کے بعد یہ پاس روہی کی محنت زیادہ چار بج کر کے انہوں نے چار ٹکٹیں بکشتو کے حوالے کیں اور اپنا راستہ لیا۔ خریدنے کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر بکشتو نے کہا۔

”بس بھیا۔ اب جلدی گھر چلو۔ بارہ تو بیزنس جمع کئے۔ گھر پر اور بھی کام ہوں گے اور میں تمہیں کچھوں کی دکان یاد رہے۔“

خریدنے ڈرا سوجا اور بولا، ”شاید ٹھیک سے نہیں؟“

”اول...“ بکشتو نے فکرت سے سر ہلایا اور پھر بولا۔

”یوں کرتے ہیں میں میں تمہیں وہاں چھوڑتا ہوں گھر چلنا ہوں۔ تم پکڑو لیکر ٹیکسی میں آجاتا؟“

خریدنے نے کہا، ”ٹھیک ہے مگر ٹیکسی کے پیسے دے دو۔ میں تو بیزنس کچھ پر ہی بھول آیا۔“

بکشتو نے شوکے کی جیب سے دو سو سو کے نوٹ نکالے اور اس کے ہاتھ پر دھر دیے۔

”واہ اللہ یہاں تیری شان ہے؟“

خریدنے مسکرا کر کہا، ”مگر بکشتو نے اس کی بات پر دھیان دینے کے بجائے ٹیکسی کو روک دینے کے لئے زور شور سے اشارے کرتے ہوئے فریڈ کو دکان پر چھوڑ کر بکشتو گھر چلا گیا۔ رابعہ جگمگ سے آہنی تھیں اور سارے زیورات اور کاغذات ایک آچی میں منتقل کچھ

تھیں۔ سبھی صبح رات کا گلیا اچھٹک نہیں لوٹا تھا۔ شاید بھائی کے ہاں سے مل چلا گیا تھا۔ شاید اس کے نہ آنے کی وجہ سے ہی

رابعہ کی پریشانی فرام ہوئی تھی۔ ناہید گھر میں کسی۔ اسے رابعہ نے مختصر الفاظ میں اس دن کا پروگرام بتا دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا

تھا، ”ای میں آپ کو تنہا پھر ڈر نہیں جاؤں گی۔“

رابعہ نے بھایا، ”بیٹا مجھے تیار ہے ہاں ہی رہنا ہے مگر چند دنوں یا شاید چند ہفتوں تک مجھے یہیں رہنا ہوگا۔ تمہارے محفوظ

کی خاطر۔ جب جیل کو معلوم ہوگا کہ اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں تو وہ خود ہی میرا بچھا چھوڑ دے گا۔ سو تب تک نہیں

تنہا ہی رہنا ہوگا۔“

اس پر ناہید غامض ہو گئی حالانکہ وہ اپنی ماں کو ایسے خطرناک حالات میں چھوڑ کر جانے پر راضی نہیں تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی

تھی کہ یہ مصیبت وقت ہے۔ رابعہ دو دھاری تھوڑی کی زمین میں کھائے تھے جگہ کو اس کی کاٹ سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں۔

بجٹھنے والے کو بتایا کہ چار آدمیوں کا کوہ پی لینا پڑا تو وہ نکر مند سی ہو گئی۔

”بجٹھو بابا کو پے میں دونوں تنہا ہوں گے اتنا سوچ کر زلیہ ہو گا ان کے ساتھ اور دشمن تاک میں ہیں۔“
بجٹھنے کہا ”سچ صاحب یہ تو بکرا چھاپا ہے کہ وہ لوگ تنہا ہوں گے کیا معلوم کوئی ہم سفر ہوتا تو کتنا خطرہ بھی ہوتا۔
چوروں اور چٹھکوں کی صورت پر تھوڑی — لکھا ہوتا ہے کہ وہ چور ہیں۔“

رابعہ نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر وہ اندرونی طور پر بہت فکر مند تھیں۔
جیل کی کوئی اطلاع نہ تھی نہ ہی آیا اور نہ ہی ٹیلیفون کیا تھا۔ اب رابعہ ڈر رہی تھیں کہ وہ عین موقع پر نہ آجائے مگر ایک بجے کے قریب اس کا ٹیلیفون آیا جسے بجٹھنے نے لپیٹ لیا۔ اس نے کہا تھا کہ رات کو دیر سے آئے گا، کوئی ضروری میٹنگ ہے۔ رابعہ نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا۔ دوسرے تمام ملازمین کو بھیج دیے۔ اب گھر میں صرف بجٹھو باہا تھے۔ ڈیڑھ بجے تک فریڈ بھی آگیا وہ بہت خوش تھا۔ شیردانی پن کر جب اس نے آئینہ دیکھا تو اپنی وجہت پر خود حیران رہ گیا۔ اس کے پیچھے کوڑے ہوئے بھوڑے بال۔ بڑی بڑی جھوڑی آنکھیں اور گلابی نالی رنگت نے اسے شیرازوں کا روپ دے دیا تھا اسے تھوڑا سا طرور ہوا پھر ناہید کا مراپا اس کے سامنے آیا وہ کیا کم خوبصورت تھی۔ ابھی چوڑی ہے اس نے مسکرت سوچ کر سر ہلا دیا۔

تین بجے دوپہر کا کھانا بڑی خاموشی سے امید کی میز موجودگی میں کھایا گیا۔ اس دوران رابعہ کی عزیز ترین بہن فریڈ اپنے شوہر فاروقی اور ولید وید کے ساتھ آگئیں بس یہی مہمان تھے ان کی شادی کے۔ بیچم فاروقی تو ناہید کے کمرے میں چلی گئیں۔ فریڈ کا لباس رابعہ نے اپنے کمرے میں رکھ دیا تھا اسے وہیں تیار ہونا تھا۔ عصر کی اذان کے بعد نکاح خواں شریف لاتے وہ سارے کاغذات تیار کر کے لاتے تھے۔ البتہ انہوں نے فاروقی صاحب اور وید کے ساتھ گفتگو کے بعد تیار کئے۔

فریڈ کو رابعہ نے تیار ہونے کا کہہ دیا تھا۔ کریم کلر شیردانی سفید پاجامہ پہن کر اس نے سلیم شامی جوتی پہن لی۔ آئینے میں دیکھ کر وہ بال سوار رہ گیا۔ سچے کہیں اس نے اس کا دل اداس ہو گیا۔ کاش اس کی ماں زندہ ہوتی، کوئی بہن بھائی ہوتا، کوئی یار دوست ہوتا دروازہ کھٹکھٹا کر رابعہ نے آواز دی۔

”فریڈ۔“

”جی... دروازہ کھلا ہے آجائے۔“

وہ اند آگئی۔ فریڈ اس عورت کی بہت کا قائل تھوہ لگانی سادھی پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں ہیرے کے ٹوبس تھے اور وہ مسکرا رہی تھی۔ وہی مسکراہٹ جو اس کے چہرے کا حصہ تھی۔ فریڈ کو دیکھ کر بولی۔

”ماشاء اللہ... اللہ کا شکر ہے آج اس نے مجھے ایک پیارا سا بیٹا بھی دے دیا۔“

فریڈ نے انکساری سے سر جھکا دیا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے بڑھیں الماری کھولی ایک ڈربہ اٹھایا اور بولیں۔
”اگر تیار ہو تو آ جاؤ۔“

فریڈ اس کے پیچھے نکل آیا۔ اسے تھوڑی تھوڑی شرم آ رہی تھی۔ رابعہ نے ڈربہ فاروقی کے سامنے رکھ دیا۔

”بھائی صاحب فریڈ کو صاف ہاندھ دیں۔ میں چاہتی ہوں نکاح ہو جائے۔“

فاروقی نے کہا ”درست ہے۔ آؤ بیٹا یہاں بیٹھو۔“

فریڈ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فاروقی نے ہم آشرہ کر کے اس کے سر پر بڑی خوبصورتی سے صاف لیٹ دیا اور پھر بڑا سا کلا تو کاہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔

”ماشاء اللہ...“

بیچم فاروقی اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا...

بجٹھو بابا بھی آگیا۔ پھر نکاح کی تقریب ہوئی اور دس منٹ بھی نہ گزے تھے کہ تانوفی اور شرعی طور پر ناہید اس کی ہو گئی۔ فریڈ کا دل جاما پر لمحہ ٹھہر جائے مگر لمحے گزر گئے۔ رابعہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اپنے انسویٹے مضبوط سے پیٹے۔ اور اس کی انگلی میں ہیرے کی قیمتی انگوٹھی پہنا دی۔

بجٹھو کی سفید داڑھی انسویٹے سے تر ہو گئی مگر رابعہ بیچم نے اپنے سارے انسواپنے دل میں اتار لئے انہوں نے اپنے دل

پر تہر کر رکھ لیا تھا۔

سب کی سار کادیاں فرید نے شکوے کے ساتھ قبول کر لیں۔ اس کی زندگی میں بڑا — غریب صورت تغیر آیا تھا۔ اب وہ بھی کچھ بچہ تھا۔ کوٹھی کار کا مالک۔
 رابع نے پٹھان چاہتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ فرید نے قسرت چلے کا ایک کپ ہی پیا۔ پھر سب کو چلے میں مصروف
 چھوڑ کر رابع نے فرید کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

”اڈا اب اپنے کمرے میں ذرا آرام کرو۔ پھر رات کا سفر ہے۔“
 وہ اسے ناہید کے کمرے میں لے آئیں۔ بکے زرد شید کا کمرہ جس میں گہرے گولڈن پرے پرے تھے۔ رابع اندر چلی گئی، پھر
 پلٹ کر بولیں۔ ”اندر آ جاؤ بیٹا۔“

فرید یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ناہید مکمل طور پر دلہن کے لباس میں تھی۔ رابع اس کے پیگ پر بیٹھ کر بولیں۔
 ”بیٹا میں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی موتی تمہارے حوالے کر دیا۔ اب اس کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے مجھے ناہید
 کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کا بہت ارمان تھا ورنہ حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔“
 ناہید سر جھکاتے بیٹھی تھی اس کے آنسو اس کی گود میں رکھے بے حد سفید ہاتھوں کو کھجور سے تھے۔ خاک اسرخی نے اس کے
 ہاتھوں کی سفیدی کو اور بھی بڑھا دیا تھا رابع نے فرید سے کہا۔

”یہاں آ کر بیٹھ جاؤ بیٹا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“
 فرید آکر چنگ کے پاس رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ناہید کا چہرہ اڑھیل تھا اور فرید اسے تنہائی میں دیکھنے کا نغمہ سنہنہ تھا۔
 رابع نے اٹھتی اس کے پاس رکھی اور بولند۔

”بیٹا میں جانتی ہوں تم کو کسی چیز کی خواہش نہیں۔ مگر میں نے یہ کوٹھی۔ مل سب ناہید کے نام کر دی تھی۔ اس اٹھتی میں کچھ
 زیورات اور دروہیر ہے۔ ہر سکتا ہے تم گول کو مستقل ہی لاہور میں رہنا پڑے۔ اس لئے نقد روپے سے کوئی کوٹھی خرید لینا۔ یہ سب
 چرین انسان سے زیادہ قیمتی نہیں۔ مگر زندگی گزارنے کے لئے یہ بہت ضروری ہیں۔“

رابع نے ایک طویل سانس لی۔ فرید سر جھکاتے مستعار اتنا بھی نہ بولا کہ کم از کم اپنے لئے تو کچھ رکھ لو۔ رابع نے کہا۔
 ”رات کا سفر ہے اور طویل بھی۔ بس ذرا ہوشیار کیے کیونکہ دشمن بہت عیار ہے۔ دوسرے سوٹ کس میں تم لوگوں کے
 کپڑے اور دوسرا سامان ہے۔ بول ہائی ڈسے میں تمہارے لئے کمرے بہک ہیں۔ مکان جدید خرید لینا۔ میں نہیں چاہتی کہ جلیل کسی طرح
 تمہارا پتہ لگائے۔“ پھر رابع نے ایک ڈائری فرید کو دی۔

”اس میں میری بے حد عزیز سہیلی کا پتہ ہے گورک میں۔ مکان خریدنے میں اس کا شوق ہے لینا۔“
 فرید نے ڈائری جیب میں ڈال لی۔ رابع چند لمے اس کو پھر ناہید کو دیکھتی رہیں۔ پھر بڑبڑا دے سی ہر کر بولیں۔

”تھوڑی دیر بعد تم لوگ باہر تو بول کر لینا۔ میں ذرا مہلا لال کی ٹبرے لوں۔“
 وہ دروازہ پھر کھلی گئی کمرے میں نوپھل ساسنا ٹاٹاری تھا جسے وال کلاک کی ٹمک ٹمک توڑی تھی۔

فرید نے جا ہد آگے بڑھ کر اس سن پسند دلہن کا روپ دیکھ کر اپنی وجاہت اور خوبصورتی کی داد وصول کرے مگر اس کے ہاتھ
 آگے بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ رومانی کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس کی نگاہ زیورات کے انچی کس پر پڑی رہی، مگر نہیں۔
 اس کے دل نے کہا۔ فرید نے نیزے کی وہ انگوٹھی جو رابع نے اسے دی تھی۔ اپنی انگلی میں سے اتاری اور پھر ناہید کا خانا اور سفید
 ہاتھ تمام کچھ کی انگلی میں پہنا دے۔ پھر اس کا گھونگٹ اٹ دیا۔ سرخ د و پٹے کے ہاتے میں ناہید کا سفید چہرہ تھا۔ وہ پرلیں کی
 وادی کی مخلوق لگ رہی تھی اس کی سیاہ درازا میں بھی ہوئی تھیں اور آنسوؤں کی لیکھیں اس کے زخموں پر چمک رہی تھیں۔
 اشکوں کے موتی اس کے گریبان پر ٹوٹ رہے تھے۔

”ناہید یہ فرید نے ابتر سے اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اٹھایا۔ ناہید نے اپنی آنسو بھری لمبی آنکھیں کھل کر
 دیکھا۔ اس کے ہنر وہ کر کا پ رہے تھے۔ اس کی آنسو بھری آنکھوں میں آنسوؤں کی کھجوریں تھیں۔ دکھ تھا مگر دلہنوں والی الجھاہٹ بھی نہیں کا فہم تھا۔

(باقی حصہ کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

سمندرِ حلال

سچی کھانسی

دینی عروج

۵۷

بات ہی ہوئی تو سرخ و سفید رنگت اور سیاہ بے بالوں والی نور بانو ہزاروں ہی سمجھ کے پنوں میں کھو گئی۔

”تینکا جلے کیسا ہو گا؟ مجھے پسند ہی کرے گا یا نہیں“ وہ چھوٹے سے آئینے میں ٹھنڈا اپنی صورت دیکھتی رہتی۔

آخر وہ دن بھی آگیا جب منشی ہاشم علی نے اپنی جمع شدہ پونجی سے نور بانو کے ہاتھ پیلے کر ڈالے۔ اور وہ ساری سکہیاں ماں باپ کو چھوڑ کر بہن بھائیوں سے جدا ہو کر عتیق کے گھر گئی۔

عتیق نے ایک نظر اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ بہت حسین تھی، عتیق پر جا دو سا ہو گیا۔ ڈھروں دن خوشیوں کے ہنڈولے میں چھوٹے پلک چھپکے بغیر ہی گور گئے۔

تب آجانبہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی اور عتیق بھی جیسے پرش میں آگیا تھا۔ اس کی ساری نرمی، ساری خوش خلقی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس نے اپنا لبادہ ایک دم ہی اتار پھینکا۔

بات بے بات گالیاں تو وہ پہلے ہی دیتا تھا۔ اب مودت پا کر اسے بلا جبر ہی روٹی کی طرح دھنک ڈالتا تھا۔ وہ اس کے قلم کے خلاف دہائی دیتی تھی۔ مگر سننے والا کون تھا۔ تینکے تھے کیا ہو گیا؟

وہ جبر سے آنکھیں پھیل کر پوچھتی تو وہ بڑی زہریلی ہنسی ہنستا پھر باہر نکل جاتا۔

”ابلی کہیں تینکا بھی ابا جیسا نہ بن جائے“

ان دنوں اسے ابا بڑی شدت سے یاد آنے لگا تھا۔

”کہیں میرے ساتھ بھی وہی نہ ہوئے گئے جو ماں کے ساتھ ہوتا تھا۔“

نور بانو نے خوفزدہ ہو کر صحن میں تیزی سے پھلتی ہوئی دھوپ کو دیکھا۔ پھر چھوٹے برتن کیٹ کے نل کے نیچے لے آئی۔ تب ہی صحن کے دروازے کو ٹی زخیر آہستہ سے نیچے گری اور اس کے دروازے کے رشتے کے چا کا بیٹا ذوق اندر آگیا۔

”ارے بیکے تم؟“ کب آئے؟ چاچا کیسی ہے؟“ نور بانو لڑکھ

منشی ہاشم علی کے پانچ بچے تھے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں، منشی جی کی بیوی بخت بانو بہت کم عمری ہی میں بیاہ کر منشی جی کے گھر آئی تھی۔ کم عمری کے باعث بخت بانو کی عادات میں ہنوز پچیدگیاں تھیں۔ جو منشی جی کی سخت گیر طبیعت کو سخت ناگوار گزرتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی بھی بخت بانو پر اعتبار نہ کر سکا۔ ہمیشہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ذرا ذرا سی بات پر روٹی کی طرح دھنک کے رکھ دیتا تھا بڑی اذیت ناک سزا دیتا تھا۔ اس کے دروں ہاتھ چارپائی کے پالوں تلے دے کے خود چارپائی پر بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے میں اس کی سب بڑی بڑی بیٹی نور بانو بڑی حیرت اور تاسف سے باپ کو لگا کر بیٹھ جاتی تھی۔ بیٹوں کے چہروں پر بھی حیرت پھیل رہی تھی، سب سے چھوٹی بیٹی گل نور تو بچپن ہی میں سہم گئی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ نور بانو سمیت باقی بچے بھی بچپن کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ عورت کی وجہ سے نور بانو اور گل نور بڑھ چکی تھیں منشی ہاشم علی کی محدود آمدنی میں کھانے پینے کا خرچہ ہی بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ وہ ان سب کو تعلیم کہاں سے دلانا۔ وقت حسب عادت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر سب کچھ وہی تھا کچھ بھی تو نہیں بدل تھا۔ وہی مٹی مٹی کا بڑا سا چولہا جس میں سرنا ہی دھوڑا دھوڑا پیلی پیلی آگ روشن ہو جایا کرتی تھی۔ پھر سارے جن بھائی چولہے کے ارد گرد بیٹھ کر چور دھکا سوکھا ملتا تھا۔ صبر کر کے کھا لیتے تھے۔ ہاشم علی کی سخت گیر مٹی کی وجہ سے سب سے پیچھے رہتے تھے۔ اور وہ ایک مول کے مقابل زندگی کی کاڑی کھینچ جلا جا رہا تھا۔ بخت بانو کی اب بھی شامت آتی تھی۔ اپنی دونوں ماں باجو نے نور بانو کے لئے ایک رشتہ بتایا۔ جسے ہاشم علی نے خلاف توقع نور ہی منظور کر لیا۔ عتیق کا ذاتی بان سگر مٹ کا کھوکھا تھا۔ ان سب کی نظر میں وہ خاصا کھانا تھا بیتا انسان تھا۔ پان سے سرخ ہونٹ نل میں چڑھے ہوئے گھنٹھ پلے بال۔ جن میں وہ بڑی محنت سے صبح و شام کھنکھی کرتا تھا۔ پہلی بوسکی کے کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس وہ بڑی نفاست سے پان لگایا کرتا تھا۔

میں سے ہوتے ہاتھ دھوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتی۔

”نیکا سکڑا دیا۔“

”نور آیا میں یہاں کسی کام سے آیا تھا۔ ماں نے کہا تھا تم سے بھی مل آؤں۔“

نیکا سادگی سے ساری تفصیل بتانے لگا۔

”تو بیٹھ نیکے میں تیرے لئے پانی بنانی ہوں۔“

”رہتے دے آیا۔“

”ارے پاگل تو پہلی دفعہ اپنی آپا کے گھر آیا ہے سو کھے منہ کیسے

واپس جانے دوں۔“

نور بازو ہنسی ہوئی رسوئی گھریں چلی گئی۔ اور نیکا اس کے پیٹے کے

ساتھ برآمدے میں بیٹھ کر پھینکے لگ گیا۔ وہ کسی بنا کر بڑا سا گلاس بھرائی

”لے نیکے۔“

اور اس کا دم صحن کا دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ اور عین انداز کیا

اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں لگتا تھا جیسے خون اتر آیا ہو۔

”سلام عینت بھائی۔“ نیکا بیچارہ گھرا کر کھڑا ہو گیا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے جواب تو نیکے کو دیا۔



مگر خوش آئندوں سے نور بانو کو اس طرح گھورا کہ وہ ہم گئی
تینکا اندر جا کر لیٹ گیا۔ رفیق تھوڑی دیر اور بٹھرا پھر واپس چلا گیا وہ
ڈرتے ڈرتے اندر آئی۔

”بہار می طبیعت تو ٹھیک ہے تیکے“ وہ نرمی ہوئی تیکے
کے پاس بیٹھی آئی۔

”تجھے مجھ سے کیا غرض میں جیوں یا مروتوں اپنے جانے والوں
کام بھرتی رہ“

”تیکے یہ نہیں تھا بالے چاچا کا بیٹا“

”کیوں اس مدت کہ چراغ مازی“

”یقین کر دیتے اسے چاچی نے بھیجا تھا“

”چاچی نے بھیجا تھا بانو نے خود بلایا تھا“

تینکا ایک جھٹکے سے اٹھا اور اسے چٹیا سے پکڑ کر مکتوں اور
لاٹوں کی بارش کر دی۔

”بہری بات تو سن تیکے“

وہ اپنی معافی میں بہت کچھ کہنا چاہی تھی۔ مگر تیکے نے طبیعت
ہی نہ دی۔ اسے ادھر موڑ کر کے وہ پھر باہر نکل گیا۔ زندگی پھر سرائی ڈگر
پر چلنے لگی تھی۔ تینکا باوجود کوشش کے دل میں پچھے شک کے ٹانگ کو
نکل نہ سکا۔ وقتاً فوقتاً اس ہجاری کو شک کے طعنے دیتا رہتا تھا۔

وہ چپ چاپ سستی رہتی تھی۔ اچانک گھر آجاتا۔ سارے گھر میں
یوں گھومتا پھرتا جیسے ابھی کسی کو پکڑے گا۔ کوئی بہت بڑا راز اس پر
عمیاں ہو چلے گا۔ مگر وہ کوئی عہدید پانے میں ناکام ہی رہا۔ ہاں ان
ہی چکر میں ایک بیٹی کا اور اضافہ ہو گیا۔

”مجھے بڑی نہیں بیٹا چاہیے تھا نور بانو“

”قدرت کے کاموں میں تو دل دے سکتا ہے تیکے“ اس
نے بار کر کے بسی سے ملکتی ہوئی کچی کوسینے سے لگا لیا۔

ایک دن عین گھر آیا تو اس پر نیا بھوت سوار تھا۔ ”نور بانو
یہ بھی میری نہیں ہے“

انتابڑا الزام نور بانو پر نہ سکی۔ شدت غم سے گھر کر رہنے
لگی۔ ”میری پاک دامن پر شک نہ کر تیکے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی
”یہ شوے مت بہا مجھے سب کچھ سچ بتا دے“ تینکا اس
وقت اسے شیطان نظر آ رہا تھا۔

”تیکے میں خدا اور اس سے رسول کی۔“

اسی دم تینکا آگے بڑھا اور حسب معمول اس پر گھوسول روکنوں
کی بارش شروع کر دی

”اس کے طوفانی تھپڑوں سے بچنے کی کوشش میں اس کا سر
کھڑکی سے ٹکرایا۔ اور خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس دم تیکے نے اس کے منہ

پر جو گھوسل مارا تو منہ سے بھی لال لال خون بہنے لگا۔ بیٹا ایک
کوڑے میں دبکا رہا تھا۔ چھوٹی بیٹی کے رونے سے عجیب صدمہ تھا۔

جب تینکا مار مار کر تھک گیا تو کالیاں بکتا باہر نکل گیا اس
کے جانے کے بعد وہ بڑی ہمت کر کے اٹھی۔ زخموں پر پٹی باندھی چند
جوڑے لئے ہمسائی سے کچھ روپے خد کے نام پر لے کر وہ انکسش آگئی۔

گاڑی چل پڑی تو اسے لال لگا جیسے وہ آزاد ہوئی ہو۔ ہر ہڈی
ٹوٹ گیا ہو، ہر رشتہ پھوٹ گیا ہو۔ سر کے زخموں میں کس سی اٹھی تو اسے
ہوش آ گیا۔ مال۔ باپ بہن بھائیوں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو
سبک پڑے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بولی بھی کیسے۔ شہید بخار میں بھیج
دی تھی۔ بڑے دنوں بعد حواس درست ہونے تو اس نے ساری کہانی
کہہ سنائی۔

منشی ہاشم علی چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ بار بار اس کی طرف
دیکھتی تھی۔ مگر وہ اسی طرح کسی سخت گیر حاکم کی طرح لب جھپٹے
جانے کی سوچ رہا تھا۔

”آپا تینکا بہت ظالم ہے میں وہاں نہیں جاؤں گی“

”ہوں“ کہہ کر ہاشم علی باہر نکل گیا۔

کسی کو نہیں بتے تھا کہ اس نے کیا سوچا ہے۔ اور اس دن
وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو کپڑے بدلوا رہی تھی کہ اچانک آبا اندر
داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی عینت کو دیکھ کر وہ مارے رشت
کے چیخ پڑی۔

”یہ یہاں کیوں آیا ہے اب اسے واپس بھیج دو“

یہ واپس نہیں جانے گا اسے میں نے بلایا ہے۔“

”کیوں اب کیوں؟ سب کے دلوں میں یہ سوال چل رہا تھا مگر
لب خاموش تھے۔

”من لوری ہم نے تجھے تیکے کے ساتھ بیٹا تھا تیرا مرنہ جینا

اسی کے ساتھ ہے جھلے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو“

آبا کا فیصلہ سن کر وہ تڑپ تڑپ کر روئی۔

”نہیں اب یہ بہت ظالم ہے“ اسے تیکے اور ابیوں کوئی فرق نظر
نہیں آ رہا تھا۔

تب ہی اس کی ننھی سی بچی رو پڑی۔ وہ اسے بہانے کی خاطر باہر
لائی۔ پھر جانے کی سوچ کر اس نے اسے گل زور کو دیا اور خود دروازہ کھلی
کر باہر نکل گئی وہ سڑک پر لے تماشہ بھگا گل جارہی تھی۔ ادھر ادھر
کی کچھ جڑنہ تھی دوپٹا اڑا جا رہا تھا۔ پاؤں میں جوتا سجھا رہا تھا۔

”میں تیکے کے ساتھ نہ جاؤں گی۔“ ایک بات ذہن میں تھی
جو اسے آدھی طوفان کی طرح اڑائے لئے جارہی تھی۔ مگر وہی تو پہلے
بی بہت تھی۔ مارے پیاس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے سامنے

ایک گھم کا دروازہ کھلا نظر آیا تو بھاگ کر اندر جا گھسی سائے ہی کوئی عورت ڈوڑھی میں بیٹھی گندم صاف کر رہی تھی۔

”کون ہے؟“ اس نے قریب آکر نور بانو کو تھما لیا۔

”پانی۔ ماں۔ پانی دے دو“ اس نے جیسے بھاگ کر آئی۔

اس عورت سے نور بانو سنبھالی نہ گئی۔ تو اس نے اپنے بیٹے کو لپکا لیا۔

”کیا بات ہے ماں؟“ جیسا بھاگ کر آ گیا۔

”کون ہے یہ؟“

”جانے کون دکھیا ہے تو پانی تو لایا بیٹے“ پانی بڑی کر وہ کچھ سنبھلی

تو ادھر ادھر دیکھا۔

”میں دہاں نہیں جاؤں گی ماں وہ پھر مجھے اس کے ساتھ بھیج

دیں گے“

وہ ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔

”بیٹی تو دھنگ سے کوئی بات بتائے تو میں سمجھوں بھی“

نور عورت نے حجت سے پوچھا، تو اس نے ساری کہانی بولا۔

کم و کاست کہہ سنائی۔ حجب نے بڑی ہمدردی سے اس کا دلے لیے

ہالوں اور زرد رنگت والی دھول کی ماری ہوتی عورت کو دیکھ رہا تھا۔

”ماں تم مجھے نہیں رکھ لو میں دہاں نہیں جاؤں گی“ وہ مسلسل

روئے جا رہی تھی۔

”تم روؤ نہیں اللہ بہتر کرے گا“ حجب نے اسے بڑی ہمدردی

سے دیکھا۔

رات کو انہوں نے اسے کھانا کھلایا۔ ہمدردی کے ہزاروں

ہی بول کہے۔ وہ کی حد تک سہل گئی تھی۔

مگر شام گہری ہوتے ہی حجب کی ماں نے اسے بھی چادر

اور ڈھنکے کو دی اور خود بھی بڑی سی چادر کی نکل ماری۔ حجب لائیں

تھکے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو ماں؟“

”کہاں رہے گھر“

”رہیں“ وہ صحیح بڑی۔ تب حجب آگے بڑھ آیا۔

”دیکھو تم بول گھر سے بھاگو گی تو کس عورت نہیں ملے گی کہہنا کہ

ماں باپ بہن بھائی سب ناراض ہو جائیں گے۔“

”مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔“

”بڑی بات ایسے نہیں کہتے“

حجب کے ان بولوں میں جانے کیا سمجھ تھا۔ وہ چپ چاپ

گھر جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

”کہاں چلی گئی ہے عزت باپ کی عزت کا بھی نہ سوچا تو نے“

منشی ہاشم علی نے اس پر مٹکوں اور پتھر طوں کی بارش کر دی تھی۔

”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ماں“ وہ چیخ چیخ کر دہائی دیتی رہی۔

”یہ دیکھ نصیبوں جلی عقیق نے تجھے طلاق دے دی ہے۔“

ماں کے اس جملے اور تاثر توڑ دہنڑوں نے اسے ہنپاگل

سا کر دیا تھا۔

وہ بوڑا کر گری تو کسی دنوں تک گرد و پیش کا ہوش نہ رہا ہوش

میں آئی تو برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ ابا تو اس کی صورت دیکھنے کا

بھی روادار نہ رہا تھا۔ بھائی چھوٹے تھے مگر ان کی آنکھوں میں بھی بچے

ہمدردی کے نفرت کے کوئٹے لپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ گل نور

اکھی کی حد تک سمجھتی تھی۔ مگر اتنا احساس تو اسے بھی تھا کہ کوئی بات

ایسی ضرور ہوتی ہے۔ جو نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ گھر کی فضا پہلے کون سی

بہت خوش گوار تھی اس حادثے کے بعد مزید ناگوار آگئی تھی۔

ماں جوان بیٹی کو دیکھ کر لرزتی تھی جو دو بچوں کی ماں ہونے

کے باوجود آج بھی دیہی بچے کی معصوم نظر آتی تھی۔ اب کیا ہو گا کھانا

میں دو لغوس کا، مزید افسانہ ہو گیا تھا منشی ہاشم علی بھی سمجھا تھا اتنی

غریب نہ ہوتی تو وہ شاید اس کے بچوں کے آنے کا اتنا برا نہیں مانتا

مگر اب تو صورت حال ہی مختلف تھی۔

”ارے لگوڑی کوئی کام کاج ہی سیکھ لے ماں بھی اسے ڈھیر

کوسنے دیتی تھی۔“

اس نے چپ چاپ لغاتے بنا کر سچے شروع کر دیئے زندگی

میں تھوڑی بہت آسانی آگئی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے لغاتے بناتی

تھی کہ زندگی میں ایک بار پھر طوفان آگیا جیسی کی ماں کی اچانک آمد

سے وہ بکھلا گئی۔

”بھائی ہاشم علی ہمیں تمہاری بیٹی ہر حال میں منظور ہے۔“

”مگر نہیں۔ ا“

”اگر مگر کچھ نہیں ہمیں نہ جہیز چاہیے نہ ذات پات سے غرض ہے“

جیسا تو اس کے دونوں پہلے بچوں کو بھی رکھنے پر راضی ہے۔“

پہلے تو ہاشم علی نے بڑی سختی سے انکار کرنا چاہا پھر حالے کیا سوچ

کرزم پڑ گئی

”دیکھو میں ہی نہیں چاہتا کہ اس کے بچوں سے باپ تو چھن ہی

چکا ہے اب ماں بھی چھن جائے۔“

”خدا نہ کرے ماں کیوں چھنے گی؟“

پھر حالے کیا ہوا کیسے آنا نا چاہیہ اپنے دو بچوں اور دو

بڑے بھائیوں سمیت آیا۔ وہ جیسی بیٹھی تھی۔ ویسے ہی لکاح کے بعد

اٹھ کر اس کے ساتھ چلی

دونوں بچوں کو اس کی ماں نے روک لیا تھا جیسا لاکھوں

میں ایک تھا۔ نرم خو، خوش خلق، منساہ دھیبے بچے میں بائیں کرتے والا اتنا منکر المزاج کہ اسے اپنے پیسوں پر رشک آئے لگتا تھا۔
 ”بیسے مجھے اپنے بچے یاد آ رہے ہیں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے کہتی
 تو وہ ہنس پڑتا
 ”ارے تو جیوناں سے مل آئیں بلکہ یہاں ہی لے آئیں تو
 کیسا رہے؟“

”ہیں بیسے“
 وہ سختی سے منع کر دیتی
 ”اچھا یوں کرتے ہیں میں ان کا خرچہ ہا کو دے دیا کروں گا
 اب یہ میری ذمہ داری بھی ہے اور زلف کا لٹاؤ بھی“
 ”بیسے تم انسان نہیں فرشتہ ہو،“ وہ ٹھکرا کر منظر روں سے
 حبیب کی طرف دیکھتی۔
 تو وہ ہنس پڑتا منشی ہاشم علی کو دروڑوں بچوں کے بہانے
 ایک معقول رسم ملنے لگی تھی۔ اسے بھی اب ان کا وجود برانہ لگتا تھا
 بڑا بیٹا سکل جانے لگا تھا۔ زندگی میں بڑی سہولت آگئی تھی۔ حبیب
 نے نور بانو کو اتنا پیار دیا تھا۔ اتنا چاہا تھا کہ وہ گزشتہ زندگی کے
 تمام دکھ بھلائی بھی تھی۔ اور جس دن اس نے حبیب کے بیٹے حاجی
 کو جنم دیا حبیب ماہے مسرتوں کے تجویم اٹھا۔ وہ اسے اتنا خوش دیکھ
 کر خود بھی مسکرا پڑا

نور بانو کا چھوٹا بھائی عبدالرؤف دہلا پتلا بچے قد کا انسان
 جس نے نور بانو کی طرح عزت میں آنکھ کھولی پڑھنے کا شوق تھا
 کسی نہ کسی طرح یہ بڑا اچھے نمبروں میں پاس کر گیا اور ایک بہت بڑے
 جہز اسٹور پریسیلر میں کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔
 محنت اور ایمانداری کے بل پر اس نے خاصا مقام حاصل کر
 لیا تو ماں بہنوں کو اس کی شادی کا شوق چرایا۔

”روئے بھائی اب ہم تمہاری دہن لائیں گے، گل تو خوش
 ہو کہ ہمتی تو روز فارغ شرمہا جاتا۔
 پھر ایک لڑکی آسیدہ اب کو بری طرح بھاگتی۔ سانولی
 سی تنکھے نقوش والی لڑکی بہ رونا بھی فدا ہو گیا۔ شادی ہو گئی تو گھر
 میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ادھر گل تو کبھی اب جوان تھی۔ اتفاق سے کسی میڈیکل
 پریکٹیشنر نے ان کے محلے میں آکر درکار کھولی تھی گل نور کو وہ ڈاکٹر
 اچھا لگنے لگا۔ روز اندہ ہی اس کے سر میں درد ہو جاتا تھا کبھی بھوک
 پیاس مٹ جاتی۔ تب وہ نور بانو کے کسی بچے کی انگلی تھام کر ڈاکٹر کے
 یہاں چل دیتی قسمت اچھی تھی یا پھر محنت بانو نے جان بوجھ کر نوٹس
 نہیں لیا، بہر حال وقت گزرتا رہا۔

عبدالرؤف بھی اپنے باپ کی طرح بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے کام
 کرتا رہا۔ وہ درکار سے کھد کا ہار لگھ آتا تو بیوی کی ہزاروں شکایتیں
 ماں سناتی۔ بیوی کو ان سب سے ڈھیروں گلے ہوتے تھے۔ وہ چپ
 چاپ دروڑوں طرف کی سنتا اور منہ سر پیٹ کر بڑھ جاتا۔ لیکن اس دن
 تو سارا معاملہ حد سے گزر گیا۔
 جب اس کی ماں نے بتایا کہ آسیدہ کسی سے چھپ چھپ کر ملتی
 ہے۔

”وہ تم سے دنیا ہر گز نہ کرے گی“
 ”میں آسیدہ کو جہاں سے مار ڈالوں گا گاں“
 اس دن بچے شخص میں ہلاکتی تیزی آگئی تھی۔ اپنی دونوں آسیدہ
 کے ہاں روئے کے بیٹے نے جنم لیا تو سارا معاملہ دب گیا۔ رونا ایک بار
 پھر سب کچھ بھول بھال گیا۔ مگر آسیدہ کو اب بھی اپنی کھی کا وہ خوبصورت
 سا لڑکا یاد آتا تھا جس سے اس نے ہزاروں ہی پیمان باندھے
 تھے۔ قصیں کھا بیٹھیں۔ وہ عبدالرؤف کی ہو کر بھی اس کی نہ سختی
 بیٹے کی پیدائش کی وجہ سے وہ کئی دنوں تک اس سے مل نہ سکی
 مگر اس دن تو وہ بچہ جین سی ہو گئی تھی سارے ہنسن ساری رسمیں بھول
 کے وہ اس سے ملنے چل دی۔ اسی دن روئے کو جانے لیا کامیاب یاد آیا کہ
 اچانک گھر آگیا۔

”آسیدہ کہاں ہے ماں“
 ”گئی ہوگی وہیں جہاں وہ جایا کرتی ہے،“ ماں کے گلے کٹے
 انداز اور بچے نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔
 وہ چپ چاپ کرے میں گھس کر اس کا انتظار کرنے لگا شام
 ڈھلے وہ واپس آئی منشی ہاشم علی بھی واپس آچکا تھا۔
 ”اس سے پوچھو اب یہ کہاں گئی تھی؟“
 روئے کی آنکھوں میں خون آ رہا ہوا تھا۔
 آسیدہ ہم گئی رنگ زرد ہو گیا۔

”میں مجھ جیسی عورت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا میں تجھے
 طلاق دیتا ہوں“ ماہے غم وقفہ کے عبدالرؤف کی آواز پھٹ
 گئی تھی۔

وہ تیز بزدل اٹھا تا دروازے کی طرف بڑھا پھر رک گیا۔
 میرا بچہ دے جانا خود جہاں دل چاہے چلی جانا۔“
 عبدالرؤف نے اپنا دوسرا اور آخری فیصلہ سنایا۔ اور گھر سے
 باہر نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کوئی سمجھ بھی نہ سکا۔ بل میں
 سارے ناتے ٹوٹ گئے تھے۔ آسیدہ کی آنکھوں میں رحم کی اپیل جیسے جم
 کر رہ گئی تھی۔ وہ بار بار منشی ہاشم علی کی طرف دیکھتی تھی۔ آخری بار اس نے
 ایسا بچہ دیکھنا چاہا تو سخت گیر منشی ہاشم علی بیچ میں آگیا۔

”جاؤ ہمارا تم سے کوئی ناتہ نہیں“

اس کے اس جملے میں بڑی تعلیق تھی۔ آسیر شکستہ قدروں کے باہر نکل گئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہاں آکر رونے کی داستان ختم ہو جاتی۔ لیکن اچھی ان میں جیب موجود تھا۔ جو ان کے کسی کام آنا پکڑا نہیں لے سکتا تھا۔

”نوری یہ رونو بڑا چپ چاپ رہتا ہے۔“

”اگر جو اجڑ گیا ہے بچاؤ کا“ نور یا زکھر سے کہتی۔

”ایک بات سمجھ میں آتی ہے نوری رونے کا گھر پھر نہ بسا دیا جائے۔“

”کیسے؟“

”کیسے کبھی جیسے گھر بے ہیں اور بس۔“

”کوئی ترکی ہے نظر میں؟“

”ہاں چھوٹے چاچا کی بیٹی ٹکڑی کھسکی رہے گی۔“ چھوٹے چاچا

دے دیں گے۔“

”یہ تم بھر پر چھوڑ دو“ جیب نے بڑے یقین سے کہا۔

اور پھر یہ جیب کی پر خلوص کاوشوں کا ہی نتیجہ تھا جو عبدالرزاق کو ایک نیک اور اطاعت گزار لڑکی ملی۔ اور اس کا گھر پھر بس کی حقیقت تھی اس طرح ایک بار لڑکھڑاس کا گھر بس گیا۔ مگر آپ گل فوراً لپٹنا نہیں جھڑپوں کے گل نور کم عمر تھی حسین تھی۔ ڈاکٹر کے یہاں بیمار بن کے جاتی رہی اور خود ڈاکٹر کو بیمار کر ڈالا۔

”ڈاکٹر تم سے کوہت جتن کرنے پڑتے ہیں“

”بہت جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔“ وہ اکثر ہی ڈاکٹر کو احساس

دلاتی۔ جو بار بار ڈاکٹر منس پڑتا تھا۔

”رنگ تم یقین رکھو میں ایک نہ ایک دن ضرور تمہیں اپنا ڈاکٹر کا تم سے ونا کرنا میرا ایمان ہے۔“

ڈاکٹر کی باتیں سن کر اس پر حسرت ہوتا جاتا۔ وہ مدد بخش ہی کھڑی کھڑی گھر آ کر کبھی ڈاکٹر کے سینے میں رہتی یہ بیمار کا کھیل چلتا ہی رہتا اگر گل نور کے گھر والوں کو خبر نہ ہو جاتی۔

ہاشم علی کو خبر ہوئی تو اس نے گل نور کو روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیا۔

”بول بول۔ بول۔ بول۔ اس ذلیل انسان سے جس نے تجھے بے خبری کی بات دیا بول۔ بول۔ بول۔“ ہاشم علی دیوانہ ہو چکا تھا اس کی کڑواہٹ تھی۔

گل نور کو تو وہ ابھی تک سمجھ ہوئے تھے۔ مگر اب احساس ہوا تھا کہ گل نور بھی جو ان ہو چکی تھی۔ اس کا ٹھکانہ ڈھونڈنا بھی ضروری تھا۔ گل نور یہ سنستے باندھی گئی تھی۔ ڈاکٹر سے ملنے پر باندھی گئی تو وہ بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر اور اس کے صدمے یاد کے اسے خون

کے آنسو رلاتے تھے۔

”کب آؤ گے ڈاکٹر اب تو آ جاؤ۔“

وہ تھک کر ڈاکٹر کے آجانے کی دعا میں مانگتی تھی مگر ڈاکٹر کو اس کی بے قراریوں کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ تو اس نے نور بانو کے کسی بچے کے ہاتھ اسے پیغام بھیجا کہ تمہاری دیناٹل رہی ہے انکے سینھاؤ، ڈاکٹر بھی اس کی محبتوں کا مارا تھا۔ کچھ سوچے کچھ بنا خود ہی رشتہ مانگنے چلا آیا۔ ہاشم علی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

”رنا ناخارا نالائق، بد معاش تجھے ہماری دہلیز پر آنے کی جرات کیسے ہوئی“

منشی جی میں کوئی ڈاکہ ڈالنے نہیں آیا سمجھے۔ آپ مجھے صرف گل نور چاہیئے۔“

ڈاکٹر کی اس ہٹ دھرمی نے منشی ہاشم علی کے اندر آگ سی بھردی۔

”دفع ہو جاؤ پھر کبھی لوٹ کے نہ آنا“

”میں ایک نہ ایک دن گل نور کو اپنا کے دکھاؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔“ ڈاکٹر چلا گیا اور اندر گل نور سے سکس کر رہ پڑی۔

”ماں آ کر ڈاکٹر میں کیا برائی ہے؟“

”اپنے باپ سے بوجھ“ بخت بانو کا جواب بڑا حوصلہ شکن ہوتا تھا۔

وہ دیواروں سے ٹکرائی تھی۔ فریاد کرتی تھی، دہائی پتی تھی۔ مگر سب لوگ پتھر کے ہو چکے تھے۔ ”بخت بانو، ہاشم علی کی آواز پر روئی کا پتھر بخت بانو باہر نکل گئی۔

”سن برسوں ارشاد بیگم بارات لے کر رہا ہے۔ بارات کیا ہوگی بس چند لوگ منجے میں نے دعوت دھڑکے کو منع کر دیا ہے اور

باں ابی بیٹی کو سمجھائے زیادہ دوا دلایا تو مجھ سے پر کوئی نہیں ہوگا“ ہاشم علی کی آواز میں کیسا حکم تھا اندھ مڑی گل نور کا گپ گپ۔ بارود نہ چاہتے اسے دہن انکے ارشاد بیگم کے سنگ بھیج دیا گیا۔ رخصتی کے وقت وہ یوں ٹوٹ کر روئی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ اھر ڈاکٹر کو جیسے سانپ سو گھم گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے گل نور کسی اور کی ہو کر چلی گئی۔ اور وہ کچھ دیر نہ کر سکا۔ ایسا بے حس ہو گیا تھا کہ جیسے اسے پتھر میں ہو کر گل نور ہی کا بہا ہو رہا ہے۔

روئی تڑپتی، ہسکتی ہوئی گل نور ارشاد بیگم کے گھر پہنچی تو بیٹی عمر کے لمبے چہرے والے ارشاد کو دیکھ کر اسے وہ ڈاکٹر یاد آیا جو ہر لحاظ سے نکل تھا۔ ارشاد بہت ظالم تھا۔ گل نور کم عمر تھی حسین تھی اور ارشاد کے دل میں بیلے ہی دن بے اعتباری نے گھر لیا تھا وہ اس سے خائف رہنے لگا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنی دکان بچ دی۔

”اب ہم کہاں جائیں گے ارشاد“؟ ”دوسرے شہر“
 ارشاد کا جواب سن کر وہ بے قرار سی ہو گئی تو ڈاکٹر مجھ سے بھرا
 پیشہ بھی تھیں جانے کا وہ آرزو ہی ہو کر چھوٹا موٹا سامان باندھنے
 لگی۔ دوسرے شہر کے زندگی بھر اس پرانی ڈاکٹر چل بڑی جلد ہی گزور
 ارشاد کے بیٹے کی مال بن گئی۔ اس دیکھ کر وہ تنہا اپنے گھر میں مصروف
 تھی کہ ایک شہتہ حال عورت ایک چھ سات سال کے بچے کو کھانے
 اندر چلی آئی۔

”بہت دن سے بھوکے ہیں بی بی کچھ کھانے کو دے دو“
 گل نور کو ان دونوں پر بے تحاشہ ترس آیا۔ اس نے انہیں
 اندر بلا لیا۔ اس عورت کی زبان صاف نہ تھی۔ اردو روانی سے نہ
 بول سکتی تھی پھر بھی مطلب سمجھا رہی تھی اس کی داستان کا لب
 لباب یہی تھا کہ وہ سندھ کی رہنے والی تھی۔ کسی پنجابی نوجوان
 ارشاد سے اس نے بیاہ رجا بیاہ پھر اسے چھوڑ کر بھاگ
 آیا۔ اب وہ بیچاری اس کی تلاش میں سندھ سے آ کر
 پنجاب کی گلیوں کی خاک چھانتی پھر رہی تھی۔
 ”ہن تم آئے کہاں کہاں تلاش کرو گی؟“ اُسے اٹھتے
 دیکھ کر گل نور نے ہمدردی سے کہا۔

”خدا بڑا انصاف والا ہے بی بی ارشاد کہیں نہ کہیں تو
 ملے ہی گا“

وہ عورت کھانا کھا کر اپنے چھ سالہ بچے کا ہاتھ تھام کر باہر
 نکل گئی۔

”کوئی آیا تو نہیں تھا؟“ ارشاد نے گھر آ کر حسب عادت
 بڑے مشکوک انداز میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”ایک دکھیا عورت آئی تھی، بیچاری اپنے شوہر کو ڈھونڈتی
 پھر رہی تھی۔“

”کہاں گیا اس کا شوہر؟“

”اندھ جانے بیچاری سندھ سے پنجاب تک کسی ساتھ میں چھوڑا کا بیٹھی تھا“

”تو نے اس سے کیا کیا باتیں کیں؟“

”کچھ بھی نہیں بس کھانا کھا دیا تھا“

”زادہ کسی سے ملے کی ضرورت نہیں۔“ ارشاد غراہم

وہ سمجھ کے اس کے لئے چچائیاں تو بے پروا لے گئی۔

چل گل نور تیار ہو جا۔“

کہاں جانا ہے؟“ اس شہر سے کہیں بہت دور۔

”یہاں کیا ہے؟“

”بحث مت کر دو“ اور ارشاد اسے فوراً ہی واپس وہیں
 لے آیا جہاں سے لے گیا تھا۔ اپنے شہر میں گھسے ہی گل نور ڈاکٹر

شدت سے باد آگیا، جسے اس نے پہلی پہلی بار بڑی شدت سے
 چاہا تھا۔ مگر اس کی نہ ہوسکی تھی۔ ارشاد کا روبرو جمانے کے بعد وہ
 میں سے دسام بری طرح مصروف تھا گھرا آئے ہی اس کا پہلا کول
 ہی ہوتا تھا۔

”کوئی آیا تو نہیں تھا وہ عورت کچھ دانی پھر تو نہیں آئی“

”نہیں جی کوئی بھی نہیں آیا“ اس کا بھی جواب ہوتا تھا

مگر ارشاد مراد بی بی سے بہت خوفزدہ تھا جسے دو سال پہلے وہ

سندھ ہی میں چھوڑ کر پنجاب بھاگ آیا تھا۔ اور اب وہ اس کے

پچھے پنجاب بلدا اس کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے وہ شہر چھوڑ دیا

تھا۔ مگر اب بھی خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔

اس دن گل نور نے ارشاد سے صبح ہی اجازت لے لی تھی

مال کے گھر چلنے کی۔ ادھر ارشاد اپنے کام پہ لگا۔ اور ادھر وہ

اپنے بیٹے کو گود میں لے مال کے گھر آگئی۔ راہ میں ڈاکٹر کی دوکان

نظر آئی تو میں میں ہو گئی تھی۔ قدم سن سن بھر کے ہو گئے۔

”ڈاکٹر تمہاری صورت دیکھتے بھی کتنے جگ بیت گئے۔“

اس نے آہ بھر کر دوکان کی طرف دیکھا۔ تب ہی ڈاکٹر

بھی کسی کام سے باہر نکل آیا۔ اسے یوں سمجھی تھی کہ کھڑے دیکھا تو

پاس چلا آیا۔

”نگل“، ڈاکٹر اس اداس سی پریشان سی گل نور کے قہقہے

چلا آیا۔ اس سے ایک لفظ بھی نہیں بولا جا رہا تھا۔

بس گھبراہٹ گھرائی نظروں سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف

دیکھ جا رہی تھی۔ جیسے سارے جنوں کی پیاس آج ہی بجھا لینا

چاہتی ہو۔

”گل آزاد“، ڈاکٹر کے اس جملے میں بڑا سحر تھا مٹھاس

تھی۔ اردو دوندت سے میٹھے بولوں کو ترس رہی تھی چپ چاپ

ڈاکٹر کی چاہت کے بندھنوں میں بندھی پچھے پچھے چل پڑی۔ اتفاق

سے دوکان خالی تھی۔ وہ اپنی مخصوص سی بچ پر بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر اپنی بیزر

پر جا بیٹھا جسے اس کا گل نور سے سوئے مریض کے کوئی رشتہ نہ ہو۔

”تم خوش ہو گل نور؟“ یہ پوچھتے پوچھتے ڈاکٹر کی آنکھیں

آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

”رو خوش رہنا انے بس میں نہیں ہوتا ڈاکٹر۔“

گل نور کی آواز بھئی بھرائی تھی۔ ڈاکٹر کے آنسوؤں نے اسے

صر سے زیادہ متاثر کر دیا تھا۔

”ارشاد علی کیسا ہے؟“

”بہت ظالم، شک بہت کرتا ہے“ گل نور با قاعده رونے

”تمہیں کہاں لے گیا تھا۔“

”بہت دور۔“

”آج کل کہاں ہوتی ہو؟“

”اسی شہر میں آئی ہوں۔“

”میں نہیں بھلا نہیں سکا گل،“ ڈاکٹر ایک ٹک اس کے کپڑے کو دیکھ جا رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر پرانی باتیں دہرا رہا تھا۔ گل نور بونچیا سکی۔ اسے بھی وہ دن شدت سے یاد آ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا۔ سارے بھندھن توڑ کے ساری رستیں بھلا کے بس نہیں رہ گئے۔ ڈاکٹر کو دیکھتے دیکھتے عمر بیت جاتے۔ اس لمحے اپنے اٹھارہ سالہ بچہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ جو دھیرے دھیرے چلتا ہوا ڈاکٹر کی میز کے پاس پکڑ کر میز پر پڑی ایک دوشیزا بن گیا تھا۔ وہ دونوں دم بخود دیکھ رہے تھے۔ تب ہی بچے نے کوئی شیشی نیچے گرا دی چھنک سا ہوا اور دونوں ہوش و حواس کی دنیا میں پلٹ آئے۔

”اچھا ڈاکٹر اب میں جاتی ہوں۔“

”بھوک بھوک کی؟“ ڈاکٹر کے انداز میں بے پناہ نے قریبی تھی۔

”جب کبھی ماں کے گھر آتا ہوا تم سے کبھی ملنے آؤں گی ڈاکٹر جی۔“

ڈاکٹر سے مل کے وہ ایک بار پھر پھوڑی سی شوخ ہو گئی تھی۔

اپنے اسی پرانے انداز میں اس نے ڈاکٹر جی کہا تو ڈاکٹر بھی منس پڑا۔

”بلو کے ابا میں ماں کی طرف جلی جاؤں؟“ تب ہی ارشاد۔

چونک سا گیا۔

”روز روز وہاں کیا لینے جاتی ہے بد بخت۔“

”ماں سے ملنے کو جی چاہتا ہے ارشاد۔“

”ماں سے یا اپنے کسی پرانے۔“ بات ادھوری

چھوڑ کر ارشاد نے بڑی مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔ وہ حسب عادت سہم کر چپ ہو گئی۔

”راجا چلی جا۔“ ارشاد نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر جانے کیا سوچ کر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے من میں ڈھیروں کیفیاں

ایک ساتھ کھل اٹھیں۔ سارے جہیز پر سسکا ہٹ پھیل گئی ارشاد کے جانے کے بعد اس نے گھر کا تمام کام کیا۔

ایک مدت کے بعد خود کو سناڑا۔ اور کشاں کشاں ڈاکٹر سے ملنے

جانبی۔ دونوں ایک بار پھر اپنی باتوں میں ادرا دواں میں کھو گئے۔

نت گزرنے کا احساس ہی جانتا رہا۔

بلو مارے سبھوک کے رو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ملتی رہنا گل،“ ڈاکٹر ہمیشہ یہی التجا کرتا تھا اور وہ دھیرے

بٹھتی تھی۔ ادھر ارشاد کے ذہن میں شک کا ناگ ایک بار پھر بڑی ثابت قدمی سے سر اٹھا رہا تھا۔ وہ دوکان سے سیدھا اپنی سکر کے گھر چلا آیا۔ سامنے ہی گل بیٹی جلدی جلدی تو ہے پر روٹیاں ڈال رہی تھی۔ وہ دل میں ملن سا ہو گیا۔

تو یہاں روٹیاں پکانے آئی تھی۔؟“ ساس کی نظر بچا کر اس نے اسے گھورا۔

”ماں کی طبیعت خراب تھی میں نے سو جا روٹیاں پکا دیں

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ ارشاد نے لا پرواہی سے کہا

اور بلو کو دیریں اٹھالیا۔ مست اچھی تھی۔ جو گل نور صاف بچ گئی۔

جلدی جلدی روٹیاں پکانی ہوئی وہ یوں لگ رہی تھی جیسے صدیوں

سے یہاں ہی بیٹھی ہو۔ ارشاد کو دھوکہ دینے میں وہ بڑی مہارت

سے کامیاب ہو گئی تھی۔ گل نے دھڑکتے ہوئے دل کو بہ مشکل سنبھالا

اور ارشاد کے ساتھ کھڑی۔

بلو تین سال کا ہوا تو گوا گیا۔ اس کی شادی کو پورے

پانچ سال ہو چکے تھے۔ مگر ڈاکٹر سے آج بھی دیسی ہی شدید محبت

تھی۔ وہ برابر اس سے ملتی تھی۔ ارشاد کی آنکھوں میں صاف صاف

دھول جھونک جا رہا تھا۔ وہ اتنا شکی مزاج انسان جانے یوں جلدی

سمجھ نہ سکا۔

مگر ایک بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ اس دن ارشاد نے اس پر

بکوں لاتوں اور مغلفات کی بارش کر دی۔ وہ وحشی دیوانہ ہو چکا تھا،

لگتا تھا وہ گل کو زکوٰۃ نہیں چھوڑے گا۔ وہ روتی جا رہی تھی۔ مگر

اس پر رزہ بھرا اثر نہ تھا۔

”خبردار بد ذات اب اگر تو نے ماں کے گھر جانے کا نام لیا

تو زندہ گاڑ دوں گا۔ وہ باہر چلا گیا تو وہ پھر رونے بیٹھ گئی۔“

محبت کا علم بھی کتنا عجیب ہوتا ہے نڈل سے جلتے نہ کی

پر ناپا کر پاتے۔ وہ گھنٹوں روتی رہی۔ شام کو ارشاد گھر آیا تو گل

نور کی روتی روتی صورت زرد رنگت دیکھ کر وہ ایک بار پھر کپکپے سے

باہر ہو گیا۔

”میں اس ذلیل ڈاکٹر کو قتل کر دوں گا۔“

اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی۔ جس نے گل نور

کو ہلاک رکھ دیا۔ وہ ہم کر چپ ہو گئی۔

”مجھے یقین ہے گل، یہ گویہ نہیں ہے۔“

”خدا سے ڈر ارشاد۔“ وہ سچ بڑی۔

اس نے محبت ضرور کی تھی مگر یہ جیہ نہیں تھی۔ اس نے

ارشاد کی عورت پر حریفی نہیں آنے دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ڈاکٹر

سے ملتی رہی تھی۔ بلو اس کو جانے لگا تھا اور ارشاد کے گھر میں

ایک بیٹی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نے ارشاد کی یا بندہ لوں کو قبول کر لیا تھا۔ اپنے سارے جذبے مارے تھے۔ ڈاکٹر سے مننے کی آرزوؤں کا گاکھوٹ دیا تھا۔ اس کی یادوں پر ہر سیکے بٹھا دیتے تھے۔ وہ اب ایک مکمل دفا دہوڑی بن جانا چاہتی تھی۔ مگر ارشاد بھی سچا شخص نہ بن سکا اس کی فطرت میں شک بہت تھا۔ وہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔ مکان بدلتا رہتا تھا محلہ بدلتا رہتا تھا۔ شہر نہیں بدل سکتا تھا۔ کہ اب اس کا کاروبار بہت اچھی طرح چم گیا تھا۔

دن رات اسی تیز رفتاری سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ گھر اور بچوں میں بڑ کر کسی حد تک بھل گئی تھی۔

مال کے گھر بھی بہت کم جاتی تھی کبھی جاتی بھی تو ارشاد ساتھ ہوتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی دوکان کے سامنے سے منہ پھیر کے گزر جاتی تھی۔ مگر ارشاد خود ان نظروں سے ڈاکٹر کی دوکان کو کھو رہا ہی رہتا تھا۔ تب اس دن اسے اپنے چھوٹے بھائی عبدالحی سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے اپنا گھر بسایا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ حق سے بہت سی باتیں پوچھے۔ مگر وہ تو سرسری سے انداز میں بات کر کے باہر نکل گیا تھا۔ اندر آئے وہ رات کو کسی بات کے بنہا ہی روئی رہی روئی ہی رہی تھی۔ پھر جیسے اسے میر لگیا۔

”اچھا کیا تم نے بھی گھر بسایا ڈاکٹر؟“ خربک تم نے میرا ارشاد کر لے۔ ایسا اشتغال جس کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ پتھوڑے عرصے بعد اس نے ارشاد کی بیٹی کو جنم دیا ارشاد مسکرا پڑا۔

”مجھے لڑکی کی بہت آرزو تھی گل“

”تمہاری آس خدائے پوری کر دی۔“ ذرد ذرد بیمار سی گل نے پکلیں بوندیں۔ چند دن ارشاد کا موڈ درست رہا پھر وہ اپنی پہلی وانی روش پر لوٹ آیا۔ وہی گالی گلوچ، مار دھا، مغلظات کی باتیں۔ گل بھی جیسے اکت گئی تھی۔ اس روش سے ٹھک گئی تھی۔ تنگ ہو گئی تھی۔ اور اس دن وہ تینوں بچوں کو ساتھ لے کر مال کی طرف آگئی۔ پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریر میں اس نے ڈاکٹر کو خط لکھا۔

”یہ لکھنا بھی اسے ڈاکٹر نے ہی سکھایا تھا۔ اور وہ بڑے شوق سے یہ لکھ رہی تھی۔ پتھوڑا بہت بڑھ چکی تھی۔ مطلب کی بات سمجھا لیتی تھی۔ اب بھی اس نے بڑی کوشش سے ایک جھپٹا سا سارنچہ بنائے اپنے بڑے بیٹے بلوکے کا پتھر ڈاکٹر کو بھیجا تھا۔

”لو کسی کو سنا نا نہیں اور دکھانا بھی نہیں پس چپکے سے جاؤ اور سامنے بیٹھے ڈاکٹر کو دے آؤ۔“ بلوکے پتھر نہیں وہ کشتاہم کا کرنے جا رہا ہے۔ خوش خوش بھاگا ہوا گیا۔ اور واپس بھی آگیا۔ ڈاکٹر کی دہی ہوئی ٹافی تیزی سے کھاتے ہوئے اسے بھی ڈاکٹر بڑا اچھا لگ

رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔ اور دوسرے دن جبکہ ارشاد کام پر چلا گیا تھا اسے طرین سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اس نے جکے سے کٹڑی کھول دی اور اس کی محنتوں کا مارا ڈاکٹر جھٹ اندر آگیا۔ تینوں بچوں کو اس نے ایک کمرے میں بند کر کے پہلے ہی کٹڑی لگا دی تھی۔ وہ بیٹی ڈاکٹر کو اپنے دکھ سناتی رہی۔ اور وہ مرد ہوئے ہوئے بھی جلے کس طرح بڑی روانی سے اُسو بہائے چلا جا رہا تھا۔

”دیکھو لو ڈاکٹر جی کتنا سستا ہے یہ ارشاد“

”گل اگر تم اس سے طلاق لے لو تو میں آج بھی تمہیں اپنا لے کو تیار ہوں۔“

”نہیں ڈاکٹر جی تمہاری بیوی اور تمہارے بچے“ وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”تم میری فکر چھوڑو گل مجھ سے تمہارا یہ دکھ نہیں دیکھا جاتا“

”ڈاکٹر جی اس سے چھٹکارا پانے کے لئے اب اسے کیا بہانہ کروں؟“

”یہی سارے دکھ جو تم نے مجھے سنائے ہیں اب اسے بھی کہو“

”ان سارے دکھوں کو اب کوئی اہمیت نہیں دیتا جی وہ کہتا ہے یہی دکھ تو عورت کا سنگھار ہیں“

”رغلط کہتا ہے تمہارا اب۔“ ڈاکٹر ایک جوش کے عالم میں بولا

اور گل اور بھی شدتوں سے سسک پڑی۔

”تم نہیں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو گل میں ساری دنیا سے ٹھکر سکتا ہوں“ تب گل نے اس سے یہ نہیں پوچھا۔

”کہ تم پہ کیوں نہیں دینا سے مگراتے تھے۔ جب ارشاد مجھے بیاہ کرے گیا تھا۔

تب تمہارے یہ سارے دعوے یہ سارے وعدے کہاں چلے گئے تھے۔ مگر اس نے کچھ بھی پوچھے بنا ہاں کر دی۔ ڈاکٹر سرتیل سے جھوم اٹھا۔ اور پھر حکیم کے مطابق ایک صبح گل کو جھپٹ کر مال کے گھر آ بیٹھی۔ صبح سے دوپہر ہوئی پھر شام۔ مگر ارشاد لینے نہیں آیا تو مال کو نگر ہوئی۔

”گل مجھے ارشاد لینے نہیں آیا۔ ابھی تک اندھیرا بڑھ رہا ہے اور پھر چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔“

”آجائے گا مال“ اس نے چارپائی پر لیٹ کر پکلیں بند لیں اور ڈاکٹر خوابوں میں آن آرا۔ رات ہوئی پھر صبح ہوئی ارشاد نہیں آیا۔ وہ بے حد مطمئن تھی۔ مال کا جی ہول رہا تھا۔ اور باپ کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر گل کے ارادے بھی ڈالواں ڈول

ہو جاتے تھے۔ بردوسے ہی بل ڈاکٹر کا تصور جسے ہر خطرے پر
بادل کی طرح چھٹا جاتا تھا۔ شام آتی تو اپنے ساتھ پھر نکلتا
سیسے ٹکلی کی مال بخت بالو کے دل میں اتر آتی۔
”ر تو کہیں بھڑک کر کے تو نہیں آتی گل“
”ہاں مال میں اب ارشاد کے گھر نہ جاؤں گی“
”ایسا کیا کہہ دیا اس نے مجھے“

”درا تا بہت سے مال“
کوئی نیا نہیں مارنے لگا تو اپنے ابا کے آنے سے پہلے ہی
لوٹ جا“

”نہیں مال“ گل منت سے بولی تو بخت بالو کا جی بھی پسج
گیا۔ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر آئے۔

”ا سب عورتوں کا مفرد ایک جیسا ہوتا ہے گل تو کہتے
دل باپ کی دہلیز پر رہے گی۔ ایک دن مجھے جانا ہوگا۔“
”نہیں مال“ گل کی ایک ہی رٹ تھی۔

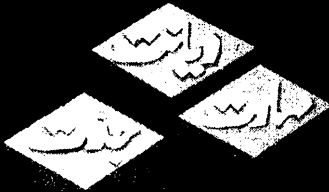
بخت بالو اٹھ کر چلی گئی تو وہ پھوٹے بچے کے بالوں میں ہاتھ
پھیرتے پھیرتے پھر سرجوں میں کم ہو گئی۔ گل کے ساتھ بینچوں کا
ساتھ تھا۔ ہنگامی زوروں پر بھی منشی ہاشم علی بھی بوڑھا ہو چکا
تھا۔ اب وہ پہلا والا زور اور غلغلے کے کہاں چلا گیا تھا ہر آنکھوں
کی سرخی اور وحشت آج بھی قائم تھی۔ اس نے ایک دن بھی نہیں
پوچھا تھا کہ گل کیوں آتی بیٹھی ہے اور ارشاد کیوں نہیں آیا۔
ادھر گل مطمئن تھی اور ڈاکٹر کے اشارے کی منتظر کہ کب وہ
کہے اور وہ ارشاد سے طلاق کا مطالبہ کر ڈالے اس دوپہر وہ ڈاکٹر
کی دوکان میں سے نکل رہی تھی کہ ابا اچانک ہی گھر گیا اسے دوکان
میں سے نکلنے دیکھا تو مارے غم و غصہ کی شدت کے وہ تھکھڑاٹھا
”گل بالو تو ڈاکٹر کی دوکان میں کیوں گئی تھی؟“

گل بالو فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی اس کے وہم و گمان
میں بھی نہیں تھا کہ ابا یوں اچانک ہی دیکھ لے گا منشی ہاشم علی کا ہاتھ
اسے مارنے کے لئے اٹھا پھر چھٹک گیا۔ وہ جھکے ہوئے کندھے سے باہر
نکل گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ بے منہ والا دلا بٹلا ارشاد بھی تھا
”جھکڑا کوئی خاص نہیں تھا ابا جی پر گل بہت گڑبگڑی۔ وہ
سعادت مند بیٹوں کی طرح سر جھکائے بیٹھک میں کوٹے والی کرسی
پر بیٹھا دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”اچھا ارشاد میں جا کر گل کو بھیجتا ہوں۔“ تب ہی ارشاد
کا سب سے بڑا بیٹا بلو اندر آ گیا۔

”آبا ابا جی آئے ہیں۔“ وہ دوڑ کر اس کی گود میں آ بیٹھا۔
”کیا حال ہے بلو؟“

اسلامی بینک کاری کی برکات آپ بینک پہنچانے کے لئے
الائیڈ بینک کی کارکردگی کے تین ستون



ABL
الائیڈ بینک

اسلامی بینک کی کارکردگی کا غرور وار

PID (Islamabad)

Paragon © B1 ABL-11

”ٹھیک ہوں گی“
 ”اکی جیسی ہے تمہاری۔“
 ”آج نانا پھر ملے گا تھا جی“
 ”کیوں؟“

”ڈاکٹر کی دکان میں کبھی تھی ناجی اور پرسوں میں ڈاکٹر کو کافی خط بھیجی دے کر آیا تھا جی“
 بولنے آنجائے ہی میں سچ بول کر اگل اور ارشاد کے مابین فرق اور فاصلوں کو اور بڑا دے دی تھی۔ ارشاد کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ تب ہی گل اندر آئی۔
 وہ بے اختیار اس کی طرف چھینٹا اور چپٹا سے گھسیٹتا اس پر ملوں اور مغلظات کی بارش کرتا چلا گیا۔
 تو اپنے اس یار سے ملنے کی خاطر روز بھر اکر تھی نا میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ارشاد کے تاثر توڑ محلوں کے لئے وہ تیار نہیں تھی۔ تیراگر گر پڑی۔ اور ارشاد کی پے در پے ٹھوکر دینے سے ہولہان کر دیا ارشاد تھک گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا تو ظالم ہے ان ہاں نہیں ہے مجھے طلاق دے دے بس بہت دن تیرے ظلم سہ لئے اب میرا بچھا چھوڑ دے بکثت۔“

وہ با آواز بلند کوسنے بد دعا میں اور گایاں دے رہی تھی ارشاد آندھی نوران کی طرح باہر نکل گیا۔ وہ بے دم ہو کر گر پڑی۔ صبح آنکھ کھلی تو جو ڈھونڈ مارے زخموں کی چھین کے دکھ رہا تھا۔ بخار میں چسکنی وہ سخت کراہ رہی تھی۔ گل فوراً مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔ میں نے تجھے بیاہ دیا تھا۔“ اب اس گھر بڑی کوئی حق نہیں۔“

منشی ہاشم علی سے اسے دلت باب کی بجائے کسی ظالم جاہل ارشاد سے کبھی زیادہ جلد شخص کی بو آ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور گر کر پڑی منشی ہاشم علی کا پر جلاگ وہ مجھے بے دم ہو کر گر پڑی بہت سے دن چپ چاپ گزرتے تھے۔ ہر دھڑکے سے ملنے کی ہر صورت ناکام ہوتی جا رہی تھی اس دور پر سخت باؤد دہر کے کھانے کے لئے سودا سلف لینے بازار گئی تو پیچھے سے وہ تینوں بچوں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس آئی۔

”ڈاکٹر جی تم اب اس دکھاری پر اور ظلم نہ کرو آؤ یہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھا کر تمہارے پاس آئی ہے اسے مایوس نہ کرو ڈاکٹر“
 گل نور کی ہمت اور دیرینہ یہ ڈاکٹر سکا۔ وہ اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی۔ لیکن جب تین ننھے منے بچوں پر نظر پڑی تو سخت سیٹھ گیا۔

”انہیں تو وہیں چھوڑ آئی گی،“
 ”کس کے پاس؟“
 ”اپنی ماں کے پاس“

”وہ بہت ظالم لوگ ہیں ڈاکٹر وہ انہیں ارشاد کو دے دیتے اور ارشاد انہیں زندہ نہیں چھوڑتا۔“

”سخت بے وقوف ہو تم، ہر حال تم رکشے کے میرے ایک دوست کے ہاں چلو میں اسکو پھر ساتھ آتا ہوں۔“
 گل تینوں بچوں کو لے کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اسکو پڑھتے فاصلے پر رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے لگا دیا دوست کے گھر آکر گل ہم گئی۔ اجاڑ بڑا سا گھر تھا۔ جہاں بندہ نہ بندے کی ذات ”ڈاکٹر جی یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ وہ تین بچوں کی ہال ہوتے ہوئے بھی سخت خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”گھر آؤ انہیں گل کی طرح پریشان نہیں یہاں ہی لاسکتا تھا اس دوست کے گھر والے کسی شادی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں۔“

تینوں بچے کبھی ہنسے ہنسے تھے۔ وہ خود بھی چپ چاپ تھی۔ تانوں اور مزہا وہ ارشاد کی بیوی تھی۔ مگر اس وقت ایک انتہائی غیر شخص کے ساتھ تھا تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں بازار سے لپکا لیا کھانا لایا تھا۔ وہ بمشکل چند لمبے زہر مار کر کئی تھی۔

”تم خوش نہیں ہو گل؟“ ڈاکٹر اس کی خاطر گفتا پر لیشان ہو گیا تھا۔ وہ ملاوچہ ہی اتنی پڑی۔
 ”ڈاکٹر جی تم گل کو جہم میں بھی لے چلو تو خوشی سے چلی چلے گی۔“ گل کی بات سن کر ڈاکٹر سسکا پڑا۔ تینوں بچے مجھے نہیں گئے تھے اور باہر بڑے سے صحن میں لیے بھوئے پر بھول رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر کی سحر انگیز باتوں میں کھوکھو تھی۔

گل کو بچوں سمیت لاپتہ ہوتے آج میسر اداں تھا۔ منشی ہاشم علی کی جان پڑی تھی۔ وہ کہیں بچوں سمیت خودکشی نہ کرے۔ یہی سوال تھا جس نے گھر بھر کو پریشان کر رکھا تھا۔ ادھر ارشاد علی منشی ہاشم علی کے گھر کے قریب چکر لگا چکا تھا۔ کہ مجھے میرے بچے چاہیں۔ منشی ہر بار مارے نہایت کے سر جھکا کر دے جاتا تھا۔

وہ وہ اچھے کے ارشاد تو جو صلہ کرے۔
 منشی ہاشم علی کی یہ ٹوٹی پھوٹی تسلی بڑی پھلکی ہوئی تھی وہ تو خود بھی بے خبر تھا۔ انجان تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ گل نور اس کے منہ پر کا کب لے کہاں جا چکی تھی۔

”ایک دن تو نظر پڑ جائے تو اس کا گلاد اداں۔“
 وہ تنہائی میں مٹھیاں لے بیٹھ بیٹھ کے سوچتا تھا۔ ادھر ادھر

دوست کے گھر والوں کے ٹوٹنے کے آثار نظر آتے تو ڈاکٹر پھر سخت گھبرا گیا۔ مگر نورتم واپس چلی جاؤں بہت جلد نہیں اپنا لوں گا۔

”کیسے چلی جاؤں ڈاکٹر، مجھے وہاں کون گھسنے دے گا۔“

”مجھوڑی ہے گل۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر تمہاری خاطر یہ بھی سہی، وہ چپ چاپ مان کر پھر باب کی دہلیز پر آئی۔ اسے دیکھ کر منشی ہاشم علی سمیت سب گھر والوں کے دلوں میں گہرا اطمینان اتر آیا کہ وہ تینوں بچوں سمیت سلامت تھی۔ اس نے خود کشتی جیسا قہقہہ دم نہیں اٹھایا تھا انہیں ایک بھینانک صورت حال سے بچایا تھا۔ تب ہی ارشاد پھر آن پہنچا۔ وہ غم غصے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس نے بے سوچے سمجھے گل کو روطاں دے ڈالی وہ یوں مطمئن ہو گئی جیسے سرسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ ”بچے میں لے جاؤں گا“ اس کے اس سفاکانہ فیصلے پر بھی مات کا دل نہ بیجا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہی بچے کو چھو نہ سمجھتے ہوئے اپنے ابا کے ساتھ چل دیے۔ وہ بے دمی ہو کر چارپائی پر گر پڑی۔

مجھوڑی نور کو ڈاکٹر پھر اپنا عہد و وفا کرنے کی خاطر ایک بار پھر منشی ہاشم علی کے پاس چلا آیا منشی ہاشم علی نے اپنی اڑھی ہوئی گردن اور سرخ سرخ آنکھیں لہی سے جھکا دیں وہ کس برے برے گل نور کو ساری عمر اپنے پاس رکھنے کا دعویٰ کرنا کہ اس میں اب وہ طاقت نہ رہی تھی۔ وہ غور و چلنا چور ہو گیا تھا۔ گھر میں اس کے بڑے بیٹے عبدالرؤف کا راج تھا۔ عبدالرؤف کی بیوی کو کبھی گل نور کا بہانہ مستقر رہنا پھر زیادہ نہیں بھاتا تھا۔ انہوں نے چپ چاپ گل نور کا لکاح ڈاکٹر سے کر دیا۔ ان دنوں نے ہی سال بعد بھی اپنی منہل پانی تھی کہ ان کے جذبے سمجھے تھے۔ مگر سچی تھی۔ ڈاکٹر کی پہلی بیوی اس غم میں چارپائی سے جا لگی تھی۔ ادھر گل نور نے اپنے بچوں سے جلدی بھی سہہ لی تھی۔ جو کہ منتر کی مائیں کم ہی برداشت کر پاتی ہیں لیکن منٹا کے سارے اندھے جذبے بھی ڈاکٹر کی محبت کے آگے ماند پڑ گئے تھے پھر بڑے گئے تھے۔ گل نور کو صرف ڈاکٹر سے پیار تھا اس کی قربت، اس کی محبت درکار تھی۔ جو اس نے پائی تھی۔ دینا والے ایک ماں کے اس انوکھے فیصلے پر حیران تھے۔ ششدر درہ گئے تھے۔ انکشت بندوں تھے۔ ان کا موقف تھا کہ ارشاد خواہ گل بظلم و ستم کے پہاڑ بھی تو بڑا ڈالتا تو اسے سب کچھ سہہ لینا چاہیے تھا۔ گل اس کے بچے اس سے جدا نہ ہو پاتے وہ منٹا کے جذبول کا خون نہ کرتی لیکن اسے دنیا کی کوئی پرواہ نہیں تھی ڈاکٹر اور بس ڈاکٹر۔۔۔! وہ اس کی دنیا میں بظاہر خوش تھی۔ مطمئن تھی۔ لیکن رنگ دن بدن بیلا پڑتا جا رہا تھا

وہ گیلی لکڑی کی طرح سنگ بڑی تھی۔ رات کی تنہائیوں میں اسے اپنے بچہ یاد آجاتے تھے۔ لیکن دن کے اجالوں میں یوں پرسکون دکھائی دیتی جیسے سارا جہاں پایا ہو۔ وہ بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے علیحدہ مکان کرائے پر لے دیا تھا۔ جہاں وہ تنہا زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ تب ہی اس نے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر کے گل کو تھکنے سے بچے کو جہم دیا تو سسک سسک پڑی۔

”ڈاکٹر مجھ سے میرا بچہ کبھی جدا نہ کرنا مجھے چھین نہ لینا“

بے وقوف مت بنو گل ایسا قیامت ٹنگ نہیں ہو سکتا تم سے وفا کرنا میرا ایمان ہے۔“

ڈاکٹر کی مائیں اتنی خوبصورت اتنی دلنشین ہوتی تھیں کہ وہ سب کچھ بھلا ڈالتی تھی۔ سارے غم سارے دکھ اس کی ایک مسکراہٹ پر بچھا د کر ڈالتی تھی۔ تب بھی کبھی ڈاکٹر ہنس پڑتا تھا۔ ”دیکھا میں نے تمہارا سہا سہا ایک دن فتنہ کہا تھا نا کہ میں زندگی میں کبھی نہ بھی گل کو ضرور اپنا ڈنگا آؤں میں اپنا وعدہ دنا کر ڈال رہا“

”ہاں ڈاکٹر، وہ بھی ہنس پڑتی تھی۔ اس کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ جن دنوں ڈاکٹر اس کے یہاں آجاتا تھا وہ پھولی نہ سما پتی تھی۔ اس کی خاطر مدت میں کبھی جاتی تھی۔ گل کو ایک کھانا شوق تھا۔ ایک چار دیواری کی تمن تھی۔ جو ڈاکٹر نے اسے بخش کر اس پر احسان عظیم کیا تھا۔ اپنی محبتوں کا لائق دلادیا تھا وہ گل کے بچوں کو اکٹھا کر کے انہیں خوب اہمیت سبت دینے لگی تھی۔ گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں بنا ہی رہتی تھی۔ کہ ایک گل کی خواہش کرنا اسے سما عورت کی فطرت ہے۔ اب بھی کہیں آپ کو ذر ذر دوسری کمزوری، قدرے لمبے قد والی عورت نظر آجائے جو مننے تو یوں لگے جیسے سسکیاں لے رہی ہو تو سمجھ جائیں کہ یہ گل نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی یا،“

کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟

بیوٹی ایکس کا تیلار کوڑہ،

سوہنی میٹر آنل

سوہنی میٹر آنل تیار ہو کر گیا ہے،

بہت عمدہ وقت ملا دیں ہے، دستی خرید کیلئے

۱۰۳۔ اردو بازار، لاہور

بیکر کے لوگ دی پٹی سے بھی منگو سکتے ہیں

گھوٹ کا لال

والدہ افضل علی

دوسری قسط

حامد نے کہا: ہمارا خدا خود ہی بدلہ دے گا۔ تمہیں میری قسم میرا ہی منہ مارا دیکھو جو کہیں جاؤ۔
اللہ کی قسم دیکھو تو وہی اٹھو اس کے اندر ہی نہ بیاہ کیا ہو جو بہت کچھ سمجھا، سمجھا حامد، بیگم ان کو اپنے یہاں لے
گئیں۔ یہاں سولے ان کے یاظہوری کے جو بیچھا کر رہی تھی اور کوئی نہ تھا۔ بہت دیر تک باہم سرگوشیاں
رہیں۔ دو گھنٹہ بعد خیر علی صاحب اپنے گھر گئے۔ حامد بیگم نے ساس سے خیر النساء کے رشتہ کو کہا۔ انہیں منظور
ہی تھا۔ حامد کو باہر سے بلا کر کہا۔ وہ بھی رضامند تھے۔ البتہ یوسف رضائے سن کر غنا الفت کی۔
یوسف رضائے کو لے "اماں جان کیا آپ آپا جان کا رشتہ بھائی خیر علی سے کرنا چاہتی ہیں؟"

خیر النساء نے کہا: "ہاں میاں اس سے اچھا رشتہ اور مجھے کہاں مل سکے گا؟"
یوسف رضائے نے کہا: "میں نہیں جانتا آپ کو ان میں اچھا کیا معلوم ہوتی ہے اماں جان سوا شریا جیں دھن بھنا
کے اور وہاں کسی میں بھی صلاحیت و انسانیت نہیں ہے علاوہ اس کے دس روپیہ کے وہ خرچ ہو چکی ہیں۔ کل باقی بچاؤ
تک ان کی تعلیم ہے۔ اگر بہت ہی کو غش اور بھائی جان کی سفارش سے ترقی ہوئی تو بیس روپیہ کے ہو جائیں گے۔ اور
بھی کوئی آمدنی کا معقول ذریعہ نہیں۔ ماموں صاحب کبھی تیسرے چوتھے جیسے پیسے تیس روپے بھیج دیتے ہیں۔ آپ ہی
سوچیں کہ دس روپیہ میں مزید کنبہ داری کا خرچ وہ کس طرح اٹھا سکیں گے۔ یہ بھی بھائی جان اور خالہ جان کی تحفہ
مہربانوں سے ان کا گزارہ ہو رہا ہے۔ حسن رضا اور شریا جیں کی صرف دو وقت کی روٹی کا خرچ ہے، اور
اندرجات تو آخر بھائی، مہراج اور باجی صاحبان جو عید یوں کا نام سنے کے دیتے ہیں وہ اس ہیں پورا کرتے ہیں۔ وہ صرف
روٹی کا خرچ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے حقیقی بہن بھائیوں میں جو لوگ سلوک نہیں رکھ سکتے ان میں کسی اور کا
نباہ کب ہو سکتا ہے۔ بھائی خیر علی بڑے خوش خض اور تن پرور شخص ہیں۔ ان کی خود غرضی تو اسی سے ظاہر ہے کہ پہلے
یہاں درخواست نہ دی۔ اب جو وہاں سے منہ کی کھائی تو ادھر رجوع ہوئے اور کس قدر جلدی ہوئے تو ان مزاجی کا
یہ عالم ہے۔ تن پروری آپ سے پوشیدہ نہیں۔ رضا اور شریا کی توان کو کوئی فکری نہیں وہ تو اپنی کفایت اور خوشایا
سے گزار رہے ہیں۔ مگر جو ان کے متعلق ہیں ان کا کیا حال ہے۔ شکر تمام دن خدائی خواہ بھرتا ہے۔ چھابڑی
لگا کے کوئی کوڑی عملے کے ذیل لڑکوں سے لے لیتا ہے اور کنکے اڑاتا رہتا ہے۔ وہ بجائے شہر کے خوش ہوتے
ہیں کسے سے کمانے کا ڈھنگ آتا ہے۔ جو صحیح اور باعزت ڈھنگ کمانے کا ہے وہ اسے نہیں سکھاتے۔ ماما
پجاری کو دیکھئے کس حال میں ہیں۔ ڈھنگ کا پڑا بھی نہیں اور بھی کوئی حیثیت درست نہیں۔ بستر کسی کے پاس
درست نہیں پڑتا کوئی ٹھیک نہیں اور۔



بھی کوئی چیز وقت پر گھر سے نہ نکلے گی مگر خود بدولت کو دیکھتے ہانکے بنے پھرتے ہیں۔ کھانا گھر میں کبھی نصیب سے ہی کھاتے ہوں گے ورنہ چھوٹی کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کر گھر والے فالتے سے ہیں یا کیا کھایا۔ مزاج ایسا ہے کہ خدا کی پناہ گھر میں سب ایسے ڈرتے ہیں جیسے ہوتے سے جس طرح خالہ جان اور بھابی جان ان پر بہریان ہیں اور ہر طرح کا سسوکا کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ عقل اور سیدقت رکھتے تو اس وقت نہایت خوش حالی سے بسر اوقات کرتے جو سیدقت رکھتے ہیں۔ اسی گھر میں کس عزت و آرام سے گزار رہے ہیں۔ اماں جان میں سچ کہتا ہوں آپ یہ رشتہ نہ کریں۔ ورنہ پچھتاہیں گی اور آپا جان بے چاری زندہ در گور ہو جائیں گی۔ سولے حسن رضا اور شر یا جبیں کے وہ سب ہی بد سیدقت اور بد زبان، بد مزاج و بے لحاظ ہیں۔ ہماری ان کی عادتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ایسی شادیاں نہیں ہوتیں بلکہ بر بادیاں ہوتی ہیں۔
 مت النساء نے کہا لا میاں! انیس بیس برس کی ہونے لگی دہائی تو کیا کروں۔ اختر کے ساتھ ہونے لگی بھتی۔ تب بھی تم کہتے تھے نہ کرو، امیر ہیں پڑھے لکھے خوبصورت ہر طرح لائق ہیں۔ ان کے یہاں قدر نہ ہوگی۔
 نہ امیروں میں کروں نہ غریبوں میں تو کیا بٹھا رکھوں؟

یوسف رضا نے سنجیدگی سے کہا ”بے شک ایسی شادی سے بٹھا رکھنا بہتر ہے۔ اب بھی میں یہ نہیں کہتا کہ نوابوں میں کریں ہاں اتنا چاہتا ہوں کہ خوش سیدقت و شریف طبیعت شخص ہو زیادہ نہیں تو انٹرس پاس ہو۔ چالیس سو پاس روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو، رہنے کی حیثیت کا مکان ہو۔ حقوڑی بہت جائیداد بھی ہو۔ جن سے رشتہ کیا جاتے۔ وہ انسانوں کی سی طبیعت رکھتے ہوں۔ نرم مزاج رحم دل خوش خلق ہوں کچھ شرم و لہجہ مروت بھی ہو۔ عورت ہو یا مرد خوش سیدقت عقلمند ہواس کے خاندان کے اور عمر بھی عقل و سمجھ رکھنے ہوں؟“
 ”مجھے تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ کھایا پیا نہیں لگتا جس دن میرے اپنے گھر جانے کی ٹمکر کروں گی۔ آگے اس کے نصیب جو نصیبوں میں ہوتا ہے وہی ہوگا۔ اپنی ہڈی بوٹی چھوڑ کر عزیزوں میں دیکھنا سو طرح کے نسخے لکھائیں پھر دوا ریزہ بچ ہے۔ ہر وقت پاس رہے گی۔ تمہاری بھادج بھائی رضا مند ہیں اور اصل میں تو رشتہ تمہاری بھادج اور خالہ نے کیا ہے“

یوسف رضا بخیدہ ہو گئے ”اب آپ بھادج کے کہنے میں آن کر اپنی اولاد تباہ کر دیں۔ بھادج کو تو ماموں کے گھر سے زیادہ اپنے بہن بھائی بھی نہیں مگر تپ غور کریں کہ کس گندے مزاج کے وہ لوگ ہیں؟“
 ”مت النساء نے کہا“ اگندہ کرے بچی کے ساتھ کوئی اور بیچ ہو گئی تو میں ضامن کو نہ کپڑوں کی مجال ہے کسی کی جواسے کچھ کہہ سکے۔ حامدہ کا کام ہوا اور خیر علی تنگ کرے؟“
 یوسف رضا نے ہتھپڑا تلے ہوئے کہا ”آپ کی مرضی مگر یہ آپ ٹھیک نہیں کرتیں؟“
 ”مت النساء مطمئن ہو کر بولیں“ نصیب ہوں ٹھیک!“

منگنی کی تیاریاں دونوں طرف شروع ہو گئیں۔ خیمہ النساء کی طرف تو حامدہ بیگم کا انتظام ہونا ہی تھا اس طرف بھی حامدہ بیگم اور نواب بیگم ہی منتظم تھیں۔ یکے نہ ہوتیں۔ خرچ ان کا ہی تھا۔ چادر درزی باہر اور چادر مغلانیان گھر میں سینے کی خاطر چھائی گئیں۔ غیر علی صاحب کے مکان پر پہلے ماہ کی خاطر قلعی کردانی گئی تھی۔ فرش درزی، چاند نیل روئی کا سامان کریمہ کا آئینہ، تارخ مقررہ خیر النساء بیگم کو منہ لایا، مہندی لگائی، زیور کپڑا پہنا کر دھن بنایا گیا۔ اس کی کٹھڑی میں فرش بچھا۔ پلنگ کسوا کر بٹھا دیا۔ دونوں بچھڑیوں اور چھوٹی زادہ بن نے جاکر خیر علی کو دلہا بنایا۔ مرغ مشو و مندو سالی گیلدن کا آڑا پا جامہ، لالہ زری ریشمی ازار بند، سیمر شاہی سے کام کی طلائی جوتی، سفید کاج کا کرتہ، گلانی ساٹن کی انچن گلے میں بنادی دو پٹہ، سر پر لہجشی رومال، ہاتھ اور گلے میں پھولوں کے ہار اور بھیں سر پر پھولوں کا سہرا، سوامن مٹھائی ایک خوان میں بنائے، چند خوان ناریل، بادام، پستہ اور چھوڑا روں کے ایک ایک خوان، مصری کے کوزوں کا دھن

کے لیے ایک خوان میں بھولوں کا زیور اور سہرا اور سونے کی انگوٹھی جس کا نگینہ بھی سونے کا تھا۔ اور ایک چھلا سرخ رنگ کے ریشمی کپڑے میں ایک پیسہ، ایک روپیہ اور ایک سبادون سلاہوا۔ اور چھوکر وٹکا ہوا۔ خوانوں کے اوپر بہت اچھے خوان پوش ڈھکے ہوئے جو حامدہ کے ہمین کے تھے۔ کرایہ کی گاٹیاں رنگائی گئیں۔ دو تین گاڑیوں میں نونہ کی ماں، بہنیں اور رشتہ دار تھیں بیٹھوں پر دولہا میاں کے احباب اور رشتہ دار اور امیر علی بیگ معہ دو لہب کے سوار ہوئے۔ اپنی عقل کے موافق جلوں بنا کر معہ بلبے اور نونہ کے روانہ ہوئے۔ شام کے کپڑے بھی نئے اور قیمتی تھے۔ سرب سخن رکھالی مٹھی لگا کر نکل خلاف تھا۔ مگر مجبوراً معقول اور موزوں لباس پہنے وہ بھی ساتھ تھا مگر سرب کے آخریں کیونکہ نونہ سے اسے کئی نفرت تھی۔ ذرا چکر کھا کر دلہن کے مکان پر پہنچے، یہاں استقبال کے واسطے حامد علی کے احباب اور رشتہ دار موجود تھے۔ حامد معقول آدمی تھے۔ اس لیے ان کے احباب بھی انسانیت کے جامہ میں تھے۔ معقولیت سے بہانوں کو بٹھایا۔ موافق دستور خاطر تواضع ہوئی۔ پہلے ناٹی نے سرب کو شربت پلایا۔ مرزا امیر علی بیگ نے بہن کے حسب الحکم دس پونے کٹورے میں ڈال دیئے۔ پان الاچی قیمتی ہوئی۔ حقہ اور پیچوان ہر کے آگے رکھے گئے۔ سمدھنیں اندر اتریں۔ پہلے پانی کی دھار دروازہ سے لے کر دالان تک ان کے آگے ڈالی گئی۔ بڑی عزت و تکریم سے بٹھایا۔ ڈومینوں نے استقبال دیا (سیٹھنیاں) ڈھول کے ساتھ کیا۔ اور بلا امتیاز کنواری، بیابھی، بیوہ، ماں، بہن، بھابھو ہر ایک کو معظوظ و شام دیں اور پھر پورا انعام لیا۔ شریا جیسے شرم سے گھری جاتی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر اپنے گھر ہی چلی گئی۔ باہر بھی چونکہ نونہ تھا۔ اس لیے حسن رضا اور یوسف بھی محفل میں نہ بیٹھے۔ جہاں نمک حبشی کی دیگ تیار ہو رہی تھی۔ اس طرف چلے گئے۔ اس کے بعد سمدھنوں کو شربت پلایا گیا۔ اور ایک ایک ہار بھولوں کا اور ایک ایک پچے گوئے کا بنا ہوا گلوں میں پہنایا گیا ایک بیوی کٹورے میں رگڑا ہوا مصلد لائیں۔ اور سمدھنوں کی پیشانی پر لگا کر ایک نہایت سخت اور کھدرے رومال سے رگڑ کر پونچھنے لگیں۔ جس سے سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی لیکن پابندی رسم، آتشوں منک آنے تھے مگر ہنس ہنس کر بڑبڑات کمرتی تھیں۔ اکثر من چلی بیویوں نے ان لگاتے والی بیوی پر بھی ہاتھ صاف کیا کہ سمدھیا نہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ تم بھی تو دولہا کی طرف دایوں میں ہوئی۔

پھر سرب دولہن کو نشان لگانے لگیں۔ دلہن دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رومال لگائے بیٹھی تھی۔ شریا جیں کو سہرا باندھنے کے لیے بلایا گیا۔

حامدہ نے کہا: "اقبال تم اس وقت بھی دہل ہی جا چھیں یہاں نہ بیٹھا گیا،"
شریا جیں نے ہستہ سے کہا: "آپا جان یہاں گانا ہو رہا تھا اس لیے چلی گئی تھی"
حامدہ نے طنز کیا: "اوہو تم بڑی ملائی ہو گئی"

شریلے نے جواب نہ دیا اور بھادج کے سہرا باندھا۔ پانچ روپے ماں نے سہرا باندھا دیئے۔ بازو پر امام صامن باندھا گودی میں جھٹ ڈولہ، ناریل، بھیلیں، بتادشہ، بادام، ہستہ، چھوڑوں کی پانچ مٹھیں اور پانچ روپے ڈالے۔ انگوٹھی چھلا پہنا دیا۔ مبارک سلامت کا غل بچ گیا۔ منہ دکھائی شروع ہوئی۔ پہلے نواب بیگم نے منہ دیکھ کر سونے کی پہنچیاں پہنا دیں۔ پانچ روپے ساس نے دیئے۔ حامدہ بیگم اور مرزا انسا نے بھی دیا۔ امیر علی کی طرف سے پانچ روپے دیئے گئے۔ دو روپے شریا سے دولہے اور بھی سب رشتہ داروں نے حسب حیثیت و مقدور منہ دکھائی دی۔ باہر سلائی ہو چکی تو دولہا میاں گھر میں سلائی کو آئے۔ دونوں طرف دایوں نے مثل منہ دکھائی کے سلامی دی۔ اندر باہر سے کوئی ڈیڑھ سو روپیہ سلامی کا ہو گیا۔ ایک منہ چھٹ بیوی نے سلامی کے وقت کہا۔

"میاں اسی دہیز کے کتے بنے رہنا"

مرزا انسا نے عبت سے کہا: "کنا بیویوں بنا ہے ہوا بنا کچھ ہے حامد یوسف سے زیادہ"

سمدھنیں رخصت ہونے لگیں۔ ایک کامدانی کا پیکر گوکھ و گکار رومال، امام صامن، انگوٹھی چھلا نونہ کی خاطر و پراس ریش رومال صرف پیکر لگا کتے ہن تھیم ہوئے کو ڈھائی من مٹھائی اور نمک حبشی کے واسطے مٹخن کی دیگ ساتھ کی۔ گھر پہنچ کر کھانے

سے فراغت ہو کے خیمہ علی معہ احباب دروازے کے آگے فرش کر کے بیٹھ گئے۔ تمام رات ناچ ہوتا رہا اور بیوہ بے تہذیب مذاق بعد دوستوں کے دولہا میاں گانے والی سے کہتے رہے پاں حقہ چلتا رہا اور کیوں نہ ہوتا۔ ڈیڑھ سو روپے لگا کر لائے تھے اور شادی پر کوئی اپنی کمرہ سے خرچ نہیں ہوا تھا۔ لڑکی کی طرف بھی تمام رات ڈونبیاں گاتی رہیں۔ صبح کو دونوں گھروں سے بیوہ مٹھائی وغیرہ تقسیم ہوا۔ جھنڈولہ ناریل توڑتے وقت اس طرح چھ میگوئیاں ہوتیں۔

امیر النساء کہنے لگیں ”خدا کرے نئی بٹیا نکلی، جو چاند سا بٹیا ہو“

حامدہ بولیں ”بٹیا بیٹی سب اللہ کی دین ہیں“

”قدرت خدا کی بٹیا گھسی ہوئی اور پرانی شکل جسے دیکھ کر سب چپ ہو گئے۔

گھسیٹی نے برآمدہ بنا کر کہا ”پہلے بیٹی ہوگی“

نواب بیگم نے کہا ”پہلی بیٹی بیٹے کے برابر ہوتی ہے۔ نصف بیوہ اور نصف روپیہ کو چار چار روانے اور پیسہ پیسہ ہو کے سب کنبہ کی دلہنوں میں بٹ گیا۔ نصف حصہ کے دو حصے ہو کر شریا جبین و مقبول بیگم کو لا۔ مقبول نے اپنے دو حصے کر کے ایک بچہ کو بھیجا کہ وہ بھی تو بہن ہی ہے۔ رومال بھی تقسیم ہو گئے۔ دولہا کا رومال رکھ چھوڑا۔ شریا نے اپنے رومال کا لچکا ادھر کر ماں کو دے دیا۔ منگنی کے دو تین ہی روز کے بعد بچہ جن آئیں۔

حامدہ بیگم کی صلاح سے ریشمی چندریچہ لچکا لگا کر گولڈنل کا کرتہ کو گھر کے ڈھلے ڈھیلے پانچوں کا پا جامہ لکھتے کاٹیکہ اور سوت کلال رسہ سر جھپی ہوئی پٹری اور رنگین کھڑا دیں چوڑیوں کا جوڑا۔ مندی، کڑھائی کا سامان ڈومنیوں کے ساتھ امیر النساء اپنے کنبہ کی دو چار لڑکیوں کو لے کے بہو کو تحفہ بھجولائے آئیں۔ رس چھت میں ڈال گیا۔ بہو کے ہاتھ پاؤں میں ہندی لگی، کپڑے پہنائے، ٹیکہ لگایا۔ ڈومنیوں نے سادہ کے گہرت گئے۔ کڑھائی چوڑھائی پوری پوری کچھ قید کی، کچھ دال بھری، کچھ بیٹی ٹکیاں ملی گئیں۔ غیر النساء کو جھولے پگھو گھٹ نکال کر بٹھادیا۔ تمام دن ہنگامہ پیارا رہا۔ چونکہ آج انوار تھا۔ یوسف رضا و حسن رضا تمام دن باہر دوستوں میں پھرتے رہے۔ پکوان سب میں تقسیم ہوا۔ بیٹوں سے تیسرے روز بقر عید آگئی۔ مقرر النساء نے ہو داماد کو عیدی بھیجنے کی تیاری کی۔ داماد کے واسطے ہنر مشروع کا آڑا پا جامہ سرخ لاہوری ازار بند سفید جامدانی کا کرتہ، سرخ چھولدار ریشم کی چکن، پچی کا مدار ٹوپی لکڑی میں سچا بناسی دو پٹر ریشمی رومال، طلائی گرگابی، بہو کے واسطے بکھرے کی، ہندی، چوڑیاں و ہل سے، سات طباق شکر اندکے، گیارہ روپے بہو کی عیدی کے، بوٹی دار کا دلی کا پکڑ لگا دوپٹہ ریشمی کرتا، چھولدار طلسم کا غرارہ، ہندی چوڑیاں، سلیم شاہی کا مدار جو تالیوسف رضا کے واسطے سفید لکڑے کا پا جامہ، ریشمی کوٹ، لکڑے کی قینق، ترک ٹوپی، لوٹ رومال، سات روپیہ عیدی کے بیس سیر چاول، دس سیر مصری، پانچ سیر گھی۔ وہ تو یوسف کے واسطے بھی رنگین کپڑے ہی بنائیں مگر حامدہ بیگم کی صلاح سے ایسا لباس آیا گویا چوہتی عید تھی۔ دو برس منگنی کو

ہو چکے تھے۔ مگر مقرر النساء بیگم سہیتہ ڈومنیوں کو ساتھ لے جا کر بہو کو عید کی پوشاک پہنایا کرتی تھیں۔ تجبیں بھی ہر دفعہ بہو کو جھلایا کرتی تھیں۔ چنانچہ اس دفعہ بھی خیمہ النساء کی منگنی سے پہلے جھلایا چکی تھیں اور امیر النساء بیگم بھی ڈومنیوں کو ساتھ لے کر عید کا جوڑا لائیں۔ تمام دن ناچ گانا رہا۔ نوشتہ کو عیدی ایک ایک اشرفی، اساس، خلیا ساس، سالے اور دلچ نے دی گیارہ تاریخ کو خیر علی صاحب مایوں بٹھائے گئے۔ زرورگر انڈیل کی مینقین زرور ریشمی چکن لچکا کو گھر و لگا ہوا۔ زرور ریشمی گھڑ بانات لگی مرمر انکیدی وغیرہ بنی ہوئی ٹوپی زرور مشروع کا پا جامہ، ہاتھ میں لکھنا لوہے کی چوڑی حفاظت پہنے مزے سے دوستوں کو ملتے تھے۔ مایوں سے دوسرے روز ریشمی چڑھی، خود بدولت بھی بڑی خوشی سے ریتی کھلے، اپنے دوست احباب اور آپو پر شہاب وغیرہ خوب ہی ڈالا۔ برات سے ایک دن پہلے ہندی لکھی۔

دوسرے دن دولہا بنے۔ لال ہاتھ پاؤں لال شملہ، طلسم کا پا جامہ پہنے خوش خوش سا بنے چڑھے۔ حامدہ بیگم نے صرف رشید کو مدعو کیا تھا مگر حامد علی نے ان سے بڑی صلاح کئے اختر حسن، جمیل حسن و شکیل حسن کو مدعوئی رقعے بھیجے اور خود

بھی گئے ان کے لحاظ سے یہ لوگ انکار بھی نہ کر سکے۔
 اختر حسن نے حامد علی سے کہا۔ ”جناب ہمیں آسنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر ایک آؤ آپا ہیں کچھکر شاید ناراض ہوں دوسرے
 بارات کے ساتھ نانا ضرور ہوگا۔ ہم لوگ نانا میں نہیں بیٹھ سکتے۔ بس یہی خیال ہے۔“
 حامد پولے۔ ”نہیں آپ تشریف لائیں۔ میں جیتک آپ رہیں گے نانا موقوف رکھوں گا۔“
 اختر حسن نے کہا۔ ”بہت اچھا۔“

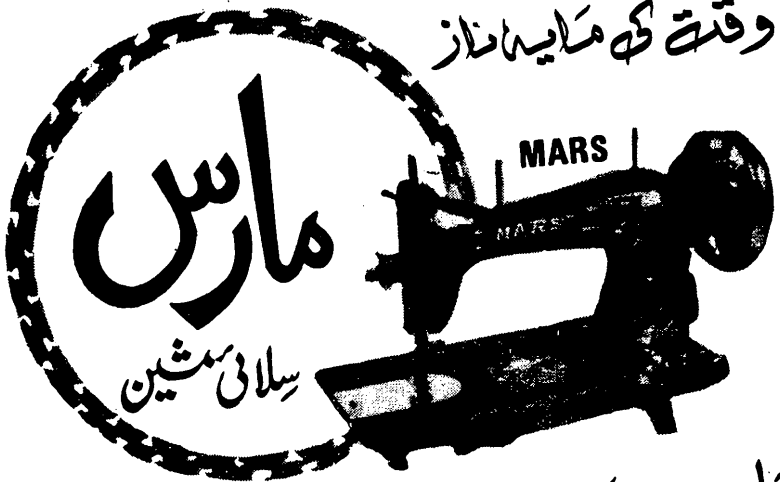
تجمل حسن نے کہا۔ ”مگر بھائی منشی صاحب کو میرا دہاں ہونا گوارا نہ ہوگا مجھے تو سننے میں آیا ہے کہ سخت ناراض ہیں۔
 شاید میرے مارنے کی کوشش میں ہیں۔ دوایک بد معاش میرے قتل کی خاطر لگانے کی فکر ہے۔“
 حامد نے کہا۔ ”استغفر اللہ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ خیر علی میں اس قدر عقل اور چالاکی ہے کہ وہ ایسا کر سکے گا؟
 اوریوں زبان سے تو چاہے کچھ ہی کہہ دیں۔ اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو اپنی حفاظت کا کافی انتظام کر لیں تنہا کہیں نہ آیا جایا
 کریں۔ پیر اپنے ہاں میں پوری حفاظت رکھوں گا۔“

تجمل حسن ہنس کر پولے۔ ”نہیں جناب مجھے کوئی خوف نہیں۔ اگر اس کے دل میں رنج کا کچھ اثر باقی ہوتا تو ایسی جلدی
 شادی پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ صرف یہی خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر ان کی طبیعت میں انوس نہ ہو میرے اوپر آسانی سے کوئی
 قابو نہیں پاسکتا۔ میں تنہا بھی دوچار کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ نیز ہمیشہ میری جیب میں دو سوتول بھرے ہوئے رہتے ہیں۔ بہت
 اچھا میں بھی حاضر ہو جاؤں گا۔“

جلیل راضی نہ ہوتے۔ ”نہیں بھائی اگر انہوں نے کوئی بد معاش لگا دیا ہے تو ضرور آپ کو ہوشیار رہنا چاہیے۔ جاہل
 آدمیوں سے دور رہنا بہتر ہے۔“

اختر حسن نے کہا۔ ”تو بہر جناب۔ خیر علی صاحب اور اتنا حوصلہ پاؤ کوئی بد معاش بلا کافی معاوضہ کے اپنی جان کیوں معرض
 خطر میں ڈالے لگا ہے اور معاوضہ کے واسطے دو ڈھائی ہزار

وقت کے مایہ ناز



مارس سیونگ مشین کمپنی
 فنون

ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ 216873 * پریڈی اسٹریٹ صدر۔ 512925 * بالمقابل میلر ٹرنکی

روپیہ بے چارے کہاں سے لائیں گے تجمل درست کہتے ہیں۔ اگر ان کی طبیعت میں جوش باقی ہوتا تو اتنی جلد ہی شادی نہ رہ جاتے۔
 حامد علی کے جانے کے بعد بولے آپ بتائیں کہ انہیں دینا کیا چاہیے؟ کچھ اور غیرہ تو اس وقت دیا جاسکتا کہ آپا اور والدہ ناراض نہ ہوتیں۔

جیل حسن نے سمجھایا، کچھ اور غیرہ دینے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپا جان اور مانی دیوں گی ہی۔ آپ نقد روپیہ سلطان نوشہ صاحب کو کپڑے کے نام کا اور ایک ساورن سلائی کا دے دینا۔ میرا ارادہ بھی یہی ہے کہ کچاس روپیہ اور ایک ساورن مے دوں گا۔ تجمل بھی یہی دے دیں۔
 اختر حسن نے کہا ”ہاں یہی مناسب ہے۔ مگر میرے وہ قریبی رشتے دار ہیں اور میرے ہاتھ سے انہیں نقصان بھی پہنچا ہے۔ اس واسطے میں زیادہ ہی سلوک کرنا چاہتا ہوں“ پھر مسکرا کر بولے ”بیچارہ خیر النساء بھی میرے ہی باعث محروم ہیں ورنہ آج تو ان کی مالک ہوتیں بیگم کہلا لیں۔“

جیل حسن مسکرا کر بولے ”ہاں یہ درست ہے۔“
 اختر حسن نے کہا ”میں چاہتا ہوں خیر النساء کے نام۔“ دس پندرہ روپیہ یا ہوا کی جائیداد کروں مگر شیر علی صاحب اسے محروم نہ کروں اور اس کے کوڑے کر لیں۔“
 تجمل حسین نے کہا ”یہ تو آسان ہے۔ آپ اس شرط سے وقف کریں کہ وہ کسی کے نام منتقل نہ کر سکے۔ ناجائز اس کی آمدنی اسے ملے بیع، و ڈگری یا مہر کا اختیار ہو۔ بعد موت اس کی اولاد کو ملے۔“

اختر حسن نے کہا ”مختوٰۃ صمد ہوا شہر کے نزدیک سی کچھ زمین نیلام ہوئی تھی جو میں نے خرید لی تھی۔ زمین نہری ہے اور پندرہ روپیہ یا ہوا کی آمدنی ہے۔ اس وقت تک جو اس کی آمدنی ہوئی ہے وہ میں نے جمع کر کے ایک مختصر سا پنشنے مکان بھی اس میں بنوایا ہے۔ میرا ارادہ ان کے نام منتقل کر دینے کا ہے۔ میرے خیال میں اس نقصان کا جو میں نے وہ نوں کو پہنچایا کچھ نہ کچھ تدارک ہو جائے گا۔ نیز بھائی حامد نے جو سمہد روی میری بہن کے کام میں فرمائی ہے اس کا بدلہ بھی ان کو مل جائیگا۔“
 ”بہت خوب ہے۔ نہایت مناسب ہے۔ بل جزاء الاحسان الّا الاحسان“ تجمل حسن نے کہا۔ اختر نے اس وقت اشامپ کا کاغذ نکال کر مہر نامہ مختصرہ انطاخیر النساء کے نام لکھ کر باقاعدہ رجسٹری کروا کر پاس رکھ لیا۔ شہزادہ رشید حسن تو حامد کے بلائے ہوئے تھے۔ یہ تینوں حامد کے لحاظ سے گئے۔ حامد بیکم نے حکم دے دیا تھا کہ رنڈی کا ناچ رشید حسن کے آئے پر بند کر دیا جائے چنانچہ ان چاروں کے آتے ہی ناچ بند ہو گیا۔ رونی منقل کے واسطے رشید نے حامد کا گراموفون منگو کر اپنے آدھی کو بجانے کا حکم دیا۔ نوشہ صاحبہ تجمل حسین کو دیکھ کر بہت ہیچ و تاب میں تھیں۔ وہ تو بی غنیمت ہے کہ اس وقت شرم میں دو لٹھائیں پیٹھے تھیں۔ ان کی سلائی کی صورت جامہ تہہ بٹھا گواٹا سرخ ہاتھ پاؤں دیکھ کر وہ لوگ آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ حامد نے بڑی خاطر تواضع سے بٹھایا۔ کھانے کے بعد نکاح ہوا۔ بعد نکاح ان چاروں نے اجازت مانگی کیونکہ ناچ بند تھا محفل کے لوگ گھبرا رہے تھے۔ حامد نے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ سلائی کے چاروں نے ساورن اور کچاس کچاس روپیہ حامد کو دیئے۔

اختر حسن نے کاغذ دیکر کہا ”یہ آپا کے عزیز ہیں آپ میری طرف سے رکھ دیں۔“
 تجمل حسین نے بھی جیب سے ایک رومال میں چھوڑتی پانچ سو روپیہ نکال کر کہا ”یہ آپ اپنی بہن کی طرف سے ہیں تو تحفہ دینا۔“ وہ سب سوار ہو گئے۔ حامد بہت خوش ہوئے اور سب چیزیں جا کر بیوی کو فے دیں۔
 حامد نے پوچھا ”کیا تم نے بلایا تھا؟“
 ”خود ہی چلے آئے تھے۔“
 ”حامد نے کہا۔ تجمل سے تم نہ لینے۔“

حامد نے بہتگی سے کہا ”سمجھا لی کر۔ میرا کیا نقصان تھا؟ آخرب بہنوئی ہے اور میرے پاس تو کوئی رہے گا بھی نہیں۔“
 ”کے ہی گھر چلا جائے گا۔ حامد بھی ایسی بے وقوف نہ تھیں کہ جس بات میں شیر علی کا فائدہ ہو اس میں غیرت کرتیں۔“
 دو لٹھائیں رسمیات کے لئے اندر آتے جاتے تھے۔ ڈومینوں نے ٹوٹے سٹائے جس طرح ان کے ہنڈیا احباب کے

تھا جواب دیتے ہوئے سہاگ بڑا اکلوتا لگیا۔ اس میں سے گوند الہنجیاں نکلیں جو مبارک نشکون سمجھا گیا۔ دُہن کے ہاتھ سے ہر طرف کچے چارول پھینک دئے گئے۔ اس کے بعد آدھی صوف ہوا۔ گوہر ایک مقدس اور مبارک رسم ہے کہ پہلے مصحف شریف بیچ میں رکھ کر اور سورہ اخلاص جیسا کلام پاک پڑھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھیں مگر سہاری جاہل اور نا تعلیم یافتہ یہ ہونے لے اسے بھی مشکل اور رسمیات کے بیہودہ بنا لیا ہے۔ ڈوئیاں بھلوے کے گیت کاٹی ہیں۔ چارولوں کی کھیلیں اور ریت تلے دو ہاتھوں پر اچھالتی اور جلوہ کرانے کا قیام لیتی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ جو تاجاگر ہے اسے غلام بناتی ہیں۔

”ہومیوں میں تیرا غلام ہوں بیوی منہ کھولو ڈوہنتی نے کہا
”ہومی میں تیرا غلام بلکہ غلاموں کا غلام ہوں۔ مرنے دکھاؤ“ خیر علی نے کہا۔

شیر بھیڑ یا جو کچھ بنایا خوشی سے بنتے رہے۔ سب رسمیات کے بعد بالنگی دروازے پر لگی۔ ٹولن سر سے ملنے لگی۔ اور سب تو صرف زمانے کے دستور کے موافق ریجیدہ تھے مگر یوسف دھنا بہن کی آئینہ زندگی کے خیال سے فرجھائے جاتے تھے۔ ڈوئینوں نے دروناک آواز سے یہ گیت گایا۔

لے گھر سنچھال اپنا بابل ہم چلے پیا کے دیں
ہم تولے بابل بسیرے کی چڑیاں رین بسے اڑھائیں
لے گھر سنچھال اپنا بابل ہم چلے پیا کے دیں

خیر انسا کو جبرہ معقول ہو گیا۔ حامدہ بیگم نے اپنے چہرے کے برتنوں میں سے چالیں برتن اور چودہ چوڑے دیئے۔ جو نواب بیگم نے بنائے وہ بھی معقول تھے۔ ایک ماموں کے گھر کا دوچار اور کنبوں میں سے آئے۔ باقی گھر کے تھے۔ جس میں سے ایک چوہلی کے اور چاروں چالوں کے واسطے رکھ لئے تھیں جبرین میں دیکھئے۔ ایکس برتن آماں نے دیئے۔ ایکس زنانی مردانی پٹنا میں دیں۔ ادھر سے سات چوڑے بری (ساجی) میں آئے تھے۔ ایک نواب بیگم کا، ایک حامدہ بیگم کا۔ ایک قمر النساء نے دیا تھا۔ دو چوڑے گھر کے۔ ورنہال کے۔

کانوں کی بالیاں، بھلیاں، نگے میں بنگنی اور چاندی کے مہکلیں۔ پاؤں میں بھانجیں تیس تیس کرے گھر کے تھے۔ نواب بیگم نے آرسی، انگوہنتی، چھتہ بہن کی طرف سے پہناے۔ نہ بھانجے نے پٹے، انٹیں اور گوند پہنا یا بختہ۔ ٹنگیں نواب بیگم نے بری پر لائے کے واسطے بھتیجے کو خوا دیئے۔ حامدہ نے سونے کے جوشن بہن کو پہناے۔ ایک پٹنگ، ایک مہری، ایک ناز کا تخت، اڑھٹھا، دو رسیاں، حقہ پانی، گھوڑا کاٹے کے سو روپے رکھ دیئے۔ بھجور سے زیور بھاری ہو گیا اور ساوروں سے سلامی میں اضافہ ہو گیا۔ دو سو روپے سلامی، تین سو روپے لگان کا زمین کا کاغذ، خیر علی وغیرہ کو اس قدر امید کہاں تھی۔ حامدہ بیگم و نواب بیگم بھی اس قدر فخری تھے وہ تھیں۔ اگر خیر علی کو فائدہ پہنچنا اور روشن آرا کے ساتھ شادی نہ ہونے سے جو نقصان ہوا تھا اس کی تلافی نہ نظر نہ ہوتی۔ بھاری ہجر کم بڑے کر سہ سال پہنچیں۔ وہاں بھی بیہودہ رسمیات۔ ہوتی رہیں۔ زمانے بھری نو رسمیات۔ ماہو میں مگر جو شرمناک تھیں ان کا کسی کو خیال نہ آیا یعنی ناز اور عار ڈھنی۔ نواب بیگم نے بھائی سے چھپا کر رومانی میں دیوانی بڑھادج سے رام بھول پازیب حامدہ بیگم نے دی۔ نواب بیگم نے کلمی کی بھلیاں جو بھتیجے کے واسطے یوسف کو دوسرے روز بھیجا گیا۔ بہن کو لے آئے خیر علی صاحب بھی آئے۔ دُہن کے ہاتھ میں تل اور شکر کھر کھتی بند کرادی۔ بڑی مشکل سے خیر علی صاحب نے کھولی بڑی مشکل سے جب حکم کے چاٹ لی۔ اس رسم کے بعد جب باہر جانے لگے تو جوتا غائب۔

خیر علی نے کہا ”بہن میری جوتی کس نے چھپائی؟“

”تایا ناز دسالی نے نہیں کر کہا“ دو لھا بھائی تنگے پاؤں آئے ہوں گے۔

بھولی ناز دسالی بولیں ”بہن کچھ تو ہم ڈھونڈ دیں“

خیر علی کیوں چپ رہتے۔ دھڑکی کی ہڈیاں کئی تو بلا سے۔ تھکی ذات تو معلوم ہو گئی۔

بڑے رگڑوں بھگڑوں سے دو روپے دیئے تو جو تامل کھانا کھا لے آئے تو سفید ڈوریاں کے پٹنگ پر بٹھائے گئے۔ ڈوریاں بلی ڈھیلی کسی بھین۔ پاؤں دھرتے ہی چاروں پاویں سے کھجے کر بیچ میں آئے اور ششی صاحب پٹنگ کے اندر جا رہے۔ اب آپ نے ہا پٹنگ بغیر بنٹھا اور بٹھا بھی اچھا خوب چوٹ لگی۔ سالیوں نے نالی بج کر قہقہہ لگایا۔

دوسری نے منہ ہی اڑائی۔ "اس وقت آپ روکے ہوئے ہیں۔"

غرض تمام وقت ایسے ہی ایسے مذاق ہوتے رہے کہیں آپ بھلا

گئی۔ اس وقت آپ نے بدل دینا چاہا۔ مگر اس میں بھی وہی بازی کے کریں۔

کے درمیان اور دیوار میں کھڑے رکھنے کی لکڑی کی گھڑی بنوا کر اور پین کی بھیت کو لکڑی پانچانے کے قصبے اور زمین میں کئی تھی۔ پانی پینے سے دلدل ہو جاتی تھی اور روم و درکڑے چلتے تھے۔ بون کے مارے قدم دھڑکنا اور دھڑکنا۔ اس کی زمین بھی بڑی کرا کے نالی بنوا دی اور لکڑی کے قصبے بنوا دیے اور دھڑکنا بنچنے کے واسطے آدھے پین بھی بنوا دی اور دونوں وقت جھڑائی سے صفائی اپنے سلسلے کو ایا کرتی تھی اس لئے اب صحن بھی پہلے کی نسبت صاف رہنے لگا پھیریں بنوا کر ڈھانچا بنوا کر لکڑی کا سامان بنایا وہ سب اس نے جلایا۔ جو پھر بھی باجو کی قابل مرمت تھی وہ اپنے میکے کے آدی کو بھیج کر درست کروائی۔ لکڑی اُبلے قرینے سے ایک طرف لگائے مٹی کے ٹھیکے کو آگڑا کر کٹ اور پھینے پڑے چیتھ سے سب اٹھوا دیئے۔ گتے کے حال بھی خدا نے رحم کیا۔ اس کا پیار بھی بد لا گیا اور صاف پانی اس میں رہنے لگا۔ پھر بان اور دھڑکنا پرانے بان لےنے والے جو پھر بھی جیتے ہیں انہیں دیدیئے۔ نئے بان حسن رضا سے منگو کر اپنی دو اکو ساتھ لگا کر خود ہی بن گئے۔ ایک دن مقتول کی کوٹھڑی میں گئی۔ اس کا حال دیکھ کر بول اٹھی۔

اس کا حال دیکھ کر بول اٹھی۔
 "اے بی بی تنہا کی کوٹھی کا کیا حال ہے۔ اسی میں اپنی سہیلی کو لے کر بیٹھتی ہو وہ کیا کہتی ہو گی!"

”اے بے بی منتاری کوٹھری کا لپکا حال ہے۔ کسی یں لپکی رہی ہو گے۔ مریاں کی ہڈیاں پھیل چکی ہیں۔“

مقبول نے مسک کر کہا ”بھائی وہ دایری نہیں ہے۔ مجھے فرشتی کرسی کہاں بیترے ہے جو میں بھی سجھاؤں؟“

”اے پہنا جانے کوڑا تو نہ ہو۔ بھارتو تو دلو الیا کرو۔ تم ٹھوس دن طانی دیواریں اور پخت جھاڑ لیا کرو۔ اب جاڑے آئے۔“

اندریا بی نہ بھینکا کرو۔۔۔۔۔ سیلین جوتی ہے۔ دیکھو تو انٹی ہی کوٹھری ٹریا جین کی ہے۔ اس نے کیسی سجائی ہے۔ تیلیں ایسی اچھی طرح چڑھائی ہیں کہ اسٹیشن کی کوٹھری معلوم دیتی ہے۔ ایسی ہی تم بھی چڑھاؤ تو خوبصورت بھی لگے اور گرمیوں میں ٹھنڈی بھی ہے۔“

مقبول نے کہا ”نہ بھائی مجھے تو ڈر آئے۔“

مقبول نے کہا: ”نہ بھائی مجھے تو ڈر آتا ہے۔“ اور یہ جو کیا رہا ان گئی یہی ان سے ڈر نہیں لگتا؟“

مقبول ہے کیا۔ ”وہ دودھ دیر میں“

”اور یہ اتنا کڑوا کر کھجور کا ہے۔ گندی جگہ تو بہت سے کیڑے مکوڑے ہو جاتے ہیں۔“

خیر النساء! ان کا پلنگ نکالتے کیوں۔ دیکھا تو گلہری کے گود کی طرح پلنگ بھرا ہوا ہے۔ پلنگ کیا ہے گودا ہے۔

چیز اس میں موجود ہے۔ ایک کلوگرام جھنگولا بوندہ ہے۔ دوسرے سب چیزیں اس کے لئے تو بنے بہنا متیں اس پائپ پر کیسے آرام آتا ہے۔ ایک کھوٹی بردال دوا اور وہ ہے کھنری میں باندھ کر لٹکا دینا۔ انہیں باندھ بوندہ کے طاق میں رکھو۔ میلے کپڑے کھوٹی بردال دوا اور وہ ہے کھنری میں باندھ کر لٹکا دینا۔

”بھابی طاق میں ڈر لگتا ہے۔ اندھیرے اجالے کوئی چیز اٹھاؤں تو کچھ کاٹ نہ لے۔۔۔ پلنگ نکوڑے کا پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔“
 ”بھلا سے اور اینٹوں کو کس کی ہوتی۔ دیکھو تو کیسی قویلی اور ٹوٹی ہوئی ہے بیتر اندھاؤ نے کہا۔“
 ”بھابی ہم سے تو کسی نہیں جانی۔“

انھوں نے نکوٹھری میں تھکاؤ و دوڑوائی چیزیں سب قریب سے طاقوں میں رکھیں، پلنگ باہر نکلوایا، جالے بھاڑے قلعی تو بھابی کے پیادہ کی خاطر ہوتی تھی، مگر دیواروں پر بجا بجا پاؤں کی پکیں پڑی تھیں۔ وہ کھڑک پر چٹا لٹکوا یا۔ ایک اور پلنگ بچھوا دیا۔ دو پلنگ پائے بڑانے کے واسطے اپنے آدمی کو بھیج دیا۔ پلنگ کی درمی زمین کی رنگت ہورہی تھی وہ میلے کپڑوں میں ڈال دی تھی جو ناسو اسے موٹے موت کی سفید دریوں کے وہ بھی اب پرائی ہو گئی تھیں۔ اور کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ صرف نیر علی صاحب کا ستر تو درست تھا یاثر یا جین یا حسن رضا کا اپنے عقل و سیلف کے بدولت سب سامان ٹھیک تھا۔ تو شک ساس و دیو کی کئی سال کی روٹی پڑی ہوئی میس چمکتی تھی۔ مقبول کا تھا ہی نہیں۔ وہ ماں کے پاس سوئی تھی۔ انھوں نے نہات تو شک اور دھیر کر روٹی کا تنے کو دی۔ ابرے وصلو اکرو بارہ رنگ دیئے گئے۔ سب کے استر لئے لگا کر رکھے۔ ساس کی رضا کی مرضی بچھی ہوئی میلی تھی۔ اس نے اپنے کنوارے بیٹے کی رضا کی مرضی اور دھیر رنگ کر لی روٹی ڈالی۔ ڈور سے کچھ کر کند کو دی اور زندگی درست کر کے ساس کو دی۔ کا تنے کے لائی جو روتی تھی وہ کوئی باقی بچ دی۔ حامد کو کھلو ابھیسا کہ پاس لے کر مجھے بھیجیں۔ کچھ میس کی زمین تھی وہاں سے آیا کرتی تھی۔ اب سے لے کر کچھ اختر سے کہا کہ پاس ہی بیچ دیں روپیہ بھیجیں۔ اس طرح کیا سب بیچ کر واکے بجاری نے اپنی دادی سے انڈائی۔ کچھ آپ اونٹ۔ پہلی پاس کی روٹی لحاف تو شکوں میں ڈالی۔ نئی روٹی کچھ دوا سے کوئی کچھ کوئی پرہیزانی پرانے موت کی دریاں بدلیں۔ نئے موت کی دو ہتیاں اور گاڑھا بنوایا۔ ساس اندر او دیور کے ستر سے درست کر دیا۔ چار ستر سے فالتو بنا کر اندر رکھے۔ پلنگوں کی چادریں بنائیں۔ نیلے سیلے چمکتے تھے وہ خلاف انار کر رہے پانچ جاموں کے خلاف تین چار چار سی سی کر چڑھائے اور اندر رکھے۔ پھر بدلے کے لئے کند کے جنہ کے لے جا جم گھڑیاں، پلنگ پوش۔۔۔ نوکر کھینچو اسے اپنی نکوٹھری میں پھت گری رنگ کے کوئی۔ ان کے یہاں گھر سے ہمیشہ اینٹوں پر رکھا کرتے تھے۔ تلے میں نمون مٹی لگی رہتی ڈھکے تو کبھی جاتے ہی نہ تھے۔ کوئے اور مرغیاں شوق سے بیٹھیں دھونا کبھی بکھا رہتا تھا۔ اس نے وہ سب گھر سے بدلے۔ پانی پیئے کی چٹیاں الگ رکھیں۔ ان پر ہمیشہ کڑا ہاندا کھتی تھی۔ برتنے کے گھر سے بھی ہر وقت ڈھکے رکھتی۔ روز صبح کو آپ سب گھر سے دھوئی باورچی خانے کے کام کے آگ گھر سے تھے کہ ملدی، اہس اور پکینے ہاتھ لگا کر خراب نہ ہوں۔ ڈھکے کے لئے لیکن اور گھر بنا بنائیں۔ باورچی خانہ بھی شیشے کی طرح صاف رہتا تھا۔ ہر چیز مرغی اور مرغی سے رکھی رہتی تھی۔ آٹے اناج کے برتن ڈھکے رہتے تھے برتنوں کے دھونے کے کچھ پہلے باورچی خانے یا صحن میں پھینکی جاتی تھی۔ اس نے ایک مٹی کی ناند برتن دھونے کے لئے بنائی اس میں سب پانی برتنوں وغیرہ کا بیج ہوتا تھا۔ اٹھایا اور کیا دیوں میں ڈال دیا۔ جگہ صاف رہتی۔

جین پیچھے بائیسویں دن دیوار میں جھینجھن بھاڑ کر منڈول پھیرتی۔ جاڑوں میں خیر علی صاحب باورچی خانے میں کھانا کھا یا کرتے تھے۔ باجٹائی چڑھنے کے لئے ڈال لی یا دوڑائی کھٹیا پر بیٹھ گئے۔ ایک ٹٹا ہوا تخت کھیریل میں پڑا تھا۔ اس نے اسے درست کر کے قریب سے ایک طرف بچھا دیا، پرانی رضا کی درست کر کے بچھا دی۔ اور گاڑھے کی چادر دوسری کر کے لگا دی۔ ساس، امیاں، دیوار اندر جسے کھوکھی لگتی وہیں بٹھا کر کھانا کھلاتی۔ آپ گرم گرم پھلے کھاتی جاتی۔ بڑا جین بچھنے کے روز یا شام کو ہمیشہ جب بھاجوچ پکا کھاتی، اس کے ساتھ سی کھاتی۔ اگر بھاجوچ یا ماں کہتی تھی تو وہ ہمتی جب سب پک کھیں گی تب کھاؤں گی۔

حسن رضا بھی کچھ میں کبھی نہیں کھاتے تھے۔ جب بھاجوچ کہتی تھی تو وہ بہ جواب دیتے کہ آپ پکا لیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ پکا تی چادریں اور میں کھاتا جاؤں۔ آپ کا مونا نہیں ہیں۔ اور آپ کوں تکلیف کیا کرتی ہیں۔ دو اور موجود ہے پکانے کو۔

خیر انسا نے کہا ”بھئی مہارے بھائی کو دوڑائی بھی پسند نہیں آتی۔“

”ان کے واسطے یہ لیا کریں۔ آخر اور سب تو پہلے بھی دوا کے ہاتھ کی کھاتے تھے۔“

خیر انسا نے بات نمائی۔ خیر بھی ایسا کیا مشکل ہے پکانا۔ شاکر بھی کہتا ہے بھابی کے ہاتھ کی کھاؤں کا مقبول بھی ہی کہتی ہیں ایک ممانی اور تم ہی دونوں ہیں بھابی رہ گئے۔

ساس ہوئی لڑائی جو ایسے میوہ ذلیل خیال کے لوگوں میں عام ہے اس سے وہ بھی مبتلا نہ تھیں۔ آخر جو میں پچیس سال

کی عمریں خیر عمل کی شادی ہوئی۔ وہیں جانکا علی دے کی خوبصورت نہ تھی۔ مگر اچھانک سے درست، گندمی رنگ اور جامہ زیب ضرور تھی۔ گھر بستی کا سلیقہ بھی تھا۔ بول چال کا دھنگ بھی اچھا تھا۔ چونکہ وہ نواب صاحب کے یہاں بچپن ہی سے زیادہ رہتی تھی اس واسطے بہت سیرانے آئے تھے تھے۔ اس کے گھر میں بھی کوئی ان کے گھر کی طرح بدترین نہ تھا۔ مگر کبھی بھی خیر عمل کی والدہ سے زیادہ ہی عقل و سلیقہ رکھتی تھی۔ ایک تو قدرتی امر تھا کہ بوسے سے متلطفت ہوتا۔ دوسرے وہ آرام بھی اسے بہت دیتی تھی۔ بجائے بھر علی کے کوئی اور شخص ہوتا تو پاؤں دھو دھو کے مینا۔ وہ تو دراسی فروگزاشت پر حین چلا نا شروع کر دیتے تھے۔ اپنی غلطی ہوتی اور بیوی نے درست بات بھی مگر طبیعت کے خلاف ہوتی تو بچائے سمجھنے کے لئے اس کے سر ہونگے۔ خیر انساں کو ہم امیر گھر کی بیٹی نہیں کہہ سکتے مگر ان کی طرح غریبی بھی اس کے سینے میں نہ تھی۔ بھائی اس کا نائب تحصیلدار تھا اور بھر کوئی محتاج نہ تھا باپ بھی بیس روپیہ ماہوار بھیجتا تھا کچھ ٹھوڑی بہت زمین بھی تھی۔ بھائی و ج نواب نادری تھی اور مدد کرنی رہتی تھی، گھر میں دو کام کو تھی۔ دروازے پر آدمی اور صرف تین آدمی کا کام۔ ان کے مکان سے خیر انساں کا مکان بھی اچھا اور آرام وہ تھا مگر شتاباں کہنا چاہیے خیر انساں کو کہ اس نے ہر ایک کام اپنے سر لے لیا تھا۔ دو بچاری ایک اسیلی۔ گھر کا بھی کرے باہر کا بھی کرے۔ کھانا بھی پکائے۔ سودا بھی لائے اور بچکے یہاں بھی پیغام سلام کو جائے قبول کرنے والی تھی یہیں۔ ان کو تو بیس بھی لگتی تو شکر کی خوشامدیں کرتیں۔ ماں سے ملائیں۔ دو کو آواز دیتیں۔ اگر گریا یا صحن گھر مٹے تو وہ دے دیتے نہیں تو امیر انساں ہی دیتیں۔

ہر کام میں امیر انساں بچاری اپنی ہڈیاں پیلا کرتی تھیں۔ اب سب کام خیر انساں کرتی۔ دو اس کام کو جانی بیٹھنا چاہے کی خبر رکھتی بعض وقت آٹا کو دھنا، دھوا، دھوا، برتن مانجھنے بھی پڑ جاتے تھے۔ پھر سب کے کپڑے۔ اور کوئی سلائی نہ ہوتی تو نمند کے بھیڑے کے پڑے ہی لے لیتھا۔ آدھ روپیہ دیکھتا تھا۔ ساس کو بوسے سے بیٹے کا زیادہ متوجہ ہونا کبھی ناگوار گزرتا تھا۔ اگانی بات تو یہ تھی کہ بیٹے کی وہ کب آئیں جان کے ایسے ناخدار یا خیال رکھنے والے تھے جواب جاتا رہا مگر اب آں جان ہو پر الزام دیتی تھیں۔ پہلے تو یہ ارمان تھا کہ گھر والی آئے اپنا گھر منیجے۔ اپنے میاں کی چیز منیجھال کر کہے۔ اب گھر والی آگئی تو اور سب بچ گئے۔

پہلے سو آں جان کے اور کون تھا جس سے خدمت لیتے۔ اب بیوی موجود تھی ہر ایک کام کو اس سے کہتے۔ دونوں تال جال سے بونے کی بھی نوبت نہ آئی۔

وہ بچپن ہی سے سمجھا دیا ہے۔ بھوکے آتے ہی خود ہر ایک کام چھوڑ دیا۔ اب اپنی گھر والی آگئی ہے وہ جانے اس کا گھر چلے۔ میں بڑھیا ہوئی۔ مجھ سے بھگڑے نہیں ہوتے۔ اب بھین بیٹی طاقت بہت نہیں ہے۔ جب گھر والی کے سپرد انتظام خانہ داری ہوا خرچ بھی ہوا و گناہوں کو گھر والی نے تو دیکھ کر اور سوچ کر کھکھکاتا ہوا۔ اوپر سے میاں ہوئے اور مزاج کے۔ اگر میاں کی مرضی نکلیں اور ان کے موافق کریں تو ساس بگوسں جو ساس کی رضامندی میں تو میاں پیچیں بڑا بھلا نہیں۔ سو دے کے وقت اس نے پوچھا۔ "ممانی جان! کیا منگاؤ؟" "ممانی جان میں نہیں رحم کی گھڑی میں تو کچھ تادیبا اور جو مانی ہو میں صلی ہوتی تو چپ کر رہیں یا کہو یا۔" "بیوی جو چاہو منگاؤ میرا کہتا ہے جو کہے گا کھالوں کی نہ جی چاہے گا تو دو جہانیاں بھین سے بھی نکل لوں گی۔ پیٹ ہی بھرنا ہے۔" عادت تھی ان کی بھی چٹورنے کی۔ بیٹھے بیٹھے دل بھر کر آیا۔ وہ پیسے کی دال منگوا لکھو دی۔ چائے تیل کی نکالیں مگر تو ریاں نکالیں۔ دل میں یہ باتیں کر کے ٹھگے پکائے۔ دال بھی روٹی پکائی۔ کڑواں کا بھی بنا یا مگر صلہ بھی نہ لیا۔ تیل کا بھی بکھا رہا یا مگر طاسری پکائی۔ فصل کی اور چیزیں بھی ضرور کھائیں۔ منڈیا نہ چڑھائی۔ آٹا کو دھنا مگر آم خرپوزے ضرور منگائے۔ خیر انساں کی عادت اس قسم کی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سلامت روی سے گزر کر رہتی تھی۔ ہمیشہ گائے کا گوشت ان کے یہاں آتا تھا۔ مگر ایک وقت سیہ بھر گوشت پک جاتا۔ دوسرے وقت چاہے دال بھی نہ پکے کیوں کہ تیل کو ٹھکر کر دیش ہی کھاتے تھے۔ وہ سیہ بھر گوشت ترکاری ڈال کر دو وقت کرتی تھی۔ اس عمو طریقے سے بھی انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ اور شکرانگ انساں سے شکایتیں رکھتے تھے کہ بھائی سے سیہ مانگا تھا نہ دیا۔ آکا بھائی کے لئے فلاں چیز رکھی نہیں نہ دی۔ آکا بھائی کو بھی چیز دی نہیں پڑی دی۔ اور خیر انساں سے وہ بھائی بات یاد نہ رکھتی تھیں۔ بڑی کا ستر پھیلا دیتی تھیں۔ ان باتوں کا غصہ وہ اور باتوں پر گھر کرنا لیتی تھیں خیر انساں نے کسی بار یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ گھر کا خرچ در انتظام پہلے کی طرح خود ہی کریں۔ میں کچھ دن تو بھون کے رہوں۔ ابھی ان بھیمروں میں نہ پڑوں۔ مجھے تو شوق ہے بھو بی کے رہنے کا۔ ماں بیٹوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بیٹے ٹھہرے تین روز۔ لڑائی ہوگئی۔ آلا بھابھو کے سر۔

..... کوئی چیز بے مصلحت ہی اس کا نام لے دیا کہ فلاں چیز نے نقصان کیا۔ یہ بہو کا ہی قصور تھا کہ اس نے وہ چیز لپکا کہ بیمار گر دیا۔ اب جو کہیں مناسب معلوم ہو وہ بہو کو بتا دو کہ کب جاوے۔ نہیں بتاؤ گی تو اسے بھی علم غیب نہیں اور پوچھتے کا بیعتی ہے روح کر اگنی سیدی نہ سناؤں۔ اپنی عقل سے اس نے کچھ لپکا لیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو زانی اور کوئے شروع ہو گئے کسی نے کہا تم نے بتا دیا ہوا بولیں میں کیوں بتائی۔ اندھی ہے۔ جانتی نہیں کہ اس کی طبیعت بخڑی ہوئی ہے۔ میں فلاں شے کھاؤں۔ اگر خدا نخواستہ کبھی بیمار نہ ہو۔ جو ان بیٹی خدمت کو موجود ودا موجود چھوٹا بیٹا بھی لٹکا پھرتا پھرے ہے۔ جھوٹی بیٹی بھلا بیٹا خیار داری کو حاضر۔ اگر بہو بھی بیٹی پڑنے کے بیچ جاوے تو کھڑکوں دیکھے۔ بھاری دواغذا کون تیار کرے۔ بیٹی تو بیمار یا ان کی خبر بھی نہ لےوے۔ مانا کہ خیر السار کا بھی اس میں قصور ہوگا۔ چاہیے تھا کہ بیمار ساس کا سر دبا بیٹی پکڑے کچھ دیا جاتی۔ مگر وہ بائیں ایسی قوی تھیں کہ وہ بھی مجبور تھی۔ ایک تو اگر وہ ساس کی بیٹی پر دبا بن جاتی تو کھربٹ بڑھاتا۔ ننڈیں تو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ سوچتی بھاؤں میری اماں کی خدمت میں ہے میں گھر کی خبروں وغیرہ گھر بھی پٹ کر دیتی مگر مٹی جی کی کھٹی اور بد زبانی کا کیا علاج کرتی۔ دوسرے ساس نے بات بن بات گالیاں کوسنے اٹھا جھلا کھائے اس کے دل میں اتنی جگہ نہ چھوڑی تھی کہ وہ میاں کی گالیاں اور کھکیاں کھا کر بھی ان کی بیٹی پر دبا بن جاتی۔ پھر بھی جب اسے فرصت ہوتی کہ بیٹھ جاتی پھر جلی جاتی۔ شاکر مقبول سے کہتی نہ ہوتی۔ "جاؤ مانی کے پاس بیٹھو۔ وہ اکیلے بیٹھی ہیں۔ میں چلی گئی تو یہ کون کرے گا کبھی ان سے آئے کہتی چلو مانی وہاں گرم کیکر مل بیٹھو نہیں تو دھوپ میں آ جاؤ" وہ تو چرب رہیں یا ایسا جھلا بھنا جواب دیا کہ دو بارہ لے بے لے کی بھرات نہ ہوتی تھی۔ اگر انہیں خدا سمجھ دیتا تو اپنی بیٹی اور بہو کا مقابلہ کر کے دیکھتیں کہ وہ میری کتنی خدمت کرتی ہے اور یہ کتنا آرام دہتی ہے۔ اور یہی خواہ دل سے مقبول سے محبت کرتی تھی یا خاطر مگر حسن رضا اور ثرا جبین سے لے دلی محبت تھی۔ مقبول کا قاعدہ تھا کہ اگر ساس بہو میں اتفاق ہے تو وہ بھی بھلاوے سے خوش ہیں اور جو اماں روٹی ہیں تو وہ بھی اگر بی بی ہوئی ہیں۔ بڑیا اور رضا کا ہمیشہ ایک ہی حال تھا۔ اماں خفا ہوں۔ بھائی روٹے ہوئے ہوں وہ ہمیشہ بھائی جان سے محبت اور ادب سے پیش آتے تھے۔

بھادوچ پلنگ نکالنے لگی تھی۔ رضا سامنے بیٹھنے لگی۔ کھڑے ہو گئے کہ بھائی جان آپ بیٹھ جائیں میں نکالتا ہوں۔ بھادوچ ادھان پلنگوں کو کسے کھڑی ہوئی رضا باہر سے آگئے۔ بھادوچ کو بھادوچ خود کھڑے لگے۔ بھادوچ رمل بنے پر مصالحہ کرے لیکن ثرا جبین پاس آن بیٹھیں۔ بھادوچ کے پاس سلامتی بہت دیکھی مانگ کر لے لی۔ یہ بھی ہرات میں خیال کتنی تھیں۔ جس دن سے آئی تھی استانی کے ہاں روٹی ایسے اچھے طرح بھیجا کرتی تھیں۔ گھر میں جو چیز آتی یا جو کچھ پکنا و دوڑوں کا حق ضرور رکھتی۔ اگر گھر میں کوئی ایسی ویسی چیز بکیتی تو پڑنے میکے کچھ لاکر بھیجتی۔ چار چھ باتوں کا قاعدہ بھی تو تھا۔ چھ سات چھ تیاں بھیجتی کبھی مقبول و شاکر کی فرمائش سے پر اٹھا پکاتا تو ان کے لئے بھی پکا رکھتی۔ مقبول اور شاکر ہلا کرتے کہ وہ یہاں نہیں جب بھی ان کا حقہ لگتا ہے۔

خیر علی کی والدہ کو بھی کچھ زیادہ سلامتی نہیں آتی تھی۔ مگر خیر اپنے اور بچوں کے پرے کو تنہا کاٹھ لیتی تھیں۔ معمولی کھانا لپکا کھا جاتی تھیں۔ خیر انسا سلامتی میں بڑی ہوشیار تھی۔ بخیر اس کے ہاتھ کا خوبصورت، ٹانگا نہایت مضبوط ہوتا تھا۔ اور کپڑا بڑی جلدی سیتی تھی۔ کیا محال ذرا بھی آپ میں کمی آوے۔ فستی جی کے کپڑے پہلے درزی سے یا آپو کے گھر کی منڈانیوں سے سلے تھے۔ اب بیوی خود کترسی لیتی تھی۔ مقبول کو بھی اس نے چاہا کہ تھوڑا بہت سینا پڑنا سکھائے۔ کوئی کپڑا کرتہ یا جامہ وغیرہ قطع کر کے پہنے کو دیتی۔ پاس بٹھا کر اسے جوڑنا بتاتی مگر اس کا ذہن ایسا خراب تھا یا جتنی نہ تھی نہ سمجھتا۔ اس کے دھیان میں بالکل ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے کرتہ یا جامہ جوڑنا سکھایا۔ مگر سلامتی اور تربائی بالکل خراب سینی تھی ہوتی تھی۔ یہ موئے موئے سلے سلامتی کھوپ کہیں سے جوڑی کہیں سے بالکل پٹلی بخیر کھوپ سے بھی خراب۔ تربائی ایسی کہ دیکھنے سے نلتی لگے۔ کوئی کرتہ قطع کر کے فراڈرے مانے لگا کے دیتی۔ یہ اپنی کوٹھری میں پہنے کو لے جاتی۔ ایک آدھ کھوپ بھر کے ڈال دیتی۔ ٹانگے بھی کھڑ جاتے۔ دھتیاں بھی اڑتی پھرتیں۔ کوئی لبل، کوئی اسٹین گم جاتی۔ لکھیاں کھینچ جاتی جو بھادوچ کے تعلق سے نہ تھیں۔ کھوپ کھانے کی طرف بھی اس نے انہیں بہت لگا ناچا با مگر یہ ایسی کب تھیں بھادوچ یا بہن یا آئندہ منڈ سمجھ کر اس کا حکم بے دخل سے بھی مان لیتیں۔ اللہ جانے وہ ماموں کی بیٹی سمجھ کر یا منڈ یا بھادوچ پہنے والی سمجھ کر بڑی ہی محبت اور سلوک سے پیش آتی تھی۔ پیارا درزی سے بچوں کی طرح بتایا سمجھا یا کرتی تھی مگر ان کی عادتیں راسخ ہو چکی تھیں۔ کوئی تیرہ توڑ تھیں، پندرہ سولہ برس تھیں۔ اگر بھادوچ کے کہنے سننے سے کسی کام میں باقہ ڈال بھی تو یا تو پورا کیا اگر کسی بھی توڑی بیدی اور لارہا سے خراب کر دیا۔ بخلاف ان کے ثرا جبین کو جب کبھی موقع ملتا وہ کچھ نہ کچھ گوشت و ہڈ پختی، پھول کٹا وغیرہ لے کیٹھنے کی کوشش کرتی۔ سلمہ

ستارہ ہندوستانی پر سے سینے بھادرج سے سیکھے۔ اکثر کھانے تو آستانی کے یہاں سیکھے تھے۔ مگر خیر النساء سے بھی جب موقع ملتا کچھ کچھ سیکھ ہی لیتی تھی۔ بھادرج باورچی خانے میں ہوتی تو آپ بھی چلی جاتی اور کہتی کہ آپ بیٹھ جائیں اور مجھے بتائیں میں پکاتی ہوں۔ کئی طرح کے کھانے خیر النساء نے نواب کے یہاں روشن آرا اور جمید خانوں کے ساتھ سیکھے تھے۔ آپ کل خیر علی صاحب کے پاس رو بہر تھا بافراط اکثر بیوی سے بچوایا کرتے تھے۔ خیر بایں خود جا کر شریک ہوتی تھی۔ بھادرج کو کام میں مدد ملتی تھی۔ وہ اس لئے خوش ہوتی تھی اور اسے پکانے کی ترکیب بتائی جاتی تھی۔ نماز کا نام ان کے گھر میں سولے حسن رضا اور خیر بایں کے کوئی نہ جانتا تھا۔ کلام مجید تو بھلا کون پڑھتا۔ خیر النساء کلام مجید اور دو چار رسائل کی کتابیں پڑھی ہوتی تھی۔ معمولی مکھ بھی لیتی۔ دھونی کے کپڑے ہوئے یا سودا سلف کی یادداشت ہوتی۔ بھوڑا بہت خط بھی لکھ لیتی تھی۔ نمازی پابندی تھی۔ جب تک کنواری رہی کلام مجید روزہ نماز صبح کے بعد پڑھتی رہی۔ یہاں آئی تو شروع میں وہیں سے شرم کے باعث نمازیں قضا ہوئیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح سیکھ جا کر چھپ چھپا کر پڑھتی رہی۔ جب چلنے پھرنے لگی تو میاں ایسے خیر تاشخص تھے کہ میری کو نماز یا قرآن پڑھنا دیکھ کر صل جاتے تھے۔ اکثر وہ نماز پڑھتی ہوتی یا قرآن کھولنے لگتی تو آپ بولتے

”بھئی یہ بڑی مشکل ہے ملائی صاحبہ تو وظیفہ کرتے ہوئے نمازیں پڑھتی ہوئیں، ہم باہر چلے کو میں کام کس سے کہیں“
 خیر النساء کہتی۔ ”صبح کا وقت تنگ ہوتا ہے، نماز قضا ہو جانے کے خوف سے میں کھڑی ہوئی تھی۔ دو رکعت تو ہوتی ہیں پھر پڑھوں گی۔ تم کو جو کچھ کام ہے۔ حقہ تو میں نے پھر کھا ہے۔ زورہ بھی بنا آتی ہوں“
 خیر علی منہ ہنا کر کہتے۔ ”عودوں کا نماز روزہ قرآن وظیفہ تو میاں کی خدمت اور گھر کا کام ہے اس سے فرصت ہوتی تو نمازیں بھی پڑھ لیں“

بیجاری دل میں افسوس کر کے چپ ہو رہی۔ اس طرح اس کی نمازیں صبح کی قضا ہونے لگیں۔ میاں سوتے ہوئے اور موضع مل گیا تو دو رکعت جلدی سے پڑھ لیں۔ ورنہ قضا ہو گئی۔ قرآن بجائے صبح کے ظہرین کے ساتھ پڑھتی تھی وہ بھی جب میاں باہر دھڑ بڑے۔ مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ سوتے وقت پڑھتی تھی۔ جو کار قضا سے آپ گھر میں ہوئے اور وہ نماز کو کھڑی ہوتی تو دو چار سنا دیں مگر اسے بھی نماز کی کچھ ایسی عادت تھی کہ ادا قضا وقت بے وقت پڑھ ضرور لیتی تھی۔ جب تک نماز پڑھے آرام نہ لیتی تھی۔ قرآن البتہ نافع ہو جاتا تھا جس کا بڑا افسوس تھا۔ صرف میاں ہی ہوئے تو جس وقت وہ باہر کا ملازمہ نہ جاتے تھے تو پڑھ لیتی تھی۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ اس بھی پسند نہ کرتی تھیں۔ اسے جس وقت موقع ملا اور قرآن کھولی بیٹھی تو سانس نے اسی جیٹی سادی۔

”توبہ اللہ تو بہ“ اللہ جو کسے وہی بکھرے۔ یا اللہ گناہ معاف یہ بڑی چیز و قرآن جس کا نام لینے بھی ڈرتا ہے اس کی ایسی نافذ رہی۔ جب دیکھو کھلا ہوا ہے۔ کوئی دیکھا ہوا، بیٹھا ہوا، سوتا ہو کیسی بے ادبی ہے۔ نہ وقت دیکھنا نہ ناوقت دیکھنا۔ اسے ٹھوڑا بھی کیا۔ بہت سا نماز روزہ، وظیفہ وظائف بھی نحوست کی نشانی ہے۔ اللہ کہتا ہے یہ بندہ مجھے بہت پکارتا ہے میں اسے اپنے ہی لائق کر لوں۔ اللہ بواہنا اسہاگ قائم رکھے اس عمر میں ایسا قرآن نماز کا کیا دھندلا ہے“

ان باتوں سے اسے سخت رنج ہوتا تھا مگر خاموش۔ یوسف رضائی عادت سے واقف تھی کہ وہ نماز کا بہت پابند ہے۔ اوصرف نند کی عادت سے پہلے ہی واقف تھی۔ اب تو ہر وقت کا ساتھ ہے۔ بہت کوشش ان عادتوں کے مٹانے کی کرتی مگر بے سود۔ نماز کی عادت بھی اسے بہت ڈالنی چاہی کیونکہ اسے معلوم تھا اور جانتی تھی کہ میں اس کی بڑی بہن ہوں مگر ہر وقت میرے اوپر نماز کی تاکید رکھتا اور پچھتا رہتا کہ آپ نے نماز پڑھی؟ ماں ہے تو ماں پر نماز کی تاکید رکھنا ہے اور بیچ پچھو تو اس تاکید سے مجھے اس قدر نماز کی عادت ہو گئی ہے۔ بیوی پر تو بہت ہی تاکید رکھے گا۔ اور بیوی کا یہ حال ہے جس کے ماں بھائی کا روزہ نماز کے پنے پر خیال ہے اسے کب نماز کی عادت ہوئی۔ اللہ ہی ہے جو ان میں بنے مگر پھر سوچتی تھی کہ آپ ہی درست ہو جائے گی۔ میکے کی بات اور مہوئی کے کسمراں کی اور مہوئی ہے۔

افسوس خیر النساء یہ کچھ سوچتی اور مزاج اور عادت میں زمین آسمان کا فرق دیکھ کر اس نسبت کے چھڑانے کی کوشش کرتی۔ خیر النساء تو ان سے محبت کرتی تھی مگر انہیں اس کی پرواہ نہ تھی۔ اکثر بایں بھادرج کی جوانی بہتری اور بھلائی کی ہونٹیں ان کو ناگوار کر رہیں۔ والدہ صاحبہ میں بھی عقل و اجہی سی تھی۔ اگر انصاف دیکھتیں تو انہیں ہوسے بہت آرام ہو گیا تھا۔ ادھر کھڑکی تو شکل ہی بدل گئی تھی۔ خرچ کی طرف سے بھی کشائش ہو گئی تھی۔ بیٹے کے دس روپے تھے تو ہبہ کے پندرہ تھے۔ سانس کے بیٹھے کوایک

پتنگ کھیل میں آدمی پتنگ پر بچھونا کر کے بچھا دیا تھا۔ پاس اپنے جہیز کا تخت بچھا کر اوپر درمی بچھا دی۔ نیچے گھاس رکھ کر چھٹی رکھ دی اپنی طرف سے بہتیرا سنگھڑا کر کئی نئی مگر ساس بھی خوش نہ ہوئیں۔

آفریں ہے خیر انسان کو ساس بیٹھ کر بڑا بھلا منہ دہنہ کچھ اشاروں کناروں میں سنا لیتی اور وہ آف تک نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت اچھا کرتی تھی۔ ساس کو جواب دینے اور تو تو میں میں کرنے کے بجائے خاموش ہو جاتی تھی۔ کئی دن، اون بھر ساس بہو میں بول جال بند رہتی تھی۔ خیر النساء خود ہی کوئی کہا نہ دھونڈو کو لے گئی تھی۔ میاں کی نظر میں کوئی قدر نہ تھی۔ ذرا اسی بات میں بے عزت کر دیتے تھے۔ ساس بھی اکثر بیٹھنے سے شکایت کرتی تھی۔ وہ ایسی اندھی صحت کے تھے کہ اگر دل میں ماں کی بات بیٹھ گئی تو پھر کیا تھا۔ بیوی کی شامت آگئی۔ کرید کرید کر لڑائی کے لئے بات نکالنے بہر بات میں پیس پید کر کے لڑائی کرتے اور جو خدا نے رسم کیا، بیوی پر مہر بان ہوئے تو انماں سے لڑنا شروع کیا۔ بہو وہ واجبات بھواس کچھ لگے۔ اکثر آپ کی چوچ پکار کر آواز سن کر یوسف ماں سے کہتا۔ آپ نے میری بات نہ سنی اور آپا جان کو کس عذاب میں پھنسا دیا۔ مانی جان میں وہ الگ شامی ہیں۔ ایک ایک سے شکایت کرتی ہیں۔ وہ الگ ذرا ذرا سی بات پر بگڑتے ہیں!

اتوار کا دن تھا۔ سب طالب علم اپنے اپنے گھر اسکو لڑوں اور کالجوں سے فارغ چھٹی کی خوشیاں مناتے ہوں گے۔ آج صحن بھی گھر بیٹھے۔ صبح آٹھ بجے کا وقت حسن رضا باہر کے دروازے میں کسی گری سوچ میں کھڑے تھے۔ پہرے سے پریشانی اور فکر کے علامات ظاہر تھیں۔ اتنے میں چھٹی رساں نے ایک خط دیا۔ کھول کر پڑھنے لگے۔

والسلام علیکم
مزاج شریف۔ آپ کا پیا یا خط ابھی ابھی مجھے ملا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اتنے عرصے بعد کس طرح ملا اور جواب میں دیر ہو جانے کے باعث پریشانی ہوں گے۔ دیر سے طبعی وجہ یہ ہے کہ میں مکان پر نہ تھا اور آپا میرا قیام ایک عکبر پر نہیں رہا۔ اس لئے آپ کا خط جب میں مکان پر آیا تب ہی مجھے ملا۔ یہ خط پارسی بہت خوش ہوا۔ اور بھائی جان سے ملا۔ آپ کی اور میری دونوں کی خواہش لاہور رہنے کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بوری ہو گئی۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ یہاں گورنمنٹ اسکول میں ایک عکبر خالی ہوئے والی ہے۔ ہمیں روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ امتحان دینے کے فوراً بعد آجا دیں۔ ہم معقول انتظام ان کے واسطے کر دیں گے۔ پیارے رضا آپ کو مکان وغیرہ کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میرے مکان میں اس قدر گنجائش ہے کہ میں اپنے پیارے بھائی اور بہن کو بھر اسکوں۔ پس آپ امتحان دے کر فوراً چلے آئیں۔ اس وقت جبکہ بھی خالی ہو جائے گی۔ اچھا اب ختم کرتا ہوں۔ یوسف رضا کو سلام شوقی۔

مبادا الفضال

یہ خط پڑھ کر رضا کو کس قدر خوشی اور اطمینان ہوا؟ اس کا اندازہ کچھ دیر کر سکتا تھا۔ فوراً گھر میں آیا اور بہن سے ذکر کیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ خط لے کر یوسف رضا کے پاس چلا گیا۔

سارے کنبے میں حسن رضا اور شریا جیدین کے اس قدر عقلمند ہونے کا سبب یہ تھا کہ انہیں بچپن سے تربیت اچھی ملی ورنہ یہ بھی ضرور ان ہی عادتوں کے ہوتے اگر والدہ کے ذریعہ یا بیٹے بہن بھائی میں کھیل کر بڑھتے پلتے۔ مگر ان کے نصیبوں کی باوری سے قریبا کی استانی احمد علی صاحب کے مکان میں جو بعد کو حامد علی کی نشاۃ نگاہ بن گئی، کرے پران کر رہی تھیں۔ یوسف رضا حسن رضا کی عمر ان دنوں کوئی چار سال کی ہو گئی اور ان کے والد کے شائق کے ساتھ دوڑوں کھیل کر رہے تھے۔ مگر استانی جن کا یہ اصول تھا کہ وہ بچوں کو باہر نہیں کھیلنے دیا کرتی تھیں کہ باہر نکل کر شرارت سیکھیں گے۔ ہوا غوری کو بھی صبح و شام کسی مشہور آدمی کے ساتھ بھیجتی تھیں۔ چونکہ دروازے کے ساتھ دروازہ ملا تھا اس لئے یہ بھی ان کے یہاں چلے جاتے تھے۔ ایک تو شکل صورت سے بھی بھولے بھالے پاسے لگتے تھے۔ دوسرے مکان کے نیچے سچو گروہ روک بھی نہ سکتی تھیں مگر چونکہ ان کے بچے کے ساتھ کھیلے تھے۔ اس لئے ہر ایک اچھی بری بات کی روک ٹوک مثلی اپنے روتے کے ان کی بھی رکھتی تھی۔ تھے قدرتی باری دونوں ذہین اس پر تربیت و تعلیم ملی۔ استانی عجمی جیسی لائق و عقلمند بی بی کی ہر وقت وہاں ہی رہنے سے ان کی سی ہی خوب سیکھی۔ بچپن ہی سے ان کی ہوشیار و متین ظاہر ہونے لگی۔ ان کی اچھی ماؤں

دیکھ کر انتر حسن و درویش اگر بھی ان سے محبت کرنے لگے اور انہیں کھیل کھانوں کے ذریعے ہی ابھی ابھی باتوں کی تعلیم دینے لگے بشتاق براہری تک کی تعلیم اپنی والدہ سے سیکھ چکے تھے۔ انگریزی بھی انھوں نے استاد کرکراستانی گھر ہی میں پڑھا دی تھی۔ ان کے ساتھ یہ بھی پراہری تک کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ جب وہ اسکول میں داخل ہونے لگے تو بوجہ انیت و محبت ان سے بھی کہا۔ یوسف کو تو عادیہ بھی تھی۔ رضابھی قند کر کے داخل ہو گئے۔ مدرسے کی تعلیم اور صحبت استانی کے لڑکے کی اور تربیت استانی ہی کی اور انتر حسن و درویش انرا میگ کی۔ بھلا پھر ان کی عادتیں کیوں نہ درست ہوئیں۔

شریاجین جب سہالی ہوئی تو حسن رضا ماشا اور اندر وں گیارہ سال کے تھے اور سمر اور غفل بھی ابھی رکھتے تھے۔ اسے بھی وہ استانی ہی کے ہاں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ استانی ہی تو گویا پارس تھیں کہ پیش جانے اور سونا ہوا کے عین چار سال کی عمر سے یہ ان کے پاس جانے لگی اور تمام تمام دینی وہاں ہی رہتی تھی۔ اس میں بھی وہی عادتیں اثر کر گئیں گھر میں تو حسن رضا اور یوسف نے جس طرح استانی کی تعلیم و تربیت دیکھی تھی اسے بتانے تو اب پچیس جاتی تو وہ بہن بھائی بھی علمہ ہی تربیت دیتے اس نے بھی ماں بہن اور بڑے بھائی سے مختلف ہی عادیہ سیکھیں۔ استانی ہی کے فیضان صحبت سے آٹھ نو سال کی عمر میں کلام مجید شرم کر لیا۔ نماز پڑھنے لگی۔ دیگر مسائل سے بھی واقفیت حاصل کر لی۔ اماں جان نے تو اقبال بیگم نام رکھا مگر اس کی خوب صورتی اور خوش سیرتی اور فرخندہ پیشانی کے لحاظ سے روشن آرا اور انتر حسن شریاجین کہتے تھے۔ سوائے ماں، بہن اور بھائی کے اور سب شریاجین ہی کہتے تھے۔ حسن رضا اور یوسف رضائے انٹر کا امتحان بھی دے دیا۔ افضال کے اس عرصے میں کئی خط بھی آئے تھے۔ اور کچھ دن بعد خیر علی صاحب کا تشدد درو زگار کے لئے شروع ہو گیا اور شریاجین کا بھی استانی ہی کے پاس جانا روکا جانے لگا۔ مجبوراً درو زگار بہن بھائیوں نے اپنے چلنے کا سامان سب سے پوشیدہ درست کر لیا۔ اپنا کل اسباب جو ساتھ لے جانے کے لائق تھا سنبھال لیا۔ آخر تاریخ روانگی بھی آگئی جس دن رات کے چار بجے کی گاڑی سے روانہ ہونا تھا یہ تینوں بہن ہی منوم تھے۔ رضا و یوسف کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانے کا سخت رنج تھا۔ کیونکہ تمام گھر میں ہی درو زگار ایک دوسرے کے مونس و مہینال تھے۔ بچاری شریا کو بھی بہن، بھائی ماں سے یوں یک دم جدا ہونے کا نہایت فتنہ تھا۔ سوچتی تھی کہ میں اپنی اماں جان سے علیحدہ ہو کر کس طرح رہوں گی۔ آیا جان اور بھائی جان و شاکر سے بھی چھٹ جاؤں گی۔ آیا جان جب وطن آئیں گے تو میں نہ دیکھ سکوں گی مگر افسوس کیا کرتی تعلیم کے شوق اور رضا کی محبت نے جو اسے سب سے زیادہ تھی چلنے پر مجبور کیا تھا۔ رضا کو وہ بہن بھائی ماں باپ سب سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس وقت تینوں ایک جگہ بیٹھے تھے۔ شریا تو اس وقت عمر کی پستی تھی۔ رضا و یوسف بھی نہایت افسردہ ہو رہے تھے۔

حسن رضائے انتر سے کہا "بھائی کیا بتاؤں دہلی چھوڑنے کا مجھے کس قدر افسوس ہے اور خاص کر اپنے ان عزیزوں کا جو اس وقت تک میرے حال پر مہربان رہے ہیں۔ پیارے یوسف آپ سے تو میں کسی حال میں جدا ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ بھائی جان، اماں جان و ابا جان کی بے مہربانی اور خیر بانی آئندہ زندگی کو ابھی طرح گزرنے کے خیال نے مجھے پیارے وطن، پیارے عزیزوں اور خدیجہ پیارے یوسف سے چھڑا دیا۔ کاش کہ آپ بھی کسی طرح لاہور جاسکتے اور ہم ایک جگہ رہتے؟"

یوسف رضا نہایت نگہیں آواز میں بولے۔ پیارے رضائیں اس وقت کا لڑکا ہی نہیں کر سکتا۔ رضا کی جدائی یوسف کے لئے نہایت سخت ہے مگر وہی ایک مجبور ہی جس کے ہاتھ میں نے خود ہی آپ کو اپنے سے جدا کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اب یہ دعا ہے کہ خدا آئے دن کو علمی و ہر طرح کی کامیابی عطا کرے۔ پیارے رضایا وہ ریجیدہ نہ ہوں۔ آپ کے رنج کرنے سے منفی شریا بہت ہراساں ہو گی۔ اس کو تسلی دینا چاہیے۔ "پیارے شریا تم رنج نہ کرو۔ خدا ایک دن وہ کرے گا کہ تم علمی کامیابی حاصل کر کے اپنے وطن واپس آؤ گی اور اسی لئے تم جا بھی رہی ہو۔ انشاء اللہ میں لاہور میں آ کر تم سے ملتا رہوں گا۔"



(باقی دسمبر کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

میں کیجی نہ قبول کی

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

گدا گروں کے منت نے بہانے اور بھیک مانگنے کے عجیب و غریب حربے اور طریقے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ایسے بہنے ستنے لوگ ان لوگوں کی راہ میں کانٹے بولتے ہیں جو واقعی ضرورت مند ہوتے ہیں ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا یہ انڈیا کی بات ہے ہوا لویں کو ایک عمر رسیدہ عورت جو بہت غصہ حامل نظر آتی تھی بدن پر چھتیرے لٹکا کئے بال بھرائے روتی پتی آئی اور کہتے ہی بلند آواز میں بین کرنے لگی۔ میں برآمد ہوئی، میں بیوہ ہو گئی، امیر انشو ہر مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا، گھر میں بھوت کوڑی بھی نہیں ہے کہ کفن وقف ہوسکے میری مدد کو دے غرضیکہ جتنے بھی جذباتی قسم کے حملے وہ بولی سکتی تھی بولے اور ایسی دردناک اور رقت آمیز منظر کشی کی کہ سب لوگ متاثر ہو گئے اور اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گئے۔ بڑھیا کی حالت واقعی قابل رحم لگتی تھی اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا شوہر کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ اسی اثنا میں ہمارے ماموں بھی ان پہنچے اور قس دیتے ہوئے کہا: بھیکہ راؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چل کر تدفین

کا سارا بندوبست کر دیتا ہوں۔ وہ عورت جو چند لمحے پہلے دار و قطار اور دلخراش انداز میں رورہی تھی ہرنا دھونا سب بھولی گئی اور شہناک ماموں کی شکل دیکھنے لگی پہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ مرنے لگا کر بولی۔

’نہیں نہیں بابو جی تم میری جھوٹی مری میں کہاں جاؤ گے۔‘

میں خود ہی پڑوسیوں سے سارا انتظام کرالوں گی۔

مگر ماموں اس کے ساتھ چلے کر بلند تھے۔ نجانے کیوں انہیں یہ شک ہو گیا تھا کہ یہ عورت جھوٹ بولی رہی ہے جب ہی تو انھیں ساتھ لیجانے سے مترادف ہی ہے۔ آخر خاصی پس و پیش کے بعد عورت انھیں ساتھ لیجاتے پر مادہ ہونی مگر خاصی بکھلائی ہوئی تھی۔ ماموں نے چپکے سے اپنے ہاتھ میں ایک ٹوٹی لے لی۔ اور اس عورت کے ہزارہ شہر کے مضامات میں ایک جھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ بڑھیا انھیں باہر روک کر اندر چلی گئی اور تھامی دیر بعد وہ باہر آئی۔ اس کے پہرے پر بھگہر اہٹ اور پریشانی نمایاں تھی۔ ماموں کو لیکر اندر آئی۔ سامنے ہی جھلکے گا چارپائی

ہراس نے شوہر کی میت بڑی تھی عورت گم گم جا کر میت کے سر ہانے کھڑی ہو گئی۔ ماموں نے چاروں طرف جھڑکاکا کر میت کا جائزہ لیا اور پھر سر ہانے جا کھڑے ہوئے اور میت پر بڑی چادر کا ذرا سا کونا اٹھا کر دیکھا اچانک انھیں غمگس ہوا جیسے مرنے نے انھیں جھکی ہیں اور ان کے قریب آتے ہی بند ہو گئیں۔ انھوں نے پلٹ کر عورت سے پوچھا۔

’اے مرے مرے کتنی دیر ہوئی ہے؟‘
جواب میں عورت نے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ماموں میت کے پانچویں جا کھڑے ہوئے اور عورت کے اس طریقے پر ہاتھ پیرا اور ہاتھ میں بڑی ہوتی سوئی چھپوادی۔ دوسرے ایک لمحے مر وہ بھلا کر اچھل کر کھڑا ہو گیا یہ دیکھ کر عورت کا کوزہ گم سفید ہو گیا چہرے پر ہوا سناں اڑنے لگیں۔ اسنے قطعی امید نہ تھی کہ اس طرح اس کا بول بھولا جائے گا یہ دیکھ کر ماموں کو طیش آ گیا آگے بڑھ کر انہوں نے مر کو گریبان پڑ لیا اور سختی سے بولے کہ شور مچا یا تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ سچ بتا یہ عورت تیری کون ہے؟

مرد کھکیانے لگا وہ تھوکر کا پڑا تھا۔ چیخ پکار مٹن کر ختم والے اکٹھا ہو گئے۔ سب یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ماموں نے انھیں سارا قصہ کہہ سنایا سب نے عورت اور اس کے ساتھی کو خوب لعنت ملامت کی اور بتایا کہ اس عورت کا شوہر تو تانگہ چلاتا ہے۔ یہ مرد تو اس کا کوئی رشتہ دار ہے جو اس عورت کے ساتھ مل کر ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ اس عورت کا شوہر اسے کئی بار پیٹ چکا ہے مگر یہ ڈھیٹ اپنی حرکتیں نہیں چھوڑتی ہے۔

مرد ہاتھ پر جوڑا ہوا تھا اور منت سماجت کر رہا تھا اُسے پولیس کے کالے ننگے پا جاسے وہ آئندہ اس عورت کے بہکانے میں نہ آئے گا۔ وہ عورت بھی منت سماجت کرنے لگی پولیس کا نام سن کر۔ دونوں کے معانی مانگنے اور پڑوسیوں کے کہنے سننے سے ماموں سے انھیں چھوڑا۔ اس سے پہلے یہ عورت نجانے کتنے لوگوں کو بدوقت بنا چکی تھی۔ مگر آج اپنے بنائے ہوئے حال میں خود ہی پھٹس لگتی تھی۔

سلاجہ جبین دارنی (جھڈو)

جہیز

گھر و دربارت لے لیا جہاں ایک ایسی لڑکی بارات کا انتظار کر رہی تھی جس کے نصیب کا درہ بند تھا۔ لڑکی کا نام مہر ہو گئی تھی۔ ان بڑھ اور جاہل تھی۔ بد دماغ اور چہرہ چمک زدہ تھا۔ خواہجہ بھائی تھی نہ خوب سیرت بل ان کے کچھ تھا تو وہ پیہ پیہ تھیں لڑکی کو کہ اس کا باپ رات کے اندھیرے میں کاروبار کرتا تھا دوسرے الفاظ میں ملک کا غدار اور منکر تھا اور وہ پیہ پیہ کی دہان کی تھی، بس اچھے رشتے کی کمی تھی سو آج اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک لڑکی کا نصیب برباد کر کے اپنی بیٹی کے نصیبوں کو جگایا۔

یہ سب کچھ کئی لوگوں نے دیکھا مگر کوئی لب و لہجہ نہ کر سکا کہ اس جہیز نے بہت سے گھر برباد کئے ہیں یہ تو ایک سچی اور چھوٹی سی شرم دیدہ بات تھی مگر اب بھی کئی گھرانے خاص طور پر متوسط گھرانے کے معصوم اور بے زبان لڑکیاں صرف اس بہیز پر ہونے کی وجہ سے بڑی طرح ہمتیں باندھ کر تارباؤں میں پھنسنے لگے ہیں مگر ان کے نصیب کا پاند نہیں چکنا چٹا یہ ہیں یہ واقعہ کبھی نہ بھلا سوں اب یہی جہیز کبھی نہیں بدشادی ہوتی ہے تو میری نظروں میں اس شادی کا ہرگز نہ نظر آئے گا سنا ہے زندہ ہو جاتا ہے اور میرے ان بچے پورے اور لالچی لوگوں سے نفرت ہونے لگتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ان وقتی خاندانوں کو بھی بیٹیاں دے دیا کرتا کہ انھیں بھی احساس ہو کر بیٹی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔

شمس از فیضی۔ کراچی ۳۷

خواتین ڈائجسٹ کے شمار

خواتین ڈائجسٹ صرفیات کی ہے جس میں ہر شمار کا شمار ایک شمار ہے

پہلے سال ۱۹۰۲ کے شمارے	۲۵ روپے
دوسرے سال ۱۹۰۳ کے شمارے	۳۶ روپے
تیسرے سال ۱۹۰۴ کے شمارے	۳۶ روپے
چوتھے سال ۱۹۰۵ کے شمارے	۴۰ روپے
پانچویں سال ۱۹۰۶ کے شمارے	۴۰ روپے
چھٹے سال ۱۹۰۷ کے شمارے	۴۰ روپے
ساتویں سال ۱۹۰۸ کے شمارے	۶۰ روپے
آٹھویں سال ۱۹۰۹ کے شمارے	۶۰ روپے
نویں سال ۱۹۱۰ کے شمارے	۸۰ روپے

نوٹ: اس کے علاوہ اگر آپ کوئی شمارہ چاہیں تو اس سے بھی کم ہو۔
تورہ فی سے مستحق مکتوبین

سرکولیشن مینجر خواتین ڈائجسٹ اردو بازار - کراچی

کچھ عرصے پیشتر کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک عزیز کے پڑوس میں شادی تھی اتفاق سے ہم بھی وہاں گئے۔ سوکے تھے لیکن شادی کے گھر کے پڑوس میں۔ کئی روز پہلے خوب ڈھولک کی تھاپ پڑ گئی تھی۔ لڑکی بڑی خوبصورت اور اعلیٰ سیرت کی تھی، متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لڑکی کا باپ سرکاری ملازم تھا۔ لڑکی اکلوتی تھی کس کا بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جگر کو تنے اور دل کے ٹکڑے کو کیا کچھ نہ دیں خیر لڑکی کے والدین نے بساط بھر جو کچھ مہیا ہو سکا جہیز میں دیا۔ مہندی اور مایوں پیسہ تمام رسمیں ہوئیں نکاح کا دن بھی آ پہنچا۔ بارات باپے وغیرہ اور حصولِ ڈھولک کے ساتھ دلہن کے دروازے پہنچ گئی۔ بارات کو عزت کے ساتھ شامیانے میں پہنچایا گیا اور پھر نکاح کا وقت آ پہنچا نکاح سے پہلے دولہا خالوں نے ایک قبرست بنا کر اندر دلہن خالوں تک پہنچا دی جس کا ارکان تک تھا، قبرست میں درج تھا کہ ہمیں تو کچھ نہیں چاہیے بس لڑکا کا لقمہ ہے کہ بہیز میں کار اور فرج ہو کر نہ ہو تو اگھر پھر گزرا ہو جائے گا دل البتہ لڑکے کو ملک سے باہر کسی خلیج میں پھینچوانے کا بندوبست ہو سکے تو بہتر ہے اگر نہ منظور ہے تو نکاح نامہ حاضر ہے ورنہ بصورت دیگر.....

لڑکی کے والدین پر یہ اچانک حملہ ہوا اور لڑکی کی والدہ بے ہوش ہو گئیں لڑکی عقلمند اور ذہین تھی اس نے یہ سب کچھ دیکھا اور باپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ غلط قسم کے ہیں آج یہ کہہ رہے ہیں کل کو نہ جانے اور کیا کچھ ہیں آپ انکار کر دیں۔

یہ مولوی صاحب اور باراتی نکاح کے لئے شوریہ ہے تھے اندر یہ افتادہ بھی تھی۔ باپ نے اپنی پگڑی تک دولہا کے باپ کے قدموں میں رکھ دی اپنی عزت اور برادری کا واسطہ دیا، رویا اگر کوئی لڑکی ان ظالم خاندانوں پر جو اس وقت خدا بنے بیٹھے تھے ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ اور جب دولہا کے باپ نے بارات کی واپسی کا اعلان کیا تو اچانک ان میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اس نے کہا کہ آپ کے مطالبات میں پورے کروں گا بارات واپس نہیں جائے گی بلکہ میرے گھر جائے گی اور میری بیٹی کی ڈولی لے کر جائے گی۔

اور دولہا کا باپ اکڑتا ہوا اپنا شملہ جو کلفت سے اکڑا ہوا تھا اسے اونچا کرتا ہوا لڑکی والوں کی عزت روندتا ہوا چند

غزل

دیکھی جو اپنی طلب کی یہ جنوں خیزی
تو پھر ترے سونک سے شرمندگی نہ رہی
وہ اترے دل میں درد کے دریا کہ پھر
امیدوں کے چاند میں تابندگی نہ رہی
تجھے جو کھویا تو دل کے دلوے بھی کھو بیٹھا
یوں توجہ رہا ہوں مگر وہ زندگی نہ رہی
وہ بھی تھا ازل بہت تیرا رہا ہے
اور اب یہ کہ کرم میں بھی شکستہ کی نہ رہی
ایچ آر

غزل

چھپا ہوا مرا ہر اضطراب رہنے دو
کہ پڑھ چکے ہو بہت اگلا باب رہنے دو
سفر کا ساتھ یہ منزلوں کا ساتھ نہیں
گزر رہی جائیں گے لمحے صاب رہنے دو
شکستہ کمر کے انہیں فاصلے بڑھا دو گے
سجھے ہوئے مری آنکھوں میں خواب رہنے دو
یہ خامشی بھی مہتاری اتنا کا پردہ ہے
سوال کرتے رہو اور جواب دہنے دو
ہر ایک بات کا الفاظ کیوں حوالہ نہیں
سو اس کتاب کو بے انتساب رہنے دو
فاطمہ حسن

غزل

اؤ نا آج ہم بھی کوئی گفتگو کریں
دامن کیا ہے چاک جو اس کو فرو کریں
اس جستجو کے ہاتھوں بہت جلد تو مٹے
سو چاہے اب نہ ہم کوئی آرزو کریں
تہیں اپنی ذات پر ہے اتنا گھمٹا کیوں
اک بار تو آئینے کے روبرو کریں
قسمت میں گر نہیں ہے صبح ہمارے
پھر کیوں بھلا ہم روشنی کی جستجو کریں
دل کا لہو کیا ہے بہا رہے ہے نہ مرنے
آؤ کہ اب تو مل کے ہم تم وضو کریں
پاکیزگی کے فائدہ کو پھیلا رہے ہیں ہم
اس نور کا اجالا چہرہ سوا کریں
بے فائدہ ہیں آتشو بہکا جب ہیں آہیں
ہم اپنی حسرتوں کو کیوں کر ابھو کریں

شکستہ ظفر، چہرہ لاہور

ناگزیر

جب جلے تازہ شکوفوں کا جمال
جب دگ ہوں سے جھلک اٹھے دلوں کی حالت
جب قدم بھی کشش منول جاناں کھودیں
دل و عشق کبھی اور اک کی انگلی پکڑے
راستہ ڈھونڈنے لگے تو تماشا بن جائے
زیر امکاں سے گریزاں ہو ہر ایک خواب دنیا
جب فنا صدف غم میں ہی محصور رہے
جب مقدس شب دیہ سجور رہے
جب کہ دیوانے نہ ابھیں کبھی زنجیروں سے
شہر طوفان کی آواز ہو گا

کشور نہ ہید

بے رنگ

محبت کے جانے کتنے -

روپ ہیں
البدلے شوخ رنگ ہیں
لیٹن
جانے کیوں ،
کبھی کبھی ،

اپنوں کی چھاؤں میں
بے رنگ ہو جاتے ہیں

نہت جبیرے شفق

یہ اُداسی یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پکھلتے

بیٹھے بیٹھے کیسا دل گھبدا جاتا ہے
جانے والوں کا جانا یاد آ جاتا ہے
بات چیت میں جس کی روانی مثل ہوئی ہے
ایک نام لیتے ہیں کچھ رُک سا جاتا ہے
سہنتی بستی راہوں کا خوش باش مسافر
روزی کی بھٹی کا ایندھن بن جاتا ہے
دفتر منصب دونوں ذہن کو کھالیتے ہیں
گھر والوں کی قیمت میں تن رہ جاتا ہے
اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آجائے تو وقت گزر جاتا ہے

مل گیا تھا سکون نگاہوں کو
کی تمت تو اشک بھر آئے
گل ہی الٹا گئے ہیں گلشن سے
باغباں سے کہو نہ گھبراؤ
ہم جو پہنچے تو رہ گزر ہی نہ تھی
تم جو آئے تو منڈیلیں لائے
جو زمانے کا ساتھ دے نہ سکے
وہ ترے آستان سے لوٹ آئے
بس وہی تھے متاع دیدہ و دل
جتنے آنسو مرہ تلک آئے

زہرا سنگاہ

زہرا سنگاہ

رنگارنگے

پیشہ ، لطیفہ ، واقعات ، امتحانات

ویٹر

دوپہر کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ ان نادلوں سے
نوزائیدہ بچوں کے یسے نام رکھنے میں بھی آسانی ہو
جاتی ہے۔
(رضیہ فیض احمد)

اپنے بچوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مستقبل
میں کسی پیشہ کے ویٹر بنیں گے۔ جب بھی میں انھیں بلاتا ہوں
وہ کبھی نہیں آتے۔

عورت

مشہور دانشور فریڈ سے کسی نے پوچھا "ذیاب کی کتنی
عورتیں شادی کی خواہشمند ہوتی ہیں؟"
فریڈ نے جواب دیا "۹۹ فیصد"
پوچھنے والے نے دوسرا سوال کیا "اور ایک فیصد کے
بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟"
فریڈ نے مسکرا کر جواب دیا "وہ جھوٹ بولتی ہیں"

تلاش

مرزا غالب ایک روز کسی سے کہنے لگے "کیوں صاحب
ہم تو مرد ہیں ہمارا نماز پڑھنا ٹھیک ہے۔ ہم نماز پڑھتے
ہیں تو اس لیے کہ عوریں ملیں، غلام ملیں یہ عورتیں آخر کیوں
نماز پڑھتی ہیں انھیں کس کی تلاش ہے؟"

بچے

ایک بچی اپنی استانی کو بتا رہی تھی۔
"میری مٹی کو بچے پلنے بالکل نہیں آتے"
استانی نے حیران ہو کر پوچھا "تھیں کیسے پتہ چلا؟"
"جب میں پوری طرح جاگ رہی ہوتی ہوں تو وہ مجھے
بستر میں لٹا کر تھپکتی رہتی ہیں اور جب میں گہری نیند میں سوئی
ہوتی ہوں وہ مجھے اٹھا کر بٹھا دیتی ہیں"

کون

کھڑکی کی بار ایک جھری سے کون یہ مجھ تک آئے
جسم چرائے، نین بھٹکانے خوشبو باندھے اپنی میں

نئی آنکھ کا پرانا خواب

آتش دان کے پاس
گلابی حدت کے ہالے میں سمدھ کر
تجھ سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بھی تو ایسا لگا ہے
جیسے اس میں بھیگی گھاس پہ
اس کے بازو تھلے ہوئے
میں پھر نیند میں چلنے لگی ہوں

معاشرتی ناول

جن نادلوں میں عورتوں کے کپڑوں، زیور اور رسموں
کو لکھ کر ہوا انھیں معاشرتی ناول کہا جاتا ہے۔ ان کے پڑھنے
سے عورتوں میں عمدہ کپڑوں کا عمدہ مذاق پیدا ہوتا ہے اور

موت سے پہلے

ایک بوڑھا شخص شفیق علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور
کہا "میں نے بہت گناہ کئے ہیں۔ میں توبہ کرنے آیا ہوں"
فرمایا "تم بہت دیر سے آئے"
بوڑھے نے کہا "میں جلد آیا ہوں کیونکہ جو شخص موت
سے پہلے آجائے اسے جلدی آنا سمجھنا چاہیے"
آپ نے یہ سن کر کہا "تم نے خوب کہا اور خوب
آئے"

اچھی باتیں

مظلوم کی بددعا سے ڈر کیوں کہ اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔

اپنی جانوں، اپنی اولاد، اپنے خدام اور اپنے مال کے حق میں بددعا نہ کیا کرو۔ ایسا اتفاق نہ ہو جائے کہ وہ گھڑی اجابت کی مواد تمہاری بددعا قبول ہو جائے۔

اوپنی آواز سے بکیر نہ پڑھو کیونکہ تم کسی بہرے یا غیر حاضر شخص کو نہیں پکارا رہے۔ تم اس کو پکار رہے ہو جو سنا ہے دیکھتا ہے اور ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ مانگا جائے اور تم کے دور ہونے اور آسائش حاصل ہونے کا انتظار کرنا بہت اچھی عبادت ہے۔

بھوٹے پنسنے

روہیہ نمک شوروکوٹ

ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کمرۃ ارض پر

سب انسان امیر ہو گئے ہیں۔ یعنی سب نے مل کر ایک گھر کی عمری آپس میں بانٹ لی ہے۔ وہ ایک جھوٹا پنسنہ تھا۔ لیکن یہ جھوٹے پنسنے مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہی میرا گھر یہی میری محبت، میری زندگی اور اس کا حاصل ہیں۔ میں ہرگز ہرگز کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میری کل کائنات یہ جھوٹے پنسنے ہیں۔ (کرتشنے چندر)

رانگ نمبر

نغمہ نابٹ، وزیر آباد

قمت آزمائی کی دھن میں ایک لڑکے نے ایک ٹیلی فون بزم لاکر دوسری طرف سے رسیو درٹھانے پر کہا۔
"ہیلو! آپ اس وقت کیا کر رہی ہیں؟"
جواب ملا "مناڑ پڑھنے کی تیاری"
نوجوان جلدی سے بولا "سوئی رانگ نمبر؟"

تنہا بیوی کی سوچ

اے مصدوب میں مجاؤں

ہجر کے صدمے بہت بہت

تو غم پر ایک احسان کرنا

میری آنکھوں کے کینوس پر ان کی سند صورت بنا کر

میری تار یکا یک قبریں لٹکا دینا

کہ انتظار میں ایک جنون تو بیٹا

قیامت جائے کب آئے؟

بچھیری قسم میں ان کی تصویر

سینے سے لگائے

حشر تک ان کی راہ دیکھتی رہوں گی

موت کا ڈر

ایک مقرر چھپ کر ملاقات ایک جوان سال بھر سے ہو گئی۔ بوڑھے چھپے چھپے کہا۔

"میاں تم بڑے اچھے دنوں میں پیدا ہوئے ہو، ہماری زندگی تو درود کے گزری ہے۔"

جوان بچھر نے اس طعنے کا برا منایا اور غصے سے کہا۔

"تمہارے زمانے میں تو لوگوں نے ایک کوہن کا نام

سنا تھا۔ لیکن ہمارا زمانہ ہے کہ کائنات دانوں نے ہمارے لیے

بے شمار زہری دواہیں بنائی ہیں۔"

بوڑھا بچھر مسکرایا اور جواب میں بولا۔

"مرنا تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن تمہارے یہ تو مزے

ہیں کہ مردوں نے امریکیوں کی بنیان مناسرتیں پنہنا شروع کر دی

ہیں اور عورتیں آدھی آستینوں کے پیچھے سے کھٹے ہوئے گئے

پہنتی ہیں جہاں جی چاہے کٹ لو، جس حصے پر چاہو چھ جاؤ

بھٹیا جہاں روزی کی ہتھات ہو وہاں موت کا کیا ڈر۔"

چچکیاں

اس کے کتے نے اس کی ساس کو کاٹا وہ نولہ کتے کو

دندان ساز کے پاس لے گیا دانت نکلوانے نہیں، دانت

تیز کرانے۔

اس جگنو کی موت کتنی بھیا ناک ہے جو اندھیرے میں

جلنے سگریٹ کو مادہ سمجھ بیٹھا۔

شادی اس طویل دعوت کا نام ہے جس میں ٹی ٹی ٹی

پہلے کھائی جاتی ہے۔

شادی شدہ مرد ایسی کار ہو جاتا ہے جسے عورت پوری

رفتار سے دوڑا رہی ہو۔

لوگوں کا ججافہ ان کی ہٹری مرتب کرتا ہے۔

جگہ

ایک بڑے مجمع ہے ایک مشہور و معروف لیڈر خطاب

کر رہا تھا۔ پر جوشِ تقریر کرتے ہوئے اس نے گھوم کر وہیں پہنچ دیکھا اور دریافت کیا: ”کیا میری آواز آپ لوگوں تک پہنچ رہی ہے؟“

”جی نہیں“ جواب ملا۔ ہم لوگ آپ کی تقریر کا ایک لفظ نہیں سنی سکے۔“

اچانک بابی صاحب کا ایک شخص کھڑا ہو کر بولا: ”ادھر پوری تقریر صاف سنائی دے رہی ہے ایسا کہ وہ تم یہاں آ جاؤ میں بخاری جگہ بیٹھتا ہوں۔“

ایک شعر
نمیدہ بٹ، واکریٹ
رات بھل میں تیری ہم بھی کھڑے تھے چٹکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

ایمان
حضرت حسینؑ سے کسی نے پوچھا کہ ”حضرت ایمان کیا ہے؟“
آپ نے فرمایا: قول، عمل، نیت اور سنت۔ یہ ایمان کے اجزاء ہیں۔ اگر ایمان کا ذمہ داری بغیر عمل کے ہو تو یہ کفر ہے۔ اگر قول اور عمل بغیر نیت اور اخلاص کے ہوں تو یہ نفاق ہے اور اگر قول و عمل اور نیت سنت کے مطابق نہ ہوں تو یہ بدعت ہے۔

شگوفہ
خدیجہ یامین کراچی
کلاس میچر نے ایک بچے کے گھر رپورٹ بھیجی آپ کا بچہ لڑکیوں میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتا ہے مگر آپ فکر نہ کریں اس کی یہ عادت چھوڑنے کے لیے میں ایک ترکیب آزمادہی ہوں۔“

بچے کی ماں نے رپورٹ دیکھنے کے فوراً بعد کلاس میچر کو ایک خط بھیج دیا۔ جس میں لکھا تھا: ”اگر آپ کی ترکیب کامیاب ہو جائے تو مجھے بھی بتا دیجئے گا۔ میں اسے منے کے پاپا پر آزمادوں گی۔“

تیری ہنسی کے گلابوں کو کوئی چھو نہ سکا
صبا بھی چند قدم ہی گئی پلٹ آئی

”کتنا صبح چہرہ کتنی سیاہ زلفیں
آج تو چھپیلے ہوئے آئینہ لا سمیٹے ہوئے تھامیں۔“

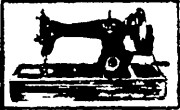
حیاتِ دل

بازوق خواتین کی پسند
ہم سب کی پسند
گھر گھر کی ضرورت
عمدہ اور پائیدار

قادری سلائی مشین

اور

اسٹیل فریئر



اسٹیل کی لارائن
مات فین، ریلو
کھینٹیں گیس کے خزانے

قادری سلائی مشین
اینڈ

اسٹیل ورکس

پریڈی اسٹریٹ، صفا سنگھ لاجی

فون ۵۱۳۷۶۶

قادری کے کارڈز
گلزار مارکیٹ۔ ٹیلیفون: ۵۳۶۱۱

ہم دونوں کا
درد تو ایک ہی ہے

عجیب رسم

مراکش کے ایک قبیلہ میں ایک انوکھی رسم ہے۔ وہاں شادی کے موقع پر مذہبی رہنما ایک تیز دھار چاقو دھن کی گھرن پر رکھ دیتا ہے۔ جب دھن کے گلے سے خون کا ایک قطرہ ٹپکتا ہے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اس رسم کا مطلب دھن کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ اب شوہر کے رحم و کرم پر ہوگی۔

ڈرپوک ہاتھی

برطانیہ کے ایک چڑیا گھر میں چھ ہاتھی ہیں۔ چوب رات کو انھیں بڑے بڑے کدوں میں بست کیا جاتا تھا تو وہ باہر نکل آتے تھے۔ ایک دن جانوروں کے مہار نے ایک عجیب ترکیب سوچی۔ اس نے سوچا ہے منگو اک کر کے کی دیواروں پر چاروں طرف پیروں میں رسی ڈال کر بٹھائیے جب رات کو ہاتھیوں کو کمرے میں بند کیا گیا تو انھیں دیوار توڑنے کا خیال آیا لیکن جب وہ دیوار کی طرف گئے تو وہاں ایک اور سی مخلوق بیٹھی نظر آئی۔ ہاتھی حیران ہو کر دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہوئے کہ دیوار توڑنا ہی بھول گئے۔ صبح جب ملازمین نے دیکھا کہ ہاتھی ہمے ہوئے ایک دوسرے کے منہ میں منہ دے کر ایک ہی جگہ پر سہمے کھڑے ہیں تو انھیں ہنسی آئی۔ ہاتھیوں پر سوچوں کا اتنا خوف بیٹھ گیا تھا کہ انہیں دروازے سے باہر لانا بھی مشکل ہو گیا۔ اب اس چڑیا گھر میں ہاتھیوں کے کمرے کی دیواروں پر مصیبتی چھپے بیٹھے ہیں۔“

خواب

شہمی بٹ، وزیر آباد
جب بزم شیں، مجبوریاں، زمر و راج اور امیر میٹھی
دو دلوں کے درمیان دیوار بن جائے تو پھر خواب ہی دید کا
ذریعہ بنتا ہے اور یوں ہر قسم کی دیواروں، کے حائل ہونے کا
باوجود دو دلوں کے ملاپ کو نہیں روکا جاسکتا۔

میںڈکوں کی بارش

انیسویں صدی کے آخر میں مغربی انگلستان پر میںڈکوں کی

ماہر تیر انداز

دنیا کے ماہر تیر انداز ٹرا سکن میک کیو کے باشندے ہیں وہ تین فٹ کے فاصلہ پر پڑے ہوئے گندم کے دانوں کو آسانی سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔

چندر کمر کی راتے، اپنی بیویوں کے بارے میں

- ۱- میری بیوی میری وکٹ کیپر ہے۔
- ۲- میری بیوی ہمیشہ ”مین آف دی بیچ“ رہتی ہے۔
- ۳- میری بیوی میری فائنل ٹرائی ہے۔
- ۴- میری بیوی سے ابھی روالی کنٹری کوئی اور نہیں کر سکتا۔
- ۵- میری بیوی بہترین چھکاماری ہے۔
- ۶- میری بیوی، میری اول، میری لارڈز، میری لشر۔
- ۷- میری بیوی میرے دل کی کپتان ہے۔ ایسی کپتان جو ہمیشہ ہر ٹاس جیتتا ہے۔
- ۸- میری بیوی اس سچری کی بہر ہے۔
- ۹- میری بیوی ذرا ذرا سی بات پر بیک ٹو پلین (میک) جانے کی دھمکی دیتی ہے۔
- ۱۰- میری بیوی ہر گھنگوٹیں اور پنگ شیشیں مہتی ہے۔
- ۱۱- میری بیوی میری ایمپائر ہے جو میری ذرا ذرا سی غلطی کو نوٹ کر سکتی رہتی ہے۔
- ۱۲- میں اپنی بیوی کو باتوں کے باؤں سے کھلانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا کیونکہ مجھے علم ہے کہ وہ میری ہر بات پر ایک زوردار چھکامار سکتی ہے۔
- ۱۳- میری بیوی سے باتوں میں جیتنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی وکٹ کر کے بغیر بیچ جیت لینا۔

اے چاند

ترے سینے میں بھی کسی کی
بے وفائی کے داغ ہیں
اور میرا دل بھی
کسی کے درد سے
داغ دار ہے۔

تو پھر آ

باہم مل کر رو لیں



حالات کی طائری

رخسانہ شائین روپ

کی ڈائری سے

سنو ابھی ابھی میں نے
جنگل کی خوشبو کو اپنے اوپر بستے سوچا ہے
سب جھاڑیاں — درخت طویل ٹہنیوں والے گھنے
درخت میرے اندر ڈاک آئے ہیں، ایسا گھپ اندھیرا ہے کہ مجھے
تمہارا ہاتھ پاؤں کو چھون مشکل لگتا ہے
ٹھہرو! — شاید تم اپنے وجود سے اس جنگل میں روشنی

بکھیرنا چاہتے ہو۔

مگر مجھے بیٹی سے ملنے والی تاریخ کی روشنی نہیں چاہیے
تم صبح ہونے سے پہلے اس جنگل سے نکل جانا چاہتے

ہو۔

تمہیں نہ ہونے والی چیزوں کا خوف ہے۔
تمہیں روشنی چاہیے — میری محبت کی — میری حرارت کی
لو چلو — میں اپنی ہڈیوں کی نافرمانی سے روشنی
کئے دیجی ہوں۔ تم لو پچھتے نہ کہ اس جنگل کو چھوڑ کر پہلے ہو گے۔
مگر جو مجھے مت دیکھنا — ورنہ پتھر بن جاؤ گے۔
اس لئے کہ میں ریت بنی تمہیں اپنی ذات سے نکلتا دیکھتی

رسوں گی

سورج مکھن کے پھول کی طرح!

ایک آرزو

کی ڈائری سے

میری ڈائری میں کئی احمقوں کی یہ نظم جو مجھے بہت پسند
ہے۔ آپ کی نظر لڑائی ہوں۔
یہ میری عزت میں یہ میری نظیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں

یہ شعر تیری شرمکاتیں ہیں
میں سب تیری تذکرہ کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں
جو زندگی کے سفر میں
مجھے کسی وقت یاد آئیں
تو اک اب رت بنی اسٹے گا
پہن کر انفاس کی قبائیں
اواس تہنا پیوں کے نموں میں
ناجی انہیں کی یہ اسپرانیس
مجھے تیرے درد کے علاوہ کچھ
اور دکھ تھے یہ ماننا ہوں
ہزاروں غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درو کی ریت چھانتا ہوں
مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگ بناتی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آواز سوراخ لگتا بنی ہے
یہ درد ووج صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے
اور اب یہ ساری متاع رشتہ
یہ بھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوے یہ ٹکڑے کے ٹکڑے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تیری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں
وہ تیرا شاعر ترے امنی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خدا نہ تھے
اور داد میں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی

خود اس کے اپنے نصیب ہی تھیں
نہ چھپا سکا کہ وہ دیوانہ
بہت دلوں کا اجڑ چکا ہے
وہ کو کہن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے۔

روبینہ مریم

کی ڈائری سے

میری ڈائری کا ایک ورق
ہم نے دیکھیں کئی آنکھیں
نیل جیسی گہری آنکھیں
سبز، سنہری، کالی آنکھیں
ہنسی، ہلکی، ہر دلی آنکھیں
سوچتی، کھنکھتی، مٹوالی آنکھیں
لیکن تیس چوٹ لگی ہیں
ایک نظر میں ایک ہی بل ہیں
آج بھی ان آنکھوں کو ڈھونڈ رہے ہیں
دنیا کی اس بھٹی میں لیکن
اب جانے کہاں ملیں گی ہر کو
وہ چاندنی روشن غزالی آنکھیں

شیم بٹ

کی ڈائری سے

یاد رکھ کے تو میرے پیار کو روتا ہو گا
چاند بٹ تیسے رنگن میں اترتا ہو گا
یونہی مڑھ جائے ہو گئے مہلتے گھرے
جانے والا نہ لوٹ کے آ گیا ہو گا
جو میرا نام بھی لیتا تھا دعاؤں کی طرح
سوچتی ہوں مجھے سب طرح سے بھولا ہو گا
چاند ہر گھر میں ہے ہو گا مگر اس کے سبب
ہنس پڑا ہو گا اور کوئی نہ رو یا ہو گا
جب میرے ہاتھ تھے روتی ہوئی تم کو دلبر
اس نے جاتے ہوئے مڑ کے مجھے دیکھا ہو گا

شروت آرا

کی ڈائری سے

میں نے یہ سترج گلاب
تمہارے لئے ہی
چن رکھے ہیں
سوچتی ہوں
یہ گلاب
تمہارے نام کر دوں
تم تک پہنچتے پہنچتے
شاید یہ کوٹھک جا میں
لیکن ان کی
خوشبو باقی رہے گی
اس طرح
جس طرح تمہاری یاد کی خوشبو اب تک
اب تک
میری ڈوبتی سانسوں کے
گھیرے میں ہے۔

لغمانہ بٹ

کی ڈائری سے

خواب دھیالات میں ہر اک ہر لحاظ میں
سات میں بات میں آواز میں آہٹ میں
عموں کے سنگھار میں پھولوں کی چمک میں
میری سوچوں کے انکار میں نصورات کی لٹائی میں
آنسوؤں کی رسات میں میری تمام خواہشات میں
ہر صحت ہر بار میں زندگی کے ہر کاروبار میں
تیرا ہاتھ رہتا ہے میرے ہاتھ میں
یہ الگ بات کہ تو مجھ سے جڑ رہا ہے

میسری بیاض سے

یاسمین زیبا ناہید اختر _____ کورنگی
راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جان میں
در نہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

ایک آکر _____ شہدادپور
ہجر کے ماروں کی خوش نہیں جاگ رہے ہیں بہرے سے
جیسے یوں شب کٹ جائے گی جیسے تم آ جاؤ گے

طاہرہ مرزا _____ مانگا مٹی
اپنے ہی دل سے پوچھو تم میرے دل کی حالت
ہو گا نہ مجھ سے بیاں اپنے درو کا افسانہ

شہناز فیضی _____ کراچی
آنکھ وہ طرف کہ ہر رات بھر ہے اب بھی
دل وہ وحشی کہ مجھے یاد کرے ہے اب بھی

الین صدف سجاری _____ ڈھڈیال
یاد آتا ہے وہ تکرشیدہ جو چین میں
رہتے ہیں ہم جا جاکے صنوبر تلے ہاتھ

مجیدہ الماس _____ ملتان
کسی سے کیا کوئی امید رکھے چارہ سازی کی
تم تو یہ ہے اپنے بھی ہوئے جلنے پیر گئے

ام سید طحطاہ _____ گوجرہ
تعریف کیا کروں میں محبت کی لے مسم
پھولوں کا کوئلوں کا، سناروں کا نام ہے

روبی نیازی _____ بہتر
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

اقبال فاطمہ _____ کراچی
میں اور التجائے کرم آپ سے کروں
یہ بھیک اسے دیکھتے جس کا خدانہ ہو

عمرانہ رشید _____ کراچی
مرے نہ ہمارے ہم قیس و کوکب کی طرح
اب اہل دل میں ہماری مثال جو بھی ہو

نگہت موسوی _____ کراچی
وہ لوگ جن سے تیری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تیری بزم خیال سے بھی گئے

رضیہ امین _____ راولپنڈی
شام ہوتے ہی یاد کے پنچھی
آس کے بیٹھے بدن کی شاخوں پر

خالدہ جیلانی _____ کراچی
کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے سے
ہر موسم ہے دل کھلنے اور مڑ جھلنے سے

سمیہ تین _____ کراچی
دنیا بھر کی یادیں ہم سے ملنے آتی ہیں
شام ڈھلے اس سوئے گھر میں میل لگاتے

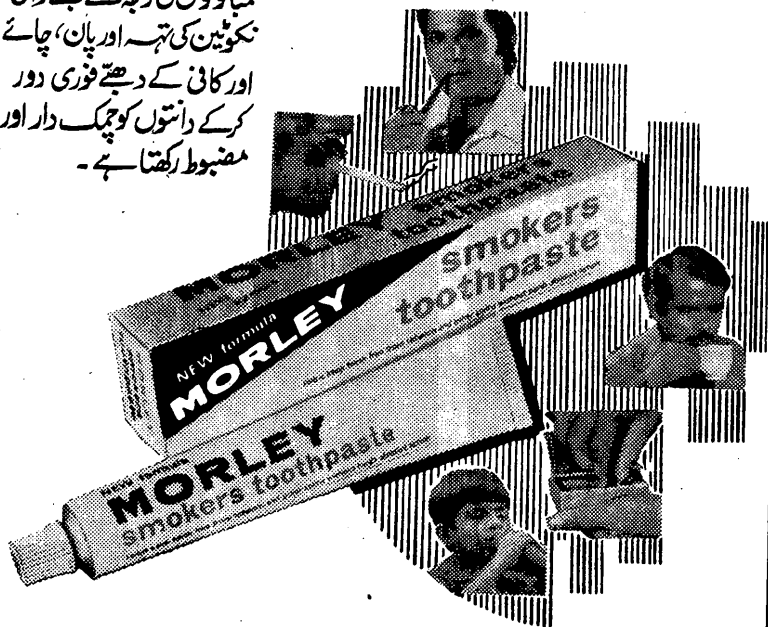
بشری ڈار _____ جہلم
کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھائے ہیں

مسرت جبین قادری _____ جلالپور پیر والا
کس قدر محظوظ فائز ہے میری دنیا میں ندیم
جو ذرا ہنس کے ملے اس کو سیاحا بھول

نیفا فارمولا
مورلے

پاکستان میں پہلی مرتبہ پولی سل کے ساتھ نیفا فارمولا مورلے اسموکرز ٹوتھ پیسٹ

تباکو نوشی کی وجہ سے جتنے والی
نکونین کی تہہ اور پان، چائے
اور کافی کے دھبے فوری دور
کر کے دانتوں کو چمک دار اور
مضبوط رکھتا ہے۔



نیفا فارمولا مورلے اسموکرز ٹوتھ پیسٹ بچوں اور بڑوں سب کیلئے

دانتوں کی حفظانِ صحت میں مورلے۔ ایک قابلِ اعتماد نام

اینفورڈز (پاکستان) لمیٹڈ، ای ۳۹- ایس آئی، ٹی، ای، کراچی ۱۸



پرنسے عامر

خواتین کی محفل

رخسانہ شاہین ارشد

سایہ یال

س زندگی ایک چراغ کی مانند ہے اور موت؟
ج فیروز بلب کی مانند

بشری صدیقی

کراچی

س بھیا آنسو سفیدی کیوں ہوتے ہیں؟
ج میں نے تو آج تک سفید بھی نہیں دیکھے۔

راشدہ حاکم علی

ماتلی

س شعر کا جواب شعر میں دیں

ج وہ ہزاروں میل سے بھی بہت یاد آتے ہیں
جن کو بھولے تھے یہ شاید یا دم آتے ہیں
یہ جدائیوں کے رستے بڑی دوزخ گئے ہیں
جو گھیا وہ پھر نہ تو تیر میری بات مان جاؤ

ایس صدف بخاری

ڈھیلیال

س یہی دل تھا کہ تیرا تھا رام کے لئے

ج اب یہی ترک متل کے بے باکے مانگے
جو میرا نام بھی لیا کرتا تھا دعاؤں کی طرح
سو جتنی ہوں اس نے مجھے کس طرح بھلایا ہوگا

راشدہ حاکم علی

ماتلی

س رات میں نے ایک عجیب سی مخلوق کو اپنے ساتھ لایا

ج چراتے دیکھا، کہیں وہ تم تو نہیں تھے؟
یہ خرافاتی تو ہے تم حیوانوں کی کہ انسانوں کو ساتھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔

س بھیا رات میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے پلو راپ

کے سینکٹ نکل آتے ہیں۔ کیسے کیا خیال ہے؟

ج چیونٹی کی جب شامت آتی ہے تو اس پر نکل آتے ہیں۔

ناہیدہ تاج خانزادہ

نوشہرو فیروز

س آج کل کے کو جوان ڈاکڑ یا آفیسر بننے کے بجائے

ج کیونکہ فلمی ہیرو بننا ڈاکڑ بننے سے آسان ہوتا ہے۔

س پچھلے زمانے میں کیونتر محبت نامے لیکر جلتے تھے۔ آج

ج کل یہ کیونتر کہاں ہیں؟

ج کچھ بھیجنا ہو تو بتاؤ ہم جدید طریقہ بتا دیں گے۔

فوزیہ ربوہ

ڈیڑا ساہیوال

س یہ کیا کہ اہل نظر نے اپنے نہ آپ کے

ج یا موت یا حیات کو فی بات طے تو ہو

ج ہم تنگ نائے سب سے باہر نہیں گئے

ج بچہ سے بچہ کے زندہ ہے مرنے نہیں گئے

انور بی ملک

ادبازہ سندھ

س اگر آپ گھر کا راستہ بھول کر کسی اور گھر میں گھس جائیں تو؟

ج تو تم کیوں فکر مند ہو مجھے تپ تو ہے؟

نغمہ نہ بٹ

وزیر آباد

س کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عورت کی نظر شوہر کی جیب پر

ج رہتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج جی ہاں۔ لیکن شوہر کی جیب میں پیسے ہی ہوں۔

س ایک عورت نے فون کیا۔ فون ایک پولیس میں نے

ج اٹھایا۔ ”ہیلو۔ تمھانہ؟“

س عورت نے پھر سلو کہا۔ جواب ملا ”تمھانہ؟ عورت

نے پوچھا کیا یہ واقعی تمھانہ ہے؟“



شیخ الحش (ایک مصری سالن)

اشیاء :-

لیبے بیگن

دہی

مٹاٹر

دہی

لہسن

گرم مصالحہ

ہار کلو

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

دو ٹھنڈاں

چائے کا آدھا چمچ

ہری مرچ، ہرا دھنیا، سفید زیرہ، گھٹا ہوا چائے کا آدھا چمچ، نمک، گھی اور ذرا سی جینی۔

تکریب :- قیمہ مام طریقے سے پیاز، ادسک، لہسن اور ذرا سی سرخ مرچ ڈال کر بھون لیں۔ ٹماٹر میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گھولیں اور اس کا طیہ بنالیں۔ دہی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر چھینٹ لیں اور ٹماٹر میں ملا دیں۔ دہی اور ٹماٹر کے اس گٹھے میں شوربے ہیں، اسے نمک لہسن کا پانی پسا ہوا گرم مصالحہ اور زیرہ دیا میں چائے کے چمچ جینی دتا کر بہت کھانا ہو جائے اور نمک ملا لیں بیگنوں کو چھینکے اور ڈنڈی سمیت تھوڑے تھوڑے گھی میں اتنی دیتیں کہ وہ ذرا نرم ہو جائیں۔

کوشش کریں کہ سارے بیگن ذرا بھنے اور برابر ہوں۔ ان تلے ہوئے بیگنوں کو کسی گول پلٹ یا چھوٹے کنارے والے برتن میں اس طرح چاروں طرف پھانیں کہ ان کی ڈنڈیاں کنارے کے ساتھ کھڑی رہیں۔ چاقو سے بیگنوں کو پورے سے کاٹ دیں۔

بھونانے کے اندر قہر بھر دیں۔ پچھا ہوا قیمہ اوپر اور کنارے پر چھوڑ دیں اس کے اوپر دہی اور ٹماٹر کا شوربہ لٹا دیں۔ بیگنوں کو شوربے میں بالکل ڈوب جانا چاہیے اوپر ہرا دھنیا اور ہری مرچ کتر کر چھڑک دیں اگر آپ کے گھریں اودون ہے تو اس میں اسے اتنی دیر کے لیے رکھ دیں کہ اوپر سے خوب سرخ ہو جائیں اور بیگن بالکل گل جائے اگر اودون نہیں ہے تو اوپر سے بچے کو تیل کی آگ دیکھ کر سینک دیں یہ سالن اتنی برتن میں دسر خوان پہلا یا جاتا ہے۔

چھوارے کی کھیر

اشیاء :-

چھوارے

ایک سیر

تین سیر

ایک سیر

مرضی کے مطابق

ایک درمیانہ چمچ

چند قطرے

دودھ

کھویا

چینی

کارن فلاور

کیوڑہ

چاندی کے ورق

حسب ضرورت

تکریب :- چھوارے دھو کر بال لیں جب ابل جائیں تو چولہے سے اتار لیں اور گھنٹیاں نکال کر سیر پسا کر یک ٹھیں لیں۔ پھر پلے ہوئے چھواروں کو دودھ میں گھول کر چھینٹیں سے چھان لیں۔ تاکہ چھلکے یا موٹے ٹکڑے الگ ہو جائیں اس دودھ میں کارن فلاور خوب اچھی طرح گھول کر چھلے پر چڑھا دیں برابر چمچ ملاتی رہیں تاکہ ابل کر گر نہ جائے۔ تھوڑی دیر بعد کھویا بھی شامل کر دیں جب کھیر گاڑھی ہونے لگے تو چینی ملا لیں اچھی طرح گاڑھی ہونے پر اتار لیں۔ اور کیوڑہ ڈال دیں پلیٹ میں نکال کر اوپر چاندی کے ورق لگائیں۔

ناریل کی مٹھائی

اشیاء :-

ملائی

آدھی پیالی

دودھ

آدھی پیالی

چینی

آدھی پیالی

ناریل

دو پیالی (کش کیا ہوا)

خوشبو کے چند قطرے

ونیل کیوڑا

مکھن

دو چمچ (دھرتیا لٹا)

کھانے میں ڈالنے والا رنگ حسب ضرورت

تکریب :- ملائی، دودھ اور چینی ملا کر مکی آٹے پر کپائیں لکڑی کے چمچ سے آہستہ آہستہ ملا لیں تاکہ نیچے سے جلنے نہ پائے جب یہ نشیو کا ڈھا ہونے لگے تو کسی ٹھنڈی پلیٹ یا دھکی کے ڈھکن پر ایک قطرہ کر کے آہستہ آہستہ پھیل جائے تو پھر دیر اور پکا یہ جھنی قطرہ کر کے اسے کوئی ٹھنڈی پلیٹ یا دھکی کے نوڈرا چولہے سے اتار لیں اس میں مکھن، خوشبو اور رنگ بھی ڈال

خواتین ڈائجسٹ کے ۱۰۰ شمارے

خواتین ڈائجسٹ صرف ایک سال ہی نہیں بے گلاس کا شمار ایک مکمل کتاب ہے ہم نے خواتین ڈائجسٹ کے ایک ایک سال کے پچوں کے سیٹ تیار کئے ہیں جو ایک خوبصورت کس میں بچوائے جائیں گے۔ آپ جائیں تو ایک سال یا پچھلے نو سالوں کے مکمل شمارے رعایتی قیمتوں پر منگوا سکتے ہیں

پہلے سال ۱۹۷۲ کے شمارے	۲۵ روپے
دوسرے سال ۱۹۷۳ کے شمارے	۳۶ روپے
تیسرے سال ۱۹۷۴ کے شمارے	۳۶ روپے
چوتھے سال ۱۹۷۵ کے شمارے	۴۰ روپے
پانچویں سال ۱۹۷۶ کے شمارے	۴۰ روپے
چھٹے سال ۱۹۷۷ کے شمارے	۴۰ روپے
ساتویں سال ۱۹۷۸ کے شمارے	۶۰ روپے
آٹھویں سال ۱۹۷۹ کے شمارے	۶۰ روپے
نویں سال ۱۹۸۰ کے شمارے	۸۰ روپے

نوٹ: اس کے علاوہ اگر آپ کوئی شمارہ جو آپ کی لائبریری میں کم ہو، منگوانا ہو تو وی بی سے منگوا سکتی ہیں

سرکولیشن مینجر خواتین ڈائجسٹ اردو بازار - کراچی

اور ذائقہ بھی صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ شروع سے ہی اپنے بچوں کو ان چیزوں کا عادی بنایا جائے۔

سبزلیوں کی بخینی

گھوٹیں جو بھری بھی موجود ہو یعنی پلاک گوہی، گاجر، آلو، مٹر، ٹماٹر، کدو، ٹنڈے ان میں سے جو کچھ موجود ہو استعمال کر لیجئے یا ایک وقت میں ایک سبزی بھی استعمال کر سکتی ہیں سبزلیوں کے ٹنڈے اور جھکے بھی استعمال کر لیجئے، اگر زیادہ مقدار میں ہوں تو صرف جھکوں کو بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

ترکیب: کسی بھی کی ہانڈی میں کوئی بھی سبزی اور جھکے اچھی طرح دھو کر ڈال دیجئے اگر گوشت ہو تو ایک دو ٹکڑے گوشت کے بھی ڈال دیجئے اور ساتھ ہی فالو ٹیڈل بھی ایک چھوٹی سی باز موٹی موٹی کاٹ کر ڈالیئے۔ ضرورت کے مطابق نمک ڈال دیجئے یہ تمام چیزیں ہانڈی میں ڈال کر اتنا پانی ڈالیئے جس سے تمام سبزیاں ڈھک جائیں بہت ہلکی آگ پر پختہ دیں جب ایک اور جوش آجائے تو آگ بالکل کم کر دیجئے۔ جیسے آپ کڑھائی میں دو دھرا بانے کے لیے دھکتی ہیں۔ چنانچہ اس طرح ہلکی آگ پر بخینی چار پانچ گھنٹوں ہیں تیار ہوگی۔ جب پاک کر پانی صرف جو بخینی حصہ رہ جائے تو اس بخینی کو چھان لیں اور گرم گرم استعمال کریں۔ بچوں، بوڑھوں اور مریضوں کے لیے بہت اچھی غذا ہے۔ چلنے کے بعد اگر دل چاہے تو اس میں ابلی سبزلیوں اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے جوڑ کر ٹکڑے کاٹ کر ملا دیجئے۔

نوٹ: اگر بخینی کا دھکی کرنی چاہیں تو ایک ہال میں دو بڑے چمچے میدہ ڈال دیں۔ اور چوڑھے پر چڑھا کر دو تین ہال آئے دیں تیار ہونے کے بعد اس میں ایک چلنے کا چمچ مکھن ملا دیں۔



دیں۔ آہستہ آہستہ ملائیں تاکہ سب چیزیں حل ہو جائیں اب ناریل ڈال کر بیج چلائی رہیں ایک ادھ منٹ میں بہ گاڑا ہوئے گیے گا فوراً کچی چڑی ہوئی ٹرے یا تھال میں ڈال کر پھیلا دیں پھیلائے وقت میں کو ہلکا سا گھی سے چیر کر استعمال کر سکتی ہیں یا پھر ہاتھ کو گھی سے چمکا کر کے اس سے برابر کر لیں ٹھنڈا ہونے پر جو کور ٹکڑے کاٹ لیں۔

نوٹ: یہ رنگ ڈالنا ضروری نہیں سفید بھی رکھ سکتی ہیں لیکن چند مرتبہ بنانے سے آپ کو اتنی مشق ہو جائے گی کہ اس مٹھائی کو چمکانے سے پہلے دو حصوں میں کر کے ایک میں رنگ ڈال کر بیچے پھیلا دیں اور دوسری تہہ اور سفید چائیں اس طرح مٹھائی ایک طرف سے رنگین اور دوسری طرف سفید ہوگی۔
(۲) آخر میں جب ناریل ڈالیں تو احتیاط سے اتنا ہی بیج چلا جس سے ناریل مل جاتے اور ہلکا گاڑھا ہو ورنہ خشک ہونے کا ڈر ہے۔

کشمیری کوفتے

اشیاء: برقیہ	ادھ کھو	کالا زبرہ	آدھا چمچ
پیاز	دو عدد	سیاہ مہرج	چھ سات دانے
ٹماٹر	دو تین عدد	ہری مرچ	برادھنیا پودینہ
سوٹھ	ایک سوچ	یا ہری میٹھی	چند تے
سونف	ایک چمچ	جھوٹی اور بڑی الہچا	دو تین عدد
		ہریک	سرسوں کے دانے کے برابر

تعمیم: یہ قیمہ میں ایک پیاز، نمک اور ادھ بے ماسے ڈال کر پٹیں ہیں پھر ان میں تھوڑا سا ساپا ہو گرم مسالا ملا کر گول کوفتے بنا لیے روس بنالیں، گھی میں ہریک ڈال کر مرغ کر لیں اور میرے نکال کر پھینک دیں۔ اب اسی گھی میں پیاز لال کریں۔ پھر اس میں ٹماٹر اور پیسے ہوئے سارے ماسے ڈال دیں فرادیر بھون کر اندازے سے دو تین پیالی پانی ڈال دیں جب پانی ابٹنے لگے تو اس میں کوفتے ڈال دیں اور دھیمی آہ پر پختہ دیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔

بخینیاں اور سوپ

بخینی کا نام پڑھتے یا سنتے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی مریض کے لیے یہ سبزی خوراک ہے مگر کوئی نہیں بچپن سے کھیں مصلحے یا گوشت کے زیادہ عادی کر دیا گیا ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ جن چیزوں کو ہم فالو تھوکتے ہیں ان میں کتنی طاقت ہوتی ہے

ہم نے خواتین کو ایک ایک سال کے بچوں کے ساتھ تیار کرنے پر ایک شخصیت جس میں بخینی بنائی گئی ہے۔ آپ کو یہ ایک سال کے بچوں کے ساتھ تیار کرنے کے لیے



بینک کے کارمی کے نئے روشنی بابے
کو کامیاب بنائیں

نیشنل بینک آف پاکستان

نفع و نقصان میں شریکت کی بنیاد پر
غنیہ سودی شریکتی کھاتے
کھولنے کی سہولت سے فائدہ اٹھائیں

آپ نیشنل بینک میں صرف تنواروپے سے شریکتی سیدنگ اکاؤنٹ
اور ایکسٹرنل روپے سے میعاد کی اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔

کوئی بھی میعاد کی کھاتہ شریکتی میعاد کی کھاتے میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے
اس صورت میں یہ جاری حساب کی رسید کو میعاد سے پہلے بھجنا لینے پر سود کا نقصان نہیں ہوگا
آپ کے لئے اپنی بچت پر عمدہ نفع کمانے اور غنیہ سودی بینکاری کو فروغ
دینے کا نادر موقع

آپ نیشنل بینک آف پاکستان پر بھروسہ کر سکتے ہیں
تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رجوع فرمائیں

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

گھریلو علاج

پودینہ

ہضم کے اصلاح کرنیوالا خوشبودار پودا

غصام کے وقت مولیٰ ٹسلف، گاجر، سبب، امرو، گھگھو، گھگھو، ایک دو سے آٹھ چھٹانک تک میں ہر اوروینہ تولہ پھر اور لمبوں پر خور جاٹ بنا کر کھائیں۔ چند روز میں مکمل صحت ہو جائے گی کسی نیتند

والے مریض کو اس میں ہر ارجیا تولہ، آدھا تولہ اور پیاز ایک سے تین تولہ تک بڑھا دیں۔ سبب کہ دو دانوں اور چھوٹے کیڑے چھینے (سبکوان، چھونے) دینے کر کے لیے چند روزہ پاؤدو پاؤ آڑو یا امرو کا کڑمک یا شہد اور پودینے کی چاٹ بنا کر کھانا مفید رہتا ہے۔ ناک بند رہنے والے مریض اگر تولہ پیاز اور آدھا تولہ پودینے کو کٹ کر پوٹی میں باندھ کر دن میں چار یا پانچ مرتبہ سونگھا کریں تو اس سے علاج سے ناک کے آپریشن سے چھٹکارا ہو جائے جن مریضوں کا معدہ اور غذا کی نالی جلتی رہے متلی اور سنے لافان طبیعت لافان رہے تو اس کے پتے نہیں کر چاہئے والا چھہ ہر ڈیڑھ چوبیس گرس گئے یا انگوڑا۔ میں ملا کر چند روزہ صحت بطور ناک استعمال کرنے سے صحت ہو جاتی ہے۔ اس کے پتوں کا پانی کان میں دو تین مرتبہ ٹپکائے سے کان کے کیڑے نکل جاتے ہیں اور کان کے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔

مسواک

کچھ عادت و انتوں کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے

دنیا کے سب سے بڑے جیکم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دانتوں اور مسواکوں کی مخالفت کرنے کے لیے مسواک کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ ایک حدیث میں حضور نے ارشاد فرمایا "اگر میری امت پر یہ بات مشقت ڈالنے والی نہ ہوتی تو میں انھیں ہر نماز سے پہلے مسواک کرنے کا حکم دیتا، جو آدمی دن میں پانچ مرتبہ مسواک کرے اس کے دانت میلے اور مسوڑھے پھیرے ہوئے کیسے لگیں گے۔

۲۔ برش بنا کر مسواک کرنے سے دانت صاف، مسوڑھے مضبوط اور کھاتی ہوئی غذا کا ذائقہ عذوسوس ہوئے لگتا ہے۔ تازہ مسواک کی عادت سے دانتوں کی درخشندہ اور منہ میں خوشبو آ جاتی

ہے۔ ۱۰

پودینہ کی سبزی ہزاروں برس سے بطور غذا اور دوا استعمال ہو رہی ہے۔ آج بھی اسے ایک پریٹ کی خرابی اور دست بند کرنے والی غذا کے طور پر اس کے پتوں اور نار دانہ کی چٹنی بنا کر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی تین قسمیں بستانی، جھنگلی اور بہاڑی عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ عوام اس کو ایک معمولی سبزی شمار کرتے ہیں مگر حکیم اسے ایک سستے و امول ملنے والی زود معصوم اور معدہ آنسو کو طاقت دینے والی غذا کا درجہ دیتے ہیں۔ معدہ اسے دو گھنٹے میں ہضم کر لیتا ہے۔ ہضمی، ڈاکروں کی کثرت، پریٹ، بڑھنے، منہ کی بدبو اور گیس دور کرنے کی یہ غذا بھی ہے اور شافی دوا بھی۔ عوام اسے پودینہ، فاریڈین، فوریڈ، انگریزی میں منیٹ اور اس کو ایل بدل کر کے آج کل طبی زبان میں منیٹھا کہا جاتا ہے۔ چھوٹے پتوں والے پودینہ میں بوتیر اور ذائقہ خوشبودار اور عموماً چٹنی بنانے کے لیے اسی قسم کو پکد کیا جاتا ہے۔ مزاج اس کا گرم خشک ہے اور بدن میں جا بجا چھٹے ہوئے زہریلے فضلات کو توڑ پھوڑ کر صحت مند اس کا کام ہے۔

پودینہ میں شامل لطیف جوہر جہاں بھی رکھا جائے گرمی پیدا کرتا ہے۔ زبان پر رکھیں تو وہ جگہ سرخ ہو جاتی ہے بلکہ اگر چند منٹ متواتر لگائے رکھیں تو اس جگہ پر آبلہ ہونے لگتا ہے۔ قدرت نے اس کے لطیف جوہر میں بغم اور دوسرے گاڑھے فضلات کو تیار کر کے تھوک اور رطوبت کے ذریعہ بدن سے خارج کرنے والی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ قدرت نے غذائی نالی کو طاقتور بنانے کے لیے اس میں تھوڑی مقدار میں نشاستہ دار گلوکوز بنانے والے قابض اجزاء بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ہمارے ملک میں کیا دیا جہر میں پسینہ لانے اور بدن کو صحت رکھنے کے لیے آج کل چائے کا استعمال زردوں پر ہے مگر آدھے سے ڈیڑھ تولہ تک پودینے کو بطور چائے خوش بک کر کھاٹ یا شہد ملا کر پینے جائیں تو پسینہ لانے کے ساتھ بدن کو غذائیت بھی حاصل ہو جائے۔

بھوک کی کمی زیادتی، نگیس اور گردوں کی ریح والے مریض

نفسیات از دو اجی الجھیں

عقد نان کے مشورے

شہناز شریف

پیارے بھیا عقد نان آداب بھیا میں نے آپ کو بھائی جیسے مقدس نام سے پکارا ہے امید ہے آپ میرا بھرم رکھیں گے کیونکہ میرا دنیا میں کوئی بہن بھائی نہیں۔ میری والدہ بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ ماموں نے مجھے پال لیا۔ جسے میں بڑی ہوئی مئی بھنے والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ماموں نے پالیا ہے۔ اس کی تو مال مرچی ہے اس طرح کی باتیں میرے ذہن میں گھر گئیں۔ چونکہ ممانی اگر مجھے کسی غلط بات پر بھی ڈانٹیں تو میں بھی خیال کرتی یہ میری والدہ ہیں میں ان سے بدظن ہو گئی۔ میں نے میرے گے کے بعد کالج میں ایڈمیشن لیا، انٹر میں ہی تھی کہ مجھے دور سے پڑنے لگے وہ دن اور آج کا دن اب تک میرے در سے ٹھیک نہیں ہوئے معلوم نہیں کیا وجہ ہے میں جب بھی سوچتی ہوں کہ میرا کوئی نہیں ہے تو مجھے دورہ پڑ جاتا ہے۔ ہر قسم کا علاج کر دیا۔ مگر اب تک ٹھیک نہیں ہوئی حکیم کا علاج بورا ہے۔ دوا کھانے سے بین ماہ ٹھیک رہی پھر مجھے دورہ پڑ گیا۔ پیارے بھیا مجھے ضرور مشورہ دیں تاکہ میں کسی ماہر نفسیات کو دکھاؤں۔ اور میں جب کراچی آؤں تو کیا آپ سے مل سکوں گی۔ آپ اپنا پتا بکھریں۔ میرے دورے میں ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ جاتا ہے۔ اسٹریٹ لائٹس دیکھ کر ہر کوئی ہر جاتی ہے۔

ج۔ آپ کی بیماری کی وجہ صرف یہ احساس خرومی ہے کہ آپ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جب تک آپ کو علم نہ تھا کہ ممانی آپ کی سگی ماں نہیں آپ کو کوئی ناگواری کا احساس نہ ہوا۔ لیکن اب چونکہ آپ کو علم ہو چکا ہے اس لئے آپ ان سے بدظن ہو گئیں۔ اچھی بہن آپ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ کے ماموں اور ممانی کو ہمیں ہزاروں ایسے انزادیں جن کا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو پوچھتا نہیں۔ آپ ان فضول خیالات کو ذہن سے نکال دیں اور ماموں اور ممانی سے محبت کریں ان کی خدمت کریں اور انہیں ماں باپ کا درجہ دیں ویسے بھی وہ نظر سے ماں باپ ہی ہیں۔

فقوی

پیارے بھیا مسئلہ خوش رہو۔ :- بھائی جان میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں پریشانی کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ لیکن ذہن پر ایک طرح کا بوجھ رہتا ہے اتنا سوچتی ہوں کہ خود بھی تنگ آجاتی ہوں۔ مگر ذہن ٹھیک نہیں ہوتا کام کوئی کرنا ہوتا ہے اور کر کوئی جاتی ہوں مجھے میں نہیں لگتا میں اس قدر نیوں سوچتی ہوں بھائی جان کوئی مشورہ دیں میرا ذہن ٹھیک ہو جائے اور میں بھی دماغ سے کام لیا کروں۔

ج۔ بہن فقوی! میرے خیال میں آپ کے پاس سوچنے کے لئے بہت وقت ہے۔ ویسے سوچنا باری بات نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں ہر شخص سوچتا ہے۔ لیکن بلاوجہ کی سوچیں اور سوچوں کا غلط رخ نقصان دہ ہوتا ہے اور انسان عملی زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ آپ کو شش کرس کہ جو کام کریں اپنی توجہ کو اس کی طرف مرکوز رکھیں۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی میں ناراض اوقات میں کوئی مشغلہ اپنائیں۔ کڑھائی، سلائی، بنائی پیشگی مطالعہ جو بھی آپ کا شوق ہو خالی ذہن تو دیکھیے شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے آپ مطالعہ کا شوق بڑھائیں اور دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہیں پھر ذہن ٹھیک ہو جائے گا۔

بہن فن نے خط کھا ہے کہ کئی چیزوں سے ایک عجیب الجھن کا شکار ہوں رات کو سوتی ہوں تو خوب پانی پیتی ہوں فردا سباتھ گندا ہو جائے تو دھوئی رہتی ہوں رات کو بیروں پر پانی ڈالتی ہوں وغیرہ وغیرہ
ج بہن فن نے خط کی اشاعت کے لئے منع کیا ہے۔

ایسے مریض ایک بس مجبوری کے تحت ایسے کام یا ایسی حرکتیں کرتے ہیں وہ کچھ کرتے ہیں ایک دباؤ کے تحت کرتے ہیں انہیں اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا ان میں اکثر مریضوں کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک ایسی حرکت کر رہے ہیں جو انہیں نہیں کرنی چاہیے ایسے مریضوں کے ذہن پر خوف و ہراس کا احساس رہتا ہے۔ لہذا وہ یہ حرکات بار بار کرتے ہیں اگر کسی وجہ سے نہ کرنے کی کوشش کریں تو پریشان ہو جاتے ہیں اور کرتے ہیں تو یہ احساس رہتا ہے کہ غلط کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کا جائزہ لینے پر پتہ چلا ہے کہ ایسے لوگ یہ سب کچھ کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ اور انہیں خود پر قابو نہیں رہتا۔ ایک ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ یہ بیماری کئی حادثے یا صدمے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح مریض کو خود پر اختیار نہیں رہتا اور ایسی حرکات کرنے لگتا ہے۔ فریبزدگتا ہے کہ بے ہودہ گندی اور غیر شانستہ خواہشات جو مریض کے لاشعور میں دبی رہتی ہیں وہ ذہن پر متعین کر لیتی ہیں اور مریض ایسی نامعقول اور بچکانہ حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کچھ مریضوں کی بیماری کی وجہ ان کے والدین کی بچپن کے بے جا سختی ہوتی ہے۔ اور مریض ایک قسم کے احساس جرم کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گندیا یا لاپتہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور وہ خود کو پاک صاف رکھنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اور بار بار ایسی حرکات کرتا ہے۔

ایسے مریضوں کی تحلیل نفسی یا ان کے بچپن میں جھانکنے یا ان کی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی اس قسم کی بار بار حرکات کے پیچھے بچپن یا گزشتہ زندگی کا کوئی اہم واقعہ ہے یا وہ احساس جرم کا شکار ہیں۔ یعنی ان سے وابستہ یا نا مانگنے میں کئی جرم سرزد ہو گیا ہے جو کہ ان کے لاشعور میں پھنس کر انہیں بچوں کے لگنے لگا۔ ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ تحلیل نفسی کے ذریعے اس بیماری کی جڑ یا وجہ کا پتہ لگانے سے اس کا علاج ممکن ہے یعنی بچپن سے لے کر گزشتہ زندگی کے پورے حالات سامنے آجائیں تو اصل وجہ کو جان کر متشورہ دیا جاسکتا ہے۔ اور علاج ممکن ہے۔ مریض کے علاج یا مشورے کا تو لہذا میں غبر آئے گا۔ سب سے پہلے تو مریض کے دل خانہ کے لئے مشورہ ہے۔ کہ مریض کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آئیں اور کنہ جینی، لسن طعن ہرگز نہ کریں کیونکہ اس شخص کے کہہ چوٹے کا نہیں بڑھنے کا خطرہ ہے۔

ایکے بہن - F.M.

بہن F.M. نے خط کی اشاعت پر باندھی لگا دی ہے۔ تاہم خط کا ایک پیرا یہ ہے۔

بھیا بھئی کبھی میرے خیالات اور سوچیں بھٹک جاتی ہیں۔ میں ہر وقت یہ سوچتی ہوں کہ اس کی عزت کو اس طرح اچھا لوں کہ لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں۔ بھیا مجھے سیدھا راستہ دکھائیں۔ مجھے ان سوچوں سے نجات دلا دیں کہیں میں بھٹک نہ جاؤں بلکہ کراؤں۔

ج بہن F.M. آپ کا خط پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی دکھ اس بات کا کہ حالات سے اس قدر تنگ آچکی ہیں کہ سرج کا رخ غلط طرف طر کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود سیدھے اور سچے راستے کی تلاش ہے۔ اچھی بہن آپ کا ایک قدم غلط اٹھا ہوا اب آپ سے انتقام نہیں بلکہ خود آپ کی تباہی ہے۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں یا نہ اٹھائیں آپ کو آوارہ اور بدہوش نہیں مہر کہیں گے۔ اور آپ پر آوارگی، یا بدظنی کا ٹیکہ کلک کا ٹیکہ بن جائے گا جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ دھو سکے گی۔ اور آپ انتقام کے جذبے کے تحت خود تباہی کے گڑھے میں گر جائیں گی۔ وہ شخص ایک طرف تو باپ ہے اور دوسری طرف نفسیاتی مریض بھی — اور پھر عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ کہ اس کے لئے دعا ہی کی جاسکتی ہے اور پھر یہ بھی سوچیں کہ وہ اچھا مشورہ

نہ ثابت ہو سکا۔ لیکن باپ بہر حال باپ ہوتا ہے۔ اور دنیا میں باپ کا کوئی بدلہ نہیں۔
آپ ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر سوچیں اور کبھی درستوں کی طرح بیٹھ کر ان کے دکھ جاننے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے
ان سے باتیں کرنے کے بعد آپ کو ان سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔

ساجدہ

میں ونسٹ ایئر کی طلبہ ہوں میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں آج سے تقریباً تین ماہ پہلے ایک رشتے دار سے محبت کرتی تھی اس نے
مجھے راستے میں خط پھینکا اور میں نے اٹھا لیا تھا مجھے پتہ نہیں چلا اور میرے کزن نے اسے اور مجھے دیکھ لیا بھیا اس نے سب کو بتا دیا ہے
اور سب مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے ابو کو اس بات کا کوئی علم نہیں باقی سب کو پتہ ہے اس بات کا سی سے اور مجھ سے علیحدہ علیحدہ کر کے
پوچھا گیا ہیں تو خیر یہی کہتی ہوں کہ بے خیالی میں اٹھا لیا تھا۔ اور اس کی اپنی بہن نے پوچھا تو وہ کہتا ہے کہ جو یقینی ہیں ان کو دیتے ہیں ناں خدا کے
نے مجھے اس کا حل ضرور بتائے اس کی وجہ سے میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں مجھے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا مجھے اس بات کا بہت خطرہ
ہے۔ کہ اگر میرے ابو کو اس بات کا پتہ چل گیا تو وہ مجھے مادرین گے یا خود مر جائیں گے۔

ج آپ آئندہ اپنے کزن سے نہ کوئی خط لیں نہ خود اسے کہیں جو کہتا ہے اسے کہنے دیں آگے جب کوئی بات نہیں ہوگی تو وہ خود ہی غامض
ہو جائے گا اگر آپ سے بات نہیں کرنا تو آپ کو اس کی پروا نہ کیوں ہے؟ خط لکھنا اور خط حاصل کرنا مرد کی فطرت ہے۔ ایک کھیل ہے
وہ گلی گلی یہ کھیل کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پھر جب وہ اپنے جاں میں جھڑکتا ہے تو پھر مطلب براری کے لئے ہر کوشش کرتا ہے۔ بلیک
میل کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلیک میل کرتا ہے۔ جو بڑی جو عورت مرد کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتی۔
وہ عمیقہ کار روگ لگا بیٹھی۔ آپ یہ ساری صورت حال اپنی والدہ کو بتادیں تاکہ وہ آرام سے آپ کے والد صاحب کو صورت حال سے آگاہ
کردیں۔ اور آئندہ یہ غلطی نہ کریں۔

ضرورت رشتہ

مسلمان میٹرک پاس پچھیس سالہ دو تیرہ کے لئے رشتہ درکار ہے لڑکی کو بصورت سفید رنگت اور نیک سیرت ہے لڑکے
کی عمر تیس سال ہو اور تعلیم پانچ برس روزگار کاروباری یا بزنس کرتا ہو یا کوئی اچھا ملازم ہو لڑکی مالدار خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔
بیٹھان زحمت نہ کریں لڑکا تنہا خود مختار ہو۔ صوبہ پنجاب کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ بکس نمبر ۱۲۰ خواتین ڈائجسٹ اردو بازار
کراچی نمبر ۱

ضرورت رشتہ

ایف اے میں زیر تعلیم مشہور و معروف اعلیٰ نسب خاندان نہایت شریف نہایت سمارٹ، خوش گفتار نیک سیرت خوش لباس
ہنس مکھ، خوبصورت لڑکی کے لئے شریف خوش شکل، تعلیم یافتہ خوش لباس، خوش گفتار، ہنس مکھ اعلیٰ آفیسر یا بزنس میں ماہرین
ملک ملازمت خود مختار لڑکا جو ان کی ضرورت ہے جو دیگر کے لالچی حضرات قطعی رجوع نہ فرمائیں۔ بکس نمبر ۱۲۰ معرفت خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار کراچی۔



نادیر کاظمی

چیچہ وطنی

میں میری عمر ۹ سال ہے قد پانچ فٹ وزن ۱۰۲ پونڈ اور کمر ۲۶ انچ ہے۔ کوبے ۳۳ انچ ہیں۔ باجی براہ کرم مجھے یہ بتائیں کہ قد کے لحاظ سے میرا وزن کتنا ہونا چاہیے اور کمر کوبے کتنے انچ ہونے چاہئیں۔ کیا قد اور بڑھ سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت کھر درے ہیں اور ان میں ڈرا سی بھی چمک نہیں ہے۔ بالوں کی دو دو نوکیں بھی ہیں۔ بالوں کو نرم اور چمکدار کیسے کیا جاتا ہے۔ تیسرا مسئلہ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں وہ یہ ہے کہ میرے چہرے اور پورے جسم کا رنگ تو صاف ہے لیکن گردن کالی رہتی ہے۔ میں نے ہر طرح کی کوششیں استعمال کی ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج۔ محترمہ نادیرہ کاظمی صاحبہ! آپ کا وزن قد کے لحاظ سے صحیح ہے۔ قدم بڑھ نہیں بڑھ سکتا دیے پانچ فٹ آپ کا قد... چھوٹا نہیں ہے آپ کا سائز ۳۴ - ۲۶ - ۳۴ ہونا چاہیے۔ بالوں کو نرم اور چمکدار بنانے کے لیے آپ ہفتہ میں دو مرتبہ تیل ضرور لگائیں۔ تیل کی مالش کریں اور اچھے سے شیمپو سے سردھو لیں شیمپو "Arlene" ہونا چاہیے بالوں میں چمک پیدا کرنے اور انہیں چمڑنے سے روکنے کے لیے یہ نسخہ استعمال کریں۔

سید کا کافی، مالش کی دال اور میتھی سل پر باریک نہیں کر شیمپنی کی طرح کریں اور اس کو بھجودیں اور سر میں شیمپو کی طرح استعمال کریں اور سردھوئیں صاف استعمال نہ کریں۔

گردن کا رنگ کالا ہونے کی وجہ یہ ہے عموماً چہرہ کو دھویا جاتا ہے لیکن خواتین گردن پر توجہ نہیں دیتیں۔ آپ جب بھی چہرہ دھوئیں گردن کی اچھے صابن سے دھویا کریں۔

بیچہ ک کریم رات کو رگ کر سوجائیں اور صبح صابن سے دھوئیں۔ بعض اوقات روئیں کی زیادتی سے بھی سیاہ نظر آتی ہے اگر ایسا ہے تو کسی بیوتھ پارلر سے تھریڈنگ کرائیں۔

جمیدار مسیح خانزادہ، نوشہرہ فیروز

س۔ باجی میرے اور میری آپنی کے چہرے پر گرمی دلنے نکل آئے تھے۔ اب دانے نوباقی نہیں رہے مگر وہ اپنے نشان ہمارے چہرے پر چھوڑ گئے ہیں اور میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں بتائیے کیا کروں۔

ج۔ گرمی دلنے چہرے پر نشان نہیں چھوڑتے ہیں آپ کے چہرے پر کسی اور قسم کے دلنے نکلے ہوں گے یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے انہیں تیز ناخنوں سے کھجایا ہو جس کی بنا پر وہ آپ کے چہرے پر نشان چھوڑ گئے ہوں آپ کسی قریبی ڈاکٹر کو دکھا کر مشورہ کریں۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے عموماً مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں۔

- ۱۔ خون کی کمی۔
 - ۲۔ کمزرت مطالعہ دیر تک جاگنا۔
 - ۳۔ جگر کی خرابی نظام ہضم کی خرابی۔
- اگر آپ کو مندرجہ بالا شکایات میں سے کوئی شکایت ہے تو اس کا علاج کرائیں کھانے میں تازہ پھل اور سبزیاں کمزرت سے استعمال کریں۔ دودھ پین رات کو سونے سے پہلے یوگرم حلقوں کے گرد لگا کر سوجائیں اور صبح اٹھ کر دودھوں یا تھوکیں رگڑ کر آنکھوں پر لگائیں اس سے دودھان خون تیز ہو کر حلقے دور ہو جائیں گے۔ کم از کم آٹھ گھنٹہ سونے کی کوشش کریں۔

رفعت نسیم، کراچی

س۔ باجی میرے چہرے پر رواں بہت ہے۔ میرا

رنگ صاف ہے جس کی وجہ سے اگر وہ کاساما ایک اپ
بھی کرتی ہوں تو یہ رواں اور زلف... گتہ ہے
میں نے سنبہ کے اگر بجلی کے ذریعہ رواں نکولیا
جائے تو پھر دوبارہ کبھی نہیں نکلتا آپ مجھے شہر دیں
کہ اگر میں ایسا کروں تو کوئی خطبے کی بات تو نہیں
ہے اور اگر میں گھر میں دیکھ کے ذریعے رواں
صاف کروں تو کس طرح سے ہوگا اور دیکھ کس جگہ سے
ملے گی اور کیا کہہ کر لینا ہوگا اور میری بھنویں بہت نجی ہیں
یہ میں کس طرح سے بتاؤں۔

ج. بجلی کے ذریعے بال اتارنے کا طریقہ ہنگامہ لایا ہے اور
اس سے بال متعلق طور پر دور نہیں ہوتے اگر آپ کو
سہولت ہے تو کسی بیوٹی پارلر سے جا کر بال صاف
کرالیں۔

بال صاف کرنے کا دوسرا طریقہ فخر ٹریڈنگ ہے
یہ دھاگے کے ذریعے کی جاتی ہے کسی بھی بیوٹی پارلر
سے کرائی جاسکتی ہے لیکن یہ آپ غور نہیں کر سکتیں
بیوٹی پارلر جانا ہوگا۔ دیکھ کے ذریعے بال صاف کرنے
کا طریقہ یہ ہے کہ دیکھ کو اس حد تک گرم کریں جتنا
آپ کی جلد گرمی برداشت کر سکتی ہو۔ اب ٹھنڈی کے

کیا آپ جانتی ہیں ہائی فریکوئنسی کیا ہے؟

حساس جلد کے امراض اور جیسے کی بھائیوں
دور کرنے کا جدید اور کامیاب طریقہ ہر قسم کے مضر اثرات
سے پاک۔
عاشیزہ بیوٹی سینٹر میں فیشل کے لئے جدید ایڈجسٹنگ
مشین اور یورپ کے بہترین دیکھ کے ذریعہ ویکسٹنگ
ایک نئے انداز میں ناز ٹریڈنگ کے لئے داخلے جاری ہیں۔

عاشیزہ بیوٹی سینٹر فرسٹ فلور

یونائیٹڈ سینٹر

بالمقابل گلیمرون طارق روڈ کراچی

چھپے سے بالوں پر رنگ لائیں۔ ایک بار ایک کپڑا اس پر
چپکا دیں۔ جب یہ تہہ جگہ کر سخت ہو جائے تو ایک
کوٹے سے کچھ کر جھینٹے سے دیکھ کی تہہ اتار دیں۔
سامنے بال دیکھ کے ساتھ نکل آئیں گے یہ طریقہ
بہتر ہے اور اس کے دہرانے کا ضرورت تقریباً ایک
ماہ بعد ہوگی۔ دیکھ باز میں ایک آپ کی دکانوں
سے خریدی جاسکتی ہے اور صرف دیکھ کنہا کافی ہوگا
بھنویں پیشل کے ذریعے بنائی جاتی ہیں۔ آپ آئی رو
پیشل سے اپنی بھنویں کی اپنی آنکھوں کے مطابق
مناسب شکل بنائیں پیشل سے بھنویں چھوٹی کریں جیسے
بال ہوتے ہیں۔

عذرا کاظمی، واہ کینٹ

س. باجی میری عمر بارہ سال ہے میں بہت موٹی ہوں اور
میرا قدم فٹ ۳ اچھے ہیں کی وجہ سے میرا چہرہ
اور پیٹ بھی بڑا ہے اور سب مجھے تنگ کرتے
ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں میرا
قد بھی چھوٹا ہے۔

ج. عذرا... آپ کا قد اچھی اور بڑھ سکتا ہے وزن
آپ نے نہیں کھاکتے پوچھئے۔ بہر حال اگر آپ کا
وزن زیادہ ہے پس مزید بڑھنے سے دیکھ اور مزید وزن
نہ بڑھنے دیں کیونکہ اس سے قدر بڑا اثر پڑ سکتا ہے۔

قد کے لیے آپ غذا میں دودھ، پھل، سبزیاں
اٹل وغیرہ کھائیں۔ ساتھ ہی کیٹشم اور ڈائن استعمال

کریں کم از کم دس گھنٹے سوئیں۔ سونے کے دوران ناچیں
سیٹھی رکھیں مرنے غذاؤں اور کیک پیٹریٹس وغیرہ
سے پرہیز کریں۔ باقاعدہ ورزش کریں اور پیدل زیادہ
چلا کریں۔ پیٹ کم کرنے کے لیے آپ روزانہ بوجھ
اندھے منہ پیٹ کے نیچے ٹھیکہ رکھ کر کم از کم پندرہ منٹ
تک لمبی رہیں اور رات سونے سے پہلے کسی پرسر جی
بیٹھ کر زور سے سانس اندر کی لیں اور ایک دم
سے ایک ساتھ سانس باہر چھوڑ دیں۔ سانس اندر اس
طرح لیں کہ پیٹ اندر نہ چنیں اس طرح پندرہ مرتبہ
روزانہ کیا کریں اور رکی کودا کریں۔